مضامین چکبست

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی کے

مضامین کا مجموعہ

سنہ ۱۹۲۸ء

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

ت ..... ۸/   تین روپیہ آٹھ آنہ

باہتمام کالی کے متراپرنٹر و پبلشر
انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

حالات مصنف

بزرگون کا وطن لکھنؤ ہے۔ پنڈت برج نراین چکبست سنہ ۱۸۸۲ء مین بمقام فیض آباد پیدا ہوے۔ مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہین تعلیم پائی سنہ ۱۹۰۵ء مین کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور سنہ ۱۹۰۸ء مین قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کردی۔ اس پیشہ مین آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلون مین تھا۔ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ مین آپ رائے بریلی تشریف لے گئے، عدالت مین بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے، ریل مین بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ ہمراہیون نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اُتار کر ویٹنگ روم مین لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے، علاج ہوا، مگر سب بے سود۔ سات بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا اور آپ کے بڑے بھائی رائے صاحب پنڈت مہراج نراین چکبست ایکزیکٹو افسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر مین رکھ کر لکھنؤ لائے۔

جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی۔

ان ہی کے مصرع سے تاریخ ہے۔ ہمراہ ۱۰۶

موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشان ہونا سنہ ۱۳۴۴ ہجری

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ

پنڈت دیا شنکر کول نسیم

(ماخوذ از ''کشمیر درپن''۔ فروری سنہ ۱۹۰۳ء)

جبکہ دماغی اشغال سے روز بروز نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ دماغی جوہر جو انسان کو دُنیا کے جنجال سے نجات دیکر ایک روحانی خوشی کا سرمایہ بہم پہنچاتے ہین مفقود ہوتے جاتے ہین۔ زندگی کے معنی صرف کھانا پینا، سونا، دلگی مذاق مین وقت گذارنا، بائسکل پر کوچہ گردی کرنا، یا گھر مین بیٹھ کر فلش کھیلنا رہ گئے ہین۔ نقدِ حیات کسی اور قابل نہین سمجھا جاتا ہے سوائے اسکے کہ جسمانی آسائش اور شکم پروری پر لٹایا جائے۔ تہذیب کے معنی یہ خیال کئے جاتے ہین کہ آدھے سر پر ٹوپی ہو، مانگ نہایت تکلف کے ساتھ نکلی ہو، شیروانی جسم پر چسپان ہو، اچکن کے بٹن کھلے ہون اور قمیص کا فرنٹ قیامت کر رہا ہو۔ چال مین وہ لوچ ہو کہ معلوم ہو ہوائی تہذیب مین جھونکے کھاتے جا رہے ہین۔ اِس حالت مین ایسے مضمون کا چھیڑنا جس کا مذاق دلون سے بالکل اُٹھ گیا ہے مناسب نہین معلوم ہوتا۔ سوائے اسکے کہ بے درد و بے انصاف کہین کہ پُرانے مُردے اُکھیڑنے سے کیا فائدہ۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تعصُّب کی عینک آنکھون سے اُتار کر رکھ دی جائے

اور ذرا نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن بزرگون کے حالات جنھون نے ہماری قوم کا نام روشن کیا اور جن کے کمالات نے ہندوستان مین اعزاز کشمیر کی بنا ڈالی خالی از دلچسپی نہین - بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بزرگون کی زندگی کے حالات پر ایسا اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ ان کے کمالات کا کسی خاص علم وفن کے دائرے مین اندازہ کرنا دُشوار ہے - مثلاً سب جانتے ہین کہ پنڈتانِ کشمیر اپنی ذہانت اور جودتِ طبع کے لئے ہندُستان مین ہمیشہ سے مشہور ہین - مسلمانون کے دورانِ حکومت مین جو ذریعے نام پیدا کرنے کے تھے اِن سب سے ہمارے بزرگون نے ایک حدتک فائدہ اُٹھایا - شعروسخن کا مذاق جو کہ مسلمانون کے عہدِ حکومت مین برابر جاری تھا ہمارے بزرگون مین بھی پایا جاتا تھا - جب تک اُردو زبان اپنی عہدِ طفولیت مین تھی اور فارسی کا رنگ چوکھا تھا اُس وقت ہماری قوم مین فارسی کے ایسے ایسے شاعر پیدا ہوے کہ جن کی ذات پر ہر شخص کو ناز ہوسکتا ہے - ان کا کلام زمانہ کی ناقدر دانی سے تلف ہوگیا - لیکن جو اشعار اب تک سینہ بسینہ چلے آتے ہین اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن عالی دماغون نے شاعری کے فن مین کیا کمال حاصل کیا تھا اور شعروسخن کے مذاق کو کیا معراج دی تھی -

پنڈت سومناتھ صاحب مبتلی نے ایک قصیدہ عرفی کے ایک مشہور قصیدہ کے وزن پر کہا تھا - اِس کے دو شعر اب تک یادگار ہین - واقعی لاجواب ہین عرفی کے قصیدہ کا مطلع ہے

صبحدم چون میدمد این صور شیون زائے من آسمان صحنِ قیامت گرددا ز غوغائے من

پنڈت صاحب نے اِس مطلع کی جوڑ پر کیا خوب مطلع کہا ہے -

بسکہ حسرت میچکد از نالۂ آوائے من — صحن محشر بزم خاموشان شد از غوغائے من

اور دُوسرا شعر تو اس پایہ کا ہے کہ اس کا جواب عرفی کے قصیدہ مین بھی مشکل سے ملے گا۔ ؎

ہمّتِ بالا یم از کون و مکان بگذشتہ است — بر فضائے لامکان پر می زند عنقائے من

کیا بلند پروازی اور معنیٰ آفرینی کی داد دی ہے۔ اگر صفائے بندش اور پاکیزگیٔ زبان کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایران نژاد کی فارسی ہے۔ اِسی طرح پنڈت صاحب نے حافظ کے ایک مشہور شعر پر مصرعے لگائے ہین۔ ؎

ساقیا چون بطِ مے چند در آئی بخروش — کہ بیا در چمنِ خلد و مے کوثر نوش

گرچہ او خود ہمہ نوش است ولیکن من دوش — کردہ ام توبہ بدستِ صنم بادہ فروش

کہ دگر مے نہ خورم بے کف بزم آرائے

جب تک کہ زبان پر قدرت کاملہ نہ حاصل ہو اُس وقت تک ایسے صاف مصرع زبان سے نہین نکل سکتے، پہلے تین مصرعون کی فارسی اور حافظ کی فارسی مین سرِ مو فرق نہین۔ یہ نہین معلوم ہوتا کہ کمخواب مین ٹاٹ کا جوڑ لگایا گیا ہے۔ بلکہ حریر مین حریر کا پیوند ہے۔ اسی طرح دیگر متفرق اشعار لوگون کے ورد زبان ہین جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگون نے فارسی مین کیسی لیاقت پیدا کی تھی اور شاعری مین کیا کمال حاصل کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا اور ان کے کلام کا ترتیب پانا امر محال ہے۔

ایک مجموعہ "چمنستانِ کشمیر" کے نام سے چھپا ہے۔ لیکن اِس چمنستان مین زیادہ تر خزان رسیدہ پھول نظر آتے ہین۔ اعلیٰ درجہ کا کلام اِس مین نہین ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ویتنیاً

نہ ہو سکا لیکن چند ایسے بزرگوار ہین جن کو مرے ہوے ابھی زیادہ زمانہ نہین گذرا اور جن کا کلام قدر دانانِ سخن کی خوش قسمتی سے اُن کی زندگی مین چھپ گیا ہے ۔اُن کی زندگی کے حالات شوق وجستجو کے دائرے سے باہر نہین ۔مگر یہ لوگ اُس زمانہ کے ہین جبکہ فارسی کا چراغ جھلملا رہا تھا اور اُردو ترقی کے پروبال نکال رہی تھی ۔لہذا ان لوگون کا کلام جو کچھ دستیاب ہو سکتا ہے وہ اُردو مین ہے ۔

اس زمرہ مین پنڈت دیا شنکر صاحب نسیمؔ کا نام سب پر فوقیت رکھتا ہے ۔اُردو شاعری مین انھون نے جو کمال حاصل کیا وہ سب پر روشن ہے ۔ان کا سکّہ اب تک اقلیم سخن مین جاری ہے ۔اِن کی مثنوی "گلزار نسیم" یادگار زمانہ ہے ۔جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اُس وقت تک "گلزار نسیم" کی شادابی مین فرق نہین آ سکتا ۔

پنڈت دیا شنکر نسیمؔ ۱۸۱۱ء مین پیدا ہوے ۔آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا ۔لکھنؤ آپ کا وطن تھا ۔جیسا کہ اُس زمانہ مین دستور تھا اُردو فارسی کی تعلیم پائی ۔شعرائے اُردو فارسی کا کلام نظر سے گذرتا رہا ۔خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا ۔غرضکہ بیس برس کی عمر مین شعر و سخن کا خاصہ اچھا مذاق پیدا کر لیا ۔خواجہ حیدر علی آتش کی گرمیِ سخن و آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی ۔شروع مین غزل گوئی کا شوق رہا لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل مین نہ نکل سکا ۔جدّتِ طبعی نے کہا ۔ ؎

بقدرِ شوق نہین اپنے تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لیے

مگر وسعت کہان ملے ۔اُردو شاعری کی کائنات کیا ۔غزل، قصیدہ یا رباعی یا مثنوی ۔میر حسن

کی مثنوی سحر البیان کے اُس زمانہ مین چرچے تھے۔ کچھ یہ طرز ایسا پسند آیا کہ خود بھی مثنوی کے کوچہ مین قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مُناسبت طبع نے آمین کہا۔ غرضکہ "گل بکاولی" کا قصہ جو کہ نثر مین تھا اس کو نظم مین ڈھالا۔ اٹھائیس برس کی عمر مین یہ مثنوی تیار ہوئی۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پُر تھی لہذا نام "گلزار نسیم" رکھا۔ واقعی اس گلزار کا کیا کہنا تھا۔ ع

" سینچا تھا جس کو خونِ جگر سے وہ باغ تھا "

اِس کے پھولون کی مہک دُور دُور پہنچی لیکن جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی۔ اُس وقت اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو اُنہون نے کہا کہ "ارے بھائی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھیگا، یا تم پڑھوگے کہ تم نے تصنیف کی ہے، یا مین اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤنگا" اُستادِ کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی پھر نظر ثانی کی، جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے۔ بلکہ جو مطلب چار شعرون مین ادا ہوتا اُس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر مین ادا کیا۔ اِس صورت سے "گلزار نسیم" کو خار و خس سے پاک کیا۔ اور آتش کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفرین کی اور اصلاح کا قلم اُٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحین نسیم نے نہ مانین اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا[۹]

قلیان پئے مشکبو دھوان دھار بیڑے چکھے پان کے مزے دار

آتش نے دوسرا مصرعہ اس طرح بدلنا چاہا۔ ع "بیڑے چکھے بہت مزے دار" لیکن نسیم کو یہ اصلاح نہ پسند آئی اور مصرعہ کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی۔

غرضکہ آتش کی نظر ثانی کے بعد مثنوی طبع ہوئی۔ شایع ہوتے ہی ہاتھون ہاتھ بک گئی

زمانہ نے پوری طور سے قدر کی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ مین یکتائی کا سہرہ میر حسن کے سر تھا۔ اب گلزار نسیم کے جابجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہین۔ نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقاے دوام کے دربار مین میر حسن کے برابر کرسی ملی۔

لیکن سخن شناس جانتے ہین کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کی جوڑ پر مثنوی کہی، لیکن بالکل دوسرے رنگ مین کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چین نہین کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ مین یکتا ہین، تو یہ اپنے طرز مین فرد ہین۔ اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اُٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو۔ اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو "گلزار نسیم" کی سیر کرو۔ دیکھو! فراق یار مین صدمہ گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے۔ دونون اُستادون کی طبیعت اس پر برابر لڑی ہے مگر دونون کے اندازِ سخن پر خیال کرو ؎

میر حسن

دِوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختون مین جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان مین اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی

جہان بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے
محبت مین دن رات گھٹنا اُسے

کسی نے اگر بات کی۔ بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

جو پانی پلانا تو پینا اُسے
غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی ؛ | کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
رکھتی تھی جو بھوک پیاس بس مین | آنسو پیتی تھی کھا کے قسمین
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ | کپڑون کے عوض بدلتی تھی رنگ
یک چند جو گذری بے خور و خواب | زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت مین خیال رہ گئی وہ | ہیئت مین مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر | فانوس خیال بن گیا گھر

دونون نے اپنے اپنے رنگ مین شاعری کا حق ادا کیا ہے۔ میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شب ہجران کی بیقراری کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہین۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعارون کی ترکیب، تشبیہون کی نزاکت، مصنف کی طبیعت کے پُرزور ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہان پہنچتے ہوے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہین اگر صورت حال کا بیان میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میر حسن کہتے ہین۔ ؎

سب اعضا بدن کے موافق درست | ہر اک کام مین اپنے چالاک و چست
قد و قامت آفت کا ٹکڑا اتمام | قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اس مضمون کو اپنے رنگ مین ادا کرتے ہین۔ ؎

دن، دن اُسے ہو گیا قیامت | بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت

چلتی تو زمین میں سرو گڑتے　　　　باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

میر حسن کے اشعار ناخن بر جگر ہیں۔ اُن کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے۔ نسیم کے اشعار الفاظ کی شستگی اور ترکیب الفاظ کی چستی سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔ ایک کی زینت حُسنِ صُورت سے ہے۔ دُوسرے کی شان لُطف معنی سے قائم ہے۔ میر حسن سخن آفریں ہیں، نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں، استعارہ و تشبیہہ نسیم کا حصّہ ہے مگر اتنا کہنا ناانصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے وہ نسیم کے کلام میں نہیں۔ وہی کلام دردخیز ہوتا ہے جو دردخیز دل سے نکلتا ہے۔ مگر باایں ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے نسیم کا کلام اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کے طائرِ شہرت نے پر پرواز نکالے تو کسی خرمن کے خوشہ چیں نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحبِ طرز کہلائے۔ "گلزار نسیم" کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا خاص حصّہ ہے تناسب لفظی ہے۔ تناسب لفظی کی صنعت ہمیشہ اُردو شاعروں کے پسند خاطر رہی ہے لیکن کسی نے اِس کو اس درجہ کمال پر نہیں پہنچایا جیسا کہ ہم گلزار نسیم میں دیکھتے ہیں۔ چند اشعار تمثیلاً ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ؎

پردہ سے نہ دایہ نے نکالا　　　　پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
پالا تو مفارقت ہے انجام　　　　دانا ہے تو مجھ سے لے مرے دام
مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے　　　　سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے
سودا ہے مری بکاؤلی کو　　　　ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

اِس رنگ کے شعر گلزار نسیم میں کثرت سے ملینگے۔ واقعی اِس رنگ کو خوب نباہا ہے۔ اور طُرّہ یہ کہ

نہایت خوبصورتی کے ساتھ تناسُب لفظی کی صنعت کا لُطف یہ ہے کہ یہ کہین پر سے نہ معلوم ہو کہ فلان لفظ خواہ مخواہ شعر مین بھر دیا ہے کہ دُوسرے لفظ سے جوڑ کھا جائے۔ اور یہ جوہر گلزارنسیم مین ہے ۔ مثلاً کیا خوب مصرعہ ہے ۔ ع

"سایہ ہو تو دَوڑ دُھوپ کیجئے"

اِس مصرعہ مین سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیّت دِکھا رہا ہے لیکن دونوں لفظ اِس خوبی سے آئے ہین کہ بالکل ایک دوسرے سے الگ بھی ہین اور ملے ہوئے بھی ۔ حالانکہ ایک کی رَونق دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ "سایہ" کا لفظ خواہ مخواہ "دھوپ" کے لئے لایا گیا ہے ۔ اِس رَنگ پر چلنا آسان نہین ہے ۔ یہ راہ بڑی کٹھن ہے ۔ قدم قدم پر ٹھوکرین کھانے کا اندیشہ ہے ۔ یہ نسیم کو ہی فخر حاصل ہے کہ کہین اپنے تئین لغزش کی ہوا نہ لگنے دی ۔ اکثر شعرائے اُردو نے اِس رنگ مین کہکر اپنے کلام کو بے رنگ کر دیا ہے ۔ مثلاً امانت کا دیوان بھر اِس بیان کی تصدیق کرتا ہے ۔ اِس شاعر کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہنچ گیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہین اور طبیعت مین شستگی کا جوہر نہین ۔ لہذا جو شعر اِس رنگ مین کہا ہے اُسے پڑھکر ہنسی آتی ہے ۔ ایک شعر بطور مثال پیش کیا جاتا ہے ۔ ؎

بعد مَرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی قبر پر میری لگایا نیم کا اُس نے درخت

سبحان اللہ کیا تناسبِ الفاظ ہے ۔ نیم حکیم اور نیم مُلّا سُنتے تھے یہ نیم شاعر ہین ۔ اِس طرح احمد علی شوق ایک لکھنؤ کے شاعر ہین ۔ اُنہون نے بھی ایک مثنوی کہی ہے اور "گلزار نسیم" کا

رنگ اُڑایا ہے لیکن جو تناسب لفظی نسیم کے لئے جوہر ہے ان کے لئے عیب ہو گیا ہے۔ ایک شعر اُن کا یاد آ گیا اس کا لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ؎

پاجی ہیں شریفے سب اُجڑ جائیں
بیری ہیں بیر کیڑے پڑ جائیں

خلیل کا بھی ایک شعر اس رنگ میں ہے ؎

وہ شمع رو پتنگ اُڑاتا ہے شاید آج
کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل کی

ان اشعار کے تمثیلاً پیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ تناسب الفاظ کا نباہنا ایک امر دشوار ہے۔ ہر طفل مکتب کا کام نہیں نسیم کو اس رنگ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ جس پہلو سے الفاظ کو جما دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ ایک حرف کا ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ آتش کا شعر اُن کی شاعری پر صادق آتا ہے۔ ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اختصار جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے اس مثنوی کا عجیب جوہر ہے۔ واقعی دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملے گا بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو اس صفائی سے دو شعروں میں ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ تک بھی نہیں گذرتا۔ مثلاً "صحرائے طلسم" کی داستان میں مندرجہ ذیل دو شعر کتنے پر معنی ہیں کس قدر اختصار لیے ہوئے ہیں ؎

طوطا بن کر شجر پہ جا کر
پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر

پتی، پھل، گوند، چھال، لکڑی
اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر گفتگو کا اختصار کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ ؎

پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت | پوچھا کہ طلب، کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی میں معاملہ برعکس ہے۔ اس میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ اور یہی اس مثنوی کا ایک بہت بڑا عیب ہے۔

نسیم نے عموماً مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے لیکن اکثر مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اٹھادیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے۔ ایسے اشعار کم پائے جاتے ہیں۔ مگر جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہوگئے ہیں۔ مثلاً ؎

انسان و پری کا سامنا کیا | مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے | دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار | اب مان نہ مان تو ہے مختار

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے | مختار ہے جس طرح نباہے

علاوہ بریں کلام میں وہ پختگی اور ترکیب میں وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش ملا فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے۔ واقعی کیا سنجیدہ و پرشوکت کلام ہے۔ ؎

پر بحر سخن سدا ہے باقی | دریا نہیں کار بند ساقی

مرغان ہوا تھے ہوش راہی | نقش کف پا تھے ریگ ماہی

جاگی مرغ سحر کے غل سے | اٹھی نکہت سی فرش گل سے

پانچوں سر پنجۂ وفا تھے | یا مطلع خمسۂ صفا تھے

اے آئینہ دارِ خود نمائی — وے سُرمۂ چشمِ آشنائی

اک شب کہ تھی خالِ روئے شامت — یا مردمِ دیدۂ قیامت

غرضکہ تناسبِ لفظی، اختصار، پختگیِ کلام، چستیِ بندش، شوکتِ الفاظ، پاکیزگیِ زبان، اِس مثنوی کے خاص جوہر ہین۔ استعارون اور تشبیہون سے جو میناکاری کی ہے اُس نے اور حُسن دوبالا کر دیا ہے۔

اکثر متعصب مسلمان کہتے ہین کہ آتش نے نسیم کو یہ مثنوی کہہ کر دے دی تھی۔ میری رائے مین اِس دعوی بے دلیل پر چین بہ جبین ہونا بیکار ہے۔ بلکہ ایک معنی مین یہ بیان ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ اِس سے بڑھ کر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا کلام آتش ایسے بردست استاد کی طرف منسوب کیا جائے۔ حالانکہ سخن شناس اچھی طرح جانتے ہین کہ جس رنگ مین گلزارِ نسیم ہے، اِس رنگ مین آتش نے اپنی زندگی بھر مین ایک شعر نہین کہا۔ اِس موقع پر اُردو زبان کے مستند مؤرخ محمد حسین آزاد مصنف "آبِ حیات" کی رائے پیش کرنا خالی از دلچسپی نہین۔ گو اِس مؤرخ سے ہم کو اتنی شکایت ضرور ہے کہ جہان اپنی کتاب "آبِ حیات" مین اور شعرا پر صفحے کے صفحے لکھے ہین وہان نسیم کی مثنوی پر رائے زنی کرنے مین دس پندرہ سطرون پر اکتفا کیا ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے وہ انصاف کی نظر سے لکھا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصف مزاج مؤرخ کا دامن تعصُّب کے داغ سے پاک ہے۔ کیونکہ اُس کی رائے "گلزارِ نسیم" پر منصفانہ ہے۔ "آبِ حیات" مین یون لکھا ہے "پنڈت دیا شنکر نے "گلزارِ نسیم" لکھی اور بہت خوب لکھی، ...... اِس کی عام و خاص مین شہرت ہے۔ اِس کے نکتے اور باریکیون کو سمجھین یا نہ سمجھین،

مگر سب لیتے ہین اور پڑھتے ہین جتنی سمجھ مین آتی ہے اُسی پر خوش ہوتے ہین اور لوٹے جاتے ہین"۔ واقعی بہت صحیح لکھا ہے۔ جو اِس بیان مین شک کرے وہ کافر ہے۔

علاوہ مثنوی کے نسیم کا ایک غزلون کا چھوٹا سا دیوان ہے لیکن ناتمام۔ بہت سی غزلین جو تلف ہوگئین ان کا نام و نشان بھی اِس دیوان مین نہین ملتا۔ لیکن جو کچھ ذخیرہ اشعار کا باقی رہ گیا ہے وہ اَب تک قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ، ذوق و غالب کے کلام کا ہمپایہ نہین۔ یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہین، ان کے برابر کسی کو عروج نہین ہوا۔ مگر اِس مین شک نہین کہ نسیم، رند، صبا، و خواجہ وزیر کے ہم پلہ ضرور تھے اکثر مقامات پر طبیعت کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قیامت کرتی ہے۔ مثلاً ؎

بجز گورِ غریبان نقش پا نتھے پھر نہین آگے　　یہین تک ہر مُسافر نے پتہ پایا ہے منزل کا
نسیم اپنے ہی اعمالون سے گردش ہے زمانے کی　　روان کشتی سے آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

اے مُرغِ دل تو شاخِ نشیمن سے گر پڑا　　حیف آشیان بلند ہے پرواز پست ہے
تجھے محوِ زلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا　　مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی مین شست ہے

گر یہی ہے اِس گلستان کی ہوا　　شاخِ گل اِک روز جھونکا کھائیگی
جان نکل جائے گی جب تن سے نسیم　　گُل کو بوے گُل ہوا بتلائیگی

جب ہو چکی شراب تو مین مست مر گیا　　　شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

طریق شعر و سخن مین اگر نہین اعجاز　　　قلم کی طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

اِس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہین کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام مین نہین پائی جاتی - ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا - مگر باوجود اس تصنّع کے جو کہ اس تاب کا خاص جوہر ہے نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہین ہے طبیعت مین ایک خداداد کیفیّت ہے جو کلام کو مزے دار بنا دیتی ہے -

سُنا جاتا ہے کہ وہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب عالم تھا، حاضر جوابی تیغ زبان کی جوہر تھی - انہین صفات خاص نے ان کا وقار ہمعصر شعرا مین قائم کیا - اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا - اِس زمانہ مین لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا - گو کہ اُردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آچکا تھا لیکن جیسے بُجھنے کے پیشتر چراغ کی روشنی تیز ہو جاتی ہے - اسی طرح اِس زمانہ نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید - آتش و ناسخ کی جادو کار طبیعتین اپنا زور دکھا رہی تھین - انیس و دبیر مرثیہ گوئی کے فن کو عرش پر پہنچا رہے تھے - خواجہ وزیر و صبا کی نوجوان و شوخ طبیعتین اک طرفہ قیامت برپا کر رہی تھین - اِس زمانہ مین ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ مین اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا لیکن نسیم نے اپنے گلہاے مضامین کی خوشبو سے سب کو مست کر دیا - ایسے ایسے معرکے جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی خصوصًا ان کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے - ایک

مرتبہ کا ذکر ہے لیکن مشاعرہ کی صحبت تھی نسیم بھی وہاں موجود تھے۔ شیخ ناسخ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرعہ نہیں سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انہوں نے جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرعہ پڑھا۔ ع

"شیخ نے مسجد بنا مسمار بُت خانہ کیا"

اُن کے مُنہ سے مصرعہ نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرعہ تیار تھا۔ ع

"تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"

اِس مصرعہ کا سُننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اُٹھے اور ہر طرف سے نعرہائے تحسین بلند ہوئے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی لیکن نسیم نے خوب ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرہ میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا۔ ع

جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

پہلا مصرعہ کچھ مہمل سا تھا۔ نسیم کے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرعہ تو خوب ہے لیکن پہلا مصرعہ ٹھیک نہیں۔ وہ صاحب بھی کچھ جلے تن تھے جھنجھلا کے بولے کہ اچھا آپ اس سے اچھا مصرعہ لگا دیجئے۔ یہاں تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ اسی وقت مصرعہ موزون کر کے سُنا دیا۔ کہ

تیرہ دل کی بزم میں جامِ شراب آتا نہیں (جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں)

اِن کی مشاعرہ میں دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

ایک روز آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹا تھا۔ رند، صبا، خلیل وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے

نسیم بھی موجود تھے صبح کا سہانا وقت، برسات کا موسم، مینھہ برستا ہوا، عجیب کیفیت تھی موسم بہار سے کچھ ایسی طبیعتیں مست ہوئین کہ شاگردون نے آتش سے فرمائش کی کہ اُستاد اِس وقت ایک غزل کہہ ڈالیے۔ گو کہ آتش کا بڑھاپا تھا لیکن طبیعت مین جوانی کا زور بھرا ہوا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزون کرنے شروع کر دیے اور کہا کہ لکھتے جاؤ۔ جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

دہن پر ہین اُن کے گمان کیسے کیسے
کلام آتے ہین درمیان کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے گھرائی ہوئی تھی۔ اُنھون نے اِن اشعار کی تخمیس شروع کر دی۔ جتنی دیر مین آتش دوسرا شعر سوچتے تھے یہ اِس عرصہ مین ان کے پہلے شعر پر مصرعے لگا چکتے۔ اور بعض بعض مصرعے تو واقعی اِس انداز سے نکالے ہین کہ اگر کوئی برسون فکر مین سر بگریبان رہے تو ان سے اچھے مصرعے نہین لگا سکتا۔ آتش کے دو اشعار کی تخمیس تمثیلاً لکھی جاتی ہے۔ تین مصرعے شروع کے نسیم کے ہین اور دو مصرعے آخر کے آتش کے

نہ خونی کفن ہین نہ گھائل ہوئے ہین
نہ زخمی بدن ہین نہ بسمل ہوئے ہین
لہو مل کے کشتون مین داخل ہوئے ہین
تمہارے شہیدون مین شامل ہوئے ہین
گل و لالہ و ارغوان کیسے کیسے

وجودِ بشر کیا عدم ہی عدم ہے
کہ ہے آدمی جب تلک دم مین دم ہے
شکم پرورِ حرص ناز و نعم ہے
کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زبان کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ اشعار پر مصرعے لگائے۔ جب آتش نے غزل ختم کی تو صبا، رند، خلیل کے چہرون کے

رنگ فق تھے - ابھی تک یہ لوگ اپنے تئین اہلِ زبان خیال کرتے تھے اور نسیم کو ہندو سمجھ کر زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہین دیکھتے تھے - لیکن اُس روز سب لوہا مان گئے کہ موزونیِ طبع ہو تو ایسی ہو، اور مضمون آفرینی کا مادہ ہو تو ایسا ہو -

نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ مین تھی اِس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعے سے ہو سکتا ہے - ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے - کہ شاعرانِ لکھنؤ ان پر مصرعے لگاکر بھیجین - تینون مصرعے حسبِ ذیل ہین -

(۱) ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا

(۲) اِس لئے قبر مین رکھا نہین زنجیر سمیت

(۳) من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دَیر

اَب اہلِ لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے لگاکر بھیجے جائین کہ دہلی والون کو بھی یہان کی شاعری کا قائل ہونا پڑے - اگر مصرعے سُست لگے تو کرکری ہو جائے گی - غرضکہ تین شخصون کو جو کہ ہر طرح سے اِس کام کے لئے موزون خیال کئے گئے ایک ایک مصرعے پر مصرعہ لگانے کا کام سپرد ہوا - پہلا مصرعہ ناسخ کو دیا گیا - دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو - گو کہ اس وقت اور بڑے بڑے شاعر بھی موجود تھے - مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا - تینون اُستادون نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہین - ناسخ کا مصرعہ ہے

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا

(ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا)

آتش نے کہا

حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے
(اس لئے قبر میں رکھا انہیں زنجیر سمیت)

نسیم کا مصرعہ بھی لاجواب ہے۔

دارم ز دین و کفر بہ ہر یک قدم دو سیر
من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دیر

یہ معرکے اب تک لکھنؤ میں یادگار ہیں۔

مگر افسوس کہ اس حبیب قوم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ "گلزار نسیم" کو شایع ہوے چار برس گذرے تھے کہ باغِ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ ہیضہ کی بیماری نے دفعتاً خاتمہ کر دیا۔ اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوے۔ ؎

روحِ رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں — جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

سنہ ۱۲۶۳ھ میں تینتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ کسی شاعر نے رباعی کہی۔ ؎

مغموم رکھا مدام دلگیری نے — مارا ہے جوان فلک کی بے پیری نے
واللہ کہ آتش فروغ ناسخ — ٹھنڈی کر دی نسیم کشمیری نے

پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجرؔ

(ماخوذاز "کشمیردرپن"۔ ستمبر ۱۹۰۳ء)

ذوقؔ مرحوم کی تربت کو خدا عنبرین کرے کیا دردناک دل پایا تھا۔ فرماتے ہین ؎

کھِل کے گُل کچھ تو بہارِ جان فزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچون پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ شعر اُن بیکسون کا مرثیہ ہے جن کا چراغ ہستی سرِشام ہی گُل ہوگیا اور جو دُنیا سے ناشاد ونامراد گئے۔ چنانچہ یہ جوان مرگ جس کا نام زیب عنوان ہے انہین حرمان نصیبون مین سے ہے جن کی زندگی کی بہارجان فزا پر قبل از وقت اوس پڑگئی اور جن کے غنچۂ آرزو بن کھلے مُرجھا گئے لیکن اِس وارفتگی کے عالم مین طبیعت کی رنگینی اور بیان کی شوخی نے اپنا سکہ قدردانون کے دل پر جما دیا اور وہ کیفیتین دکھائین جن کی یاد اب تک پس ماندہ احباب کے دل مین دردِ محبت پیدا کرتی ہے۔ یہ مانا کہ حضرتِ ہجرؔ کو زمانے نے شہرتِ عام کا تمغہ نہین عطا کیا اور مثل صفیؔ و ضمیرؔ و نسیمؔ و سرشارؔ کے سخندانانِ کشمیر کی بزم نورانی کے بالانشینون مین ان کا شمار نہین ہوسکتا۔ مگر تاہم اِس بزم کے جس گوشے مین یہ بیٹھے ہین اُس گوشے کی اِن کی ذات سے رونق ہے۔ لہذا مُناسب

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مرقع حیات بھی ہدیۂ ناظرین کیا جائے

حضرتِ ہجر کے والد ماجد کا نام پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب سپرو تخلص بہ صابر تھا حضرتِ ہجر ۱۸۵۳ء میں تحصیل چنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر زیادہ تر سکونت سے فیض آباد فیضیاب رہا۔ علوم مشرقی کی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق مکتب میں حاصل کی۔ انگریزی میں کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف اے تک سلسلۂ تعلیم جاری رہا لیکن امتحان کی ناکامیابی نے دل توڑ دیا۔ اس سلسلہ کو ترک کرنا مناسب سمجھا۔ بعد ازاں فکر معاش میں اودھ کے مختلف ضلعوں میں گھومتے رہے۔ آخر کار گونڈہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر گردشِ تقدیر نے چین نہ لینے دیا۔ دو سال گذرے تھے کہ درد زانو کی شکایت پیدا ہوئی۔ مرض نے نہایت طول کھینچا مجبور ہو کر فیض آباد علاج کے لئے واپس آنا پڑا۔ یہاں موت کا فرشتہ تاک لگائے بیٹھا تھا۔ غرضکہ چھ مہینے بیمار رہ کر مارچ ۱۹۰۲ء میں حضرتِ ہجر نے احباب کو داغ مفارقت دیا۔ تخمیناً ۴۹ سال کی عمر پائی۔

حضرتِ ہجر کے جوہر کمال کا اندازہ کامل طور پر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہو جبکہ اردو زبان میں انقلاب عظیم درپیش تھا اور اس کی انشا پردازی کا رنگ بدل رہا تھا۔ حضرتِ ہجر ان چند جدت پسند بزرگواروں میں ہیں جن سے کہ اس انقلاب کی بنیاد پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریزی تہذیب و تربیت کا رنگ اردو زبان کے پیراہن پر چڑھ رہا تھا، یعنی لوگ رجب علی سرور کے تکلفات و تصنع کو خیرباد کہہ کر نثر اردو کو سادگی کے زیور سے آراستہ کر رہے تھے۔ اس اختراع و ایجاد کا ذریعہ اودھ پنچ تھا۔ اودھ پنچ کی اردو

مین ایک خاص سادگی، بے تکلفی، نازکی اور دلبستگی کا رنگ تھا جو کہ قدما کے طرزِ عبارت کے برعکس تھا۔ اِس موقع پر اِس امر کا اعلان ضروری ہے کہ گو کہ اودھ پنچ ظرافت کا پرچہ تھا مگر اس کے مضامین محض ظرافت کے لحاظ سے زیادہ قابلِ قدر نہین ہوتے تھے۔ یون تو ظرافت کے معنی آج کل بہت وسیع ہین سلامتی سے ہر محلّے مین دس بارہ ظریف مل جائینگے۔ ہر طفلِ مکتب جس کو پیر نجارا کی زبان مین کچھ مداخلت حاصل ہے اپنے تئین نعمت خانِ عالی سمجھتا ہے لیکن اگر ظرافت کا اعلیٰ معیار پیش نظر رکھ کر اودھ پنچ کے مضامین کا اندازہ کرین تو ہم کو مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اِس مین شک نہین کہ اس کے مضامین مین طبیعت داری اور بذلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے موجود تھے۔ مگر وہ بات کہان جو غالب دہلوی کی روزمرّہ کی باتون مین تھی کہ جو فقرہ زبان سے یا قلم سے نکل گیا وہ اب تک سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور جتنے مرتبہ دُہرائیے اتنا ہی زیادہ لُطف دیتا ہے۔ مگر اس بات سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا کہ اُردو زبان اودھ پنچ کے احسان سے کبھی سبکدوش نہین ہو سکتی اودھ پنچ کے مضمون نگارون نے اُردو نثر کے پیرون سے تصنّع کی بیڑیان کاٹین اور پُرانی قیدون سے آزاد کیا۔ اِس زمرہ مین ہجر و سرشار و ستم ظریف و احمد علی شوق اور خود لائق ایڈیٹر منشی محمد سجاد حسین صاحب کا پایہ عالی تر ہے۔ اِن حضرات مین سوائے سرشار کے کسی سے ایسی تصنیف یادگار نہین جس سے کہ مصنّف کا نام صفحۂ ہستی پر اُردو زبان کے وجود تک قائم رہے لیکن اگر کبھی اس انقلاب کی تاریخ لکھی گئی جو کہ اودھ پنچ نے اُردو انشا پردازی مین پیدا کر دیا تو یہ لوگ آیندہ نسلون کے شکریہ کے مستحق ضرور مانے جائین گے۔ غرضکہ یہ ثابت ہوا کہ حضرت ہجر اُن چند حضرات مین ہین جنہون نے کہ اُردو زبان کو اپنے احسان سے گرانبار کیا ہے۔ منشی

محمد سجاد حسین صاحب فرماتے تھے کہ اودھ پنچ کے پہلے خریدار حضرت ہجر تھے۔ اور سال بھر تک قریب قریب ہر پرچے مین آپ کے ایک دو مضامین شایع ہوا کئے۔ مگر افسوس کہ وہ جلسہ برہم گیا نہ ہجر ہین نہ سرشار۔ نہ ستم ظریف۔ وہ کیفیت ہی نہین۔ ؎

اے مصحفی ہین رُون کیا اگلی صحبتون کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھون بگڑ گئے ہین

خود منشی سجّاد حسین صاحب کو مکروہاتِ زمانہ نے ایسا ستا رکھا ہے کہ مدّت سے آپ کے صریرِ قلم کا نغمہ نہین سُنائی دیا۔ افسوس۔ ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اودھ پنچ کا بھی اب وہ رنگ نہین۔ بس اب اپنے گذشتہ عظمت کے مزار پر چراغ روشن کئے ہوئے ہے۔

اِس تشریح کے بعد ہم حضرتِ ہجر کی طبّاعی اور جدّت پسندی کا اندازہ کر سکتے ہین۔ اِس موقع پر آپ کے مضامین کے اکثر حصّے بر سبیل اقتباس لکھے جاتے ہین جن سے کہ آپ کی تحریر کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ پرتاب گڈھ سے بحیثیت نامہ نگار اودھ پنچ لکھتے ہین۔ ”سردی کا مہینہ کیا شروع ہوا کہ پرتاب گڈھ کرہ زمہریر بن گیا۔ ہفتہ گزشتہ بھر آفتاب کی صورت دیکھنے کو ترس گئے“ وہ جھما جھم پانی برسا کہ دمبدم یہی خوف معلوم ہوتا تھا کہ خطّۂ یونان کی طرح تمام تختہ کا تختہ دریا برد نہ ہو جائے۔ تمام شب وظیفہ پڑھتے گذری۔ ہر لحظہ و ساعت یہی خیال رہتا تھا کہ کہین کھپریل کی چھت رکوع مین نہ آجائے

.... ہان آپ نے کچھ اور بھی سُنا فرخ سیر کے وقت ہین۔ ع

باران بارید ریزہ قند و نبات

واللہ اچھا چاشنی دار ابر تھا۔ مگر افسوس لکھنؤ مین ایسی بارش نہ ہوئی کہ ہر ایک چھینٹے کے بعد

ذرا مُنہ میٹھا ہوتا۔ (اودھ پنچ مطبوعہ ۲ر فروری ۱۸۸۳ء)

ہولی پر ایک معرکے کا مضمون لکھا ہے جو کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اِس سے بھی اقتباس حسبِ ذیل ہے۔

"واللہ ہولی کی فصل کیا آئی گویا اندھیری رات مین سُرخ مہتاب چھوٹی۔ ایک عالم بیر بہوٹی کی طرح سُرخا سُرخ ہوگیا ٹیسو پھولنے سے جنگل مین منگل ہورہا ہے۔ قطعہ کا قطعہ لال بھبو کا معلوم ہوتا ہے۔ باغ بغیچون (باغیچون) مین گل عباس، گل اورنگ، گل آفتابی، گل شفتالو، گلنار گلِ سُرخ، کھلے ہوے الگ الگ اپنا جوبن دکھلاتے ہین۔ اور ع

لال ہے مثل شفق رنگِ سپہر گردون　　　چھوٹ سے لالۂ احمر کے ہی یہ رنگ بہار

آج کل زمانہ نے کچھ ایسا رنگ بدلا ہے کہ سبزی، کاہی، وغیرہ جتنے رنگ تھے سب اُڑ گئے۔ اب جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھیے گلنار، گلابی، عنابی، بنفشئی، کے سوا دوسرا رنگ نظر نہین آتا۔۔۔۔۔۔ شوقینون نے جانور بھی پالے تو لال ہی پالے ——— اِس فصل مین لڑکا بھی پیدا ہوتا ہے تو لال خان یا ہوری لال کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

اِن انتخابات سے حضرتِ ہجر کی طرزِ تحریر کا انداز کھلتا ہے۔ خیالات کی شوخی اور عبارت کی روانی اور چلبلا پن لکھنے والے کی طبیعت داری کے شاہد ہین۔ یہ وہی رنگ ہے جس کو حضرتِ سرشار نے فسانۂ آزاد مین معراج دی۔ اِس زمانہ مین جبکہ سلیس اور سادہ اُردو لکھنے کا عام رواج ہے۔ ایسا طرزِ تحریر زیادہ حیرت نہین پیدا کرتا۔ لیکن اگر یہ خیال ملحوظ خاطر رہے کہ یہ مضامین پچیس برس اُدھر کے لکھے ہوئے ہین جبکہ اس طرزِ تحریر کی بنیاد پڑی، تو ہم کو حضرتِ ہجر کی جدّتِ طبع کا قائل ہونا

پڑتا ہے۔ اودھ پنچ کے علاوہ آپ سنجیدہ مضامین مختلف رسالوں اور اخباروں میں لکھا کرتے تھے۔ یہ امتیاز زیادہ تر مراسلہ کشمیر اور مرۃ الہند، وکیل ہند وغیرہ کو حاصل ہوتا تھا۔ "ماہیت خواب" "نفس امارہ" "ترقی تہذیب" "مسئلہ دیانت" وغیرہ پر اکثر معرکے کے مضامین لکھے جن کو عبارت کی سلاست اور پاکیزگی اور خیالات کی بلندی کی وجہ سے پسند عام اور قبول خاص کا شرف نصیب ہوا حضرت ہجر کے زباندان ہونے میں شک نہیں، اکثر انگریزی خیالات کا عکس اُردو میں اس صفائی سے اتارا ہے کہ بارک اللہ۔ کہیں پر عجز کا شبہہ بھی نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بے تکلف قلم چلا جاتا ہے۔ تمثیلاً ایک لطیفہ لکھا جاتا ہے جو کہ انگریزی لطیفے کا ترجمہ ہے۔

"حضرت شرڈین ایک مہاجن کے مقروض تھے پیسہ ٹکا پلے نہ تھا۔ ایسے وقت میں تقاضے کو مہاجن صاحب تشریف لائے۔ شرڈین نے چھوٹتے ہی ایسا فقرہ چست کیا کہ مہاجن تمام آٹے دال کا بھاؤ بھول گئے۔ شرڈین نے کہا بھئی فی الحال اگر اصل مانگتے ہو تو بے سود ہے اور اگر سود چاہتے ہو تو در اصل نہیں۔ یہ سُن کر مہاجن گھبرایا۔ اور پوچھنے لگا کیوں جناب میرا روپیہ ملے گا یا نہیں۔ شرڈین نے ہنس کر جواب دیا۔ واللہ تم بھی بالکل آدمی ہو۔ گھبرائے جاتے ہو۔ خاطر جمع رکھو، قرض پر تو ہمارا تمام کارخانہ چلتا ہے۔ انشاء اللہ تم ہی سے روپیہ لیکر ادا کیا جائیگا۔"

(اودھ پنچ۔ مطبوعہ مارچ ۱۸۷۷ء)

اس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی لطیفے کا ترجمہ کرنا اور اصل مذاق قائم رکھنا کار آسان نہیں۔ کیونکہ مذاق کا پہلو بہت کچھ زبان کا پہلو لئے ہوتا ہے۔ مگر حضرتِ ہجر کے زور قلم کے سامنے اس مشکل کا آسان کرنا دشوار نہ تھا۔ چنانچہ

اصل اور سود کے لفظ سے اس لطیفے کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ اِس قسم کی پاکیزگی اور سلاست کی قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہین کہ بعض حضرات معمولی باتون کا ترجمہ کرنے مین زبان سے کیا کیا گاؤ زوریان کرتے ہین۔ مین نے ایک رسالہ مین دیکھا کہ مصنف نے *Loose Morals* کا ترجمہ ڈھیلا اخلاق کیا ہے۔ جن لوگون کے کانون مین سلاست زبان کا نغمہ سمایا ہوا ہے وہ ایسا ترجمہ نہ کرینگے۔ مگر ہر کس و ناکس کے کان اس نغمہ سے آشنا نہین۔ یہ جوہر خداداد ہے۔

شاعری کے لئے بھی حضرت ہجر کی طبیعت خاص طور سے موزون تھی۔ قدر بلگرامی (نور اللہ مرقدہٗ) کے شاگرد تھے۔ اُردو سے تو اُن کو خاص اُنس تھا۔ اِس کے علاوہ منشی محمد سجاد حسین صاحب فرماتے تھے کہ فارسی کا کلام ان کا خوب ہوتا تھا۔ اکثر احباب کے جگھٹے دریا کنارے ہوتے تھے۔ وہان حضرت ہجر برجستہ اشعار تصنیف کیا کرتے تھے۔ غزل کم کہتے تھے' مُسدّس کا رنگ زیادہ پسند خاطر تھا۔ اِس قسم کی نظمون مین "لسان الغیب کشمیر" "کچّا چِٹھا" "نوحہ کشمیر" "فغان کشمیر" نے زیادہ شہرت پائی۔ مگر افسوس ہے کہ اُنھون نے اپنے کلام کی قدر نہ کی۔ خدا جانے یہ کیا قدرت کا راز ہے۔ اکثر صاحب جوہر اپنے جوہر کی قدر نہین کرتے۔ انیس مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

کس طرح قدر تجھے اپنے سخن کی ہو انیس
مرتبہ مشک کا آہوئے ختن کیا جانے

چنانچہ حضرت ہجر نے کبھی کسی مضمون یا نظم کا مسودہ اپنے پاس نہین رکھا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ نظم کا کلام ازبر رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ اس بے توجہی کی ہو لیکن ان کے مرنے کے بعد بابو گنگا پرشاد صاحب ورما ایڈیٹر اخبار "ایڈوکیٹ" و "ہندوستانی" نے کچھ ان کا کلام جمع کرکے ترتیب دیا تھا اور یہ ارادہ تھا کہ ایک مجموعہ کی صورت پر شایع کیا جائے مگر شومئ تقدیر سے وہ بھی تلف ہوگیا

ایک مُسدّس ان کا مَوسُوم بہ"کچّا چٹھا" اکثر بزرگانِ قوم کے پاس مَوجود ہے۔ یہ وہ لاجواب نظم ہے جو کہ اُنھون نے قومی جھگڑے کے موقع پر تصنیف کی تھی۔ اِس کے پڑھنے سے ان کی زباندانی اور جوشِ طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اِس نظم مین رنگین بیانی کو دخل ہے نہ زیادہ تر تشبیہون و استعارون سے کام لیا ہے۔ لیکن شکوہ الفاظ اور ترکیب کی چُستی کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آتا ہے۔ سیدھی سیدھی باتین ہین مگر گرمیٔ تاثیر سے مالامال۔ ایک ایک حرف اپنے دامن مین ایک شعلہ چھپائے ہوے ہے۔ واقعی کس جوش وخروش کا مطلع ہے۔ ؎

عَداوت کے شعلے کو بھڑکانے والے ۔۔۔ جہالت کی زنجیر کھڑکانے والے

دلون کو ضعیفون کے دھڑکانے والے ۔۔۔ نیا روز اک جوڑ بھڑکانے والے

یہ کیا نت نئی شعبدہ بازیان ہین

یہ کیا قوم مین رخنہ اندازیان ہین

یا ایک مقام پر بگڑ کر کہتے ہین۔ ؎

اگر لکھنؤ مین تمھین باخدا تھے ۔۔۔ بڑے نیک طینت بڑے پارسا تھے

اگر قوم مین تم ہی دھرم آتما تھے ۔۔۔ بڑے پاک باطن بڑے پارسا تھے

تو بہتر تھا گھر بار سب تیاگ دیتے

چلے جاتے کاشی مین سنیاس لیتے

یا قوم کی حالتِ زار کا نقشہ یون کھینچتے ہین۔ ؎

ہر اک قوم مین صید رنج و محن ہے ۔۔۔ نہ وہ صحبتین ہین نہ وہ انجمن ہے

بدی پر پھر آسمانِ چرخِ کہن ہے نہ ہے جوشِ قومی نہ حُبِّ وطن ہے
محبت ہے باقی نہ الفت ہے باقی
پڑی قوم میں پھر ہے نا اتفاقی

اِن متفرق بندون کے پڑھنے سے وہ سمان آنکھون کے سامنے نہین بندھ سکتا جس کے لئے کل مسدس کا پڑھنا شرط ہے - قومی جھگڑے کے متعلق بہت نظمین اہلِ قوم نے شایع کین لیکن صرف دو نظمین ایسی تصنیف ہوئین جن کا خیال قدر دانانِ سخن اپنے دل سے خوشی سے نہ مٹائین گے ایک "تحفۂ سرشار" یعنی پنڈت رتن ناتھ درؔ کی مثنوی - اور دوسرا یہ مسدس جو کہ حضرتِ ہجرؔ کے غور وفکر کا نتیجہ ہے - سنا گیا ہے یہ مسدس جس کا ایک مصرع بھی بیکار نہین اور جس مین ستاون بند ہین - ایک شب مین لکھ ڈالا تھا اور وہ بھی تپ کی حالت مین - مولانا حالیؔ کا مسدس بھی اسی رنگ مین ہے - مگر چونکہ مولانا ممدوح کے دل مین شاعری کی آگ نہین روشن ہے لہذا ان کے مسدس مین اِس جوش وخروش کا اظہار نہین جو کہ کچے چٹھے کا خاص جوہر ہے -

فیض آباد مین ایک انگریز نے سرجو کی تعریف مین ایک نظم کہی تھی اس کا ترجمہ حضرتِ ہجرؔ نے اُردو مین کیا تھا - وہ نظم تو کُل کلام کے ساتھ تلف ہوگئی صرف ایک شعر یاد ہے جو کہ لاجواب ہے -

کیا لطف ہے شام کو لبِ جو اک ناز سے بہ رہا ہے سرجو

دو غزلین فارسی کی آدھ پنے مین نظر سے گذرین چند شعر اُن مین سے اقتباس کر کے لکھے جاتے ہین ؎

ناصحا نسخۂ تالیفِ قلوب کیمیائیست کہ من می دانم
بہر نظارہ بہ معبد رفتن اتقائیست کہ من می دانم

ہر کہ در ہند فرنگی زاد است — بادشائیست کہ من می دانم
حیف صد حیف سیہ فامی ہند — لادوائیست کہ من می دانم
از پئے رزق بہم سودن کف — آسیائیست کہ من می دانم
ہجرِ خاکِ کفِ پائے محبوب — توتیائیست کہ من می دانم

دُوسری غزل جس کی سُرخی "بیکسی کا چکارہ" ہے حسب ذیل ہے واقعی کیا دردآمیز لہجہ ہے۔

در کنج غم افتادم و دمسازِ کسے نیست — دردا! کہ بہ فریادم و فریادرسے نیست
بر بیکسیم بین کہ زلیسنس ٹکس آہ — می نالم و جز نالہ کسے ہم نفسے نیست
اقلیم تجارت ز غم آمد بہ تکلّم — جانکاہ ترازِ من بجہان آہ کسے نیست
آتش زنِ کالائے شکیب است گرانی — می گریم و از گریہ ام آگاہ کسے نیست
در معرضِ بحث آمدہ آزادیِ اخبار — صد حیف چو مٹکاف کسے دادرسے نیست

یہ غزل اُس وقت کی ہے جب کہ ٹیکس وغیرہ بندھنے کا زمانہ تھا اور غلہ کی گرانی سے اہلِ ہند نالان تھے
اِس سلسلہ مین اس امر کا ذکر لازم ہے کہ حضرتِ ہجر کے والد ماجد پنڈت شمبھوناتھ صاحب ہجر وبھی اُردُو
فارسی کے ماہر تھے۔ قلم مین بھی زور تھا۔ چنانچہ مختلف کتابین ان سے یادگار ہین۔ جن مین کہ
"سراب حیات" اور "توزک جرمنی" کا مرتبہ بلند ہے۔ میرے دوستو! اگلے وقت کے بزرگون کا
علمی شوق قابلِ قدر ہے۔ پنڈت شمبھوناتھ علاوہ دفتر کے چھ گھنٹے کام کرنے کے چار پانچ گھنٹے روز
کتب بینی مین صرف کرتے تھے۔ حضرتِ ہجر نے ایسے قابل باپ کے دامنِ تربیت مین پرورش پائی
تھی۔ مگر دونون کی طبیعت کا رنگ بالکل جُداگانہ تھا۔ پنڈت شمبھوناتھ کے طرزِ عبارت مین

پُرانی چاشنی کا مزہ قائم ہے - وہی مسجّع عبارت، وہی محمد شاہی ترکیبین، وہی تصنّع اور تکلفات کا رنگ ان کے تصانیف کے ہر صفحے پر مُرجھائے ہوے چمن کی گذشتہ بہار کی یاد دلاتا ہے - گو کہ اُنھون نے یہ زمانہ بھی دیکھا تھا - مگر ان کے دل کو طرزِ قدیم سے محبّت تھی - برخلاف اِس کے حضرتِ ہجر کے اندازِ تحریر مین ایک قدرتی کیفیّت ہے جس پر ہزار مصنوعی تکلفات قربان ہین - سنجیدہ مضامین مین بھی طبیعت کی شوخی اپنی جھلک دکھاتی ہے بس معلوم ہوتا ہے کہ ابر کے پردے مین بجلی چمک رہی ہے۔

حضرتِ ہجر کے جاننے والے سب ان کی طبیعت داری کا لوہا مانتے تھے - اوائل عمر ہی سے طبیعت اپنا رنگ دکھلانے لگی تھی - طالب علمی کے زمانہ مین مختلف اخبارون اور رسالون مین مضامین لکھا کرتے تھے - عجب خداداد ذہن پایا تھا - ہر رنگ مین اپنا رنگ جما لیتے تھے کشمیری، پنجابی، ہندی، بنگالی زبانون مین اِس لہجہ سے گفتگو کرتے تھے کہ اہلِ زبان مین اور ان مین فرق نہین معلوم ہوتا تھا - انگریزی مین اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہین پائی تھی لیکن چونکہ کتب بینی کا شوق ہمیشہ قائم رہا - لہذا اِس بات مین بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی - بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ جس صحبت مین بیٹھتے تھے اُس کی زینت ہو جاتے تھے - زبان مین جادو تھا - بیٹھتے بیٹھتے ایک فقرہ ایسا کہہ دیا کہ سُننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے - مگر ان کی پیشانی پر شکن بھی نہ پڑی - گویا کچھ جانتے ہی نہین - اِن کے دلآویز لطائف و ظرائف ان کے احباب کے اب تک وردِ زبان ہین۔

ایک مرتبہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا - وہان ایک بزرگ قوم سے ملاقات ہوئی جو کہ شاعری کا شوق رکھتے تھے - مگر فارسی مین کہتے تھے - اور اکثر غلبۂ ذکاوت سے خبط اور مہمل بھی بک جاتے تھے - چنانچہ حضرتِ ہجر کو بھی اُنھون نے اپنا کلام سُنایا اور دیر تک سمع خراشی کرتے رہے دوسرے

روز جب ملاقات ہوئی تو اُنھون نے حضرتِ ہجر سے فرمائش کی کہ آپ اپنا کلام یا کسی اُستاد کا کلام سُنائیے۔ اُنھون نے پیشتر سے ایک غزل فارسی مین تیار کر رکھی تھی جس کی نشست الفاظ نہایت چُست اور بندش نہایت پختہ تھی اور مختلف اشارے اور کنائے ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑے دقیق اور فلسفیانہ مضامین نظم ہین لیکن اصل مین ہر ایک شعر مہمل اور بے معنی تھا حضرتِ ہجر نے اُن کو یہ غزل سُنائی اور کہا کہ قاآنی کی تصنیفات سے ہے، پس پھر کیا تھا وہ صاحب ان اشعا پر مفتون تھے اور شاعر کی نازک خیالی اور بلند پروازی کی داد دیتے تھے۔ یہان تک کہ آٹھ روز مین نہایت مشقت سے اس غزل کی شرح تیار کی جو کہ آخر مین اودھ پنچ کی نذر کی گئی تھی۔

اِس قسم کے لطیفے اکثر اُن سے یادگار ہین۔ حضرتِ ہجر کا ادب و انکسار بھی قابل تعریف ہے جس سے کہ وہ ہمیشہ ہر دلعزیز رہے۔ کبھی تنگ ظرفی کو سینہ مین جگہ نہ دی اور ایسی بات نہ کی جو کہ دشمن کو بھی ناگوار ہو۔ باوجود اِس فضیلت و اعزاز کے چشم مروّت نشۂ غرور سے نہ جھکی۔ منشی محمد سجاد حسین صاحب فرماتے تھے کہ سوائے تعریف کے کبھی اُن کے مُنہ سے کسی کی بُرائی نہ سُنی۔ اگر کسی نے کبھی اُن کی شان مین بے ادبی بھی کی تو چشم پوشی کر گئے۔ بقول انیس ؎

ضبط دیکھو سب کی سُن لی پر نہ کچھ اپنی کہی
اِس بانداِئی پہ گویا بے زبان پیدا ہوئے

ایک مرتبہ "طوطی ہند" کے اڈیٹر نے ان کے ایک مضمون کا مضحکہ اُڑایا اور ظرافت کے جوش مین تہذیب و شرافت پر خاک ڈالنے سے بھی نہ درگذر کیا۔ حضرتِ ہجر نے اِس کے جواب مین ایک مختصر سا مراسلہ اودھ پنچ مین شایع کیا۔ جس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"حضرت اڈیٹر طوطی ہند! آپ نے جو کچھ میری نسبت تحریر فرمایا ہے وہ مضمون نگاری

کی شان کے خلاف ہے اگر آپ ظرافت کے پیرایہ مین میرے مضمون کا جواب دیتے تو بہتر ہوتا، آپ نے جو ذاتی حملے مجھ پر کئے ہین مین اُن کا جواب ترکی بہ ترکی دینا پسند نہین کرتا، ہان اتنا ضرور کہون گا کہ مین کس قابل ہون - جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب آپ کی تعریف ہے"۔

غرضکہ عجب شریف و باوضع آدمی تھا - زندہ دلی کا وہ عالم کہ کبھی غم و غصّہ کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا - گو کہ زمانے نے بیوفائی کی مگر اُن کا ہمیشہ یہی اصول رہا کہ ع

"دل پر ہجوم غم ہو جبین پر شکن نہ ہو"

یہ زندہ دلی مرتے دم تک اُن کی رفیق رہی -

مگر حیف کہ فلکِ پیر حضرتِ ہجر کی جوانی نہ دیکھ سکا - کیا افسوس کا مقام ہے - ؎

کچھ عمر بھی نہ پائی تھی ایسے مُسن نہ تھے
کہتا تھا خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

پنڈت رتن ناتھ در سرشار

(ماخوذ از "کشمیر درپن" مئی سنہ ۱۹۰۸ء)

اینت "رتن ناتھ در" در ہمہ دانی سمر — آنت فسانہ نگر کان ہمہ یکجا در اوست
شعر وے اندر وہن صد چمن اندر چمن — نطقِ زبانِ سخن مرغِ چمن زادِ اوست
مصرعِ پیچیدہ اش عرعرِ بالیدہ اش — معنیِ پیچیدہ اش طرۂ شمشادِ اوست
خامہ بجا مہ نہاد زہرہ عطارد بزاد — فکرِ تصور نژاد خلعتِ نوشادِ اوست
بست بہ فکرِ رسا معنیِ نایاب را — بستنِ بالِ ہما عشوۂ صیادِ اوست
مریمِ او طبعِ بکر عیسیِ او تازہ فکر — روحِ قدس را بذکر ہمتِ استادِ اوست
مصرعِ تاریخ باز قدرؔ چنین در اوساز — سروِ چمن زارِ ناز قصۂ آزادِ اوست

(قدرؔ بلگرامی)

اہل کشمیر میں دو صاحب ایسے گذرے ہیں جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ رہیگا۔ ایک پنڈت دیا شنکر نسیم جن کے فیض سے چمنستانِ نظم کو شادابی حاصل ہوئی دوسرے حضرت سرشار جنھوں نے حدیقۂ نثرِ اردو میں نئی روشیں نکالیں اور جن کی جادو بیانی کا

شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے مگر واہ ری بے ہمتی کہ ایسے باکمال کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ اور پھر ایسی حالت میں جب کہ اُس کو دُنیا سے اُٹھے ہوئے کچھ عرصہ نہیں گذرا دریافت کئے پر سال ولادت نہ معلوم ہو سکا۔ اندازاً یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب کہ حضرت سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے تو محمد علی شاہ کا آخری عہد تھا۔ چار برس کی عمر تھی کہ آپ کے والد پنڈت بیجناتھ صاحب وَرْ قضا کر گئے۔ اِس صورت میں حضرتِ سرشار دامانِ مادری کے سایہ میں پرورش پاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایامِ طفولیت میں طبّاعی اور ذہانت زبان کی طرّاری کے پردے میں اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ جس مکان میں رہتے تھے اُس کے پڑوس میں اہلِ اسلام کی مخدرات رہتی تھیں۔ حضرتِ سرشار نے لڑکپن میں اُردو زبان انہیں شریف خاتونوں سے سیکھی اور انہیں کے فیضانِ صحبت سے اِن کو بیگمات کے طرزِ معاشرت سے بہت کچھ آگاہی کم سنی ہی کے زمانے میں ہو گئی تھی۔ معمولی آدمی پر یہ تربیت کچھ اثر نہ پیدا کرتی حضرتِ سرشار میں چونکہ ذہانت اور جوْدت کا خلقی مادہ موجود تھا لہٰذا ان کے حق میں ایسی پاکیزہ صحبت کیمیا ہو گئی۔ جب فسانۂ آزاد لکھا تو لڑکپن کی تحقیقات کا یہ ذخیرہ دماغ میں موجود تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی دستورِ قدیمہ کے مطابق پائی۔ جب زمانہ نے سلطنتِ اودھ کا ورق اُلٹا، اور انگریزی حکومت کی بنیاد پڑی تو انگریزی تعلیم کے لئے "کیننگ کالج" قائم ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ بھی اُس میں داخل ہوئے۔ مگر کوئی ڈگری نہ حاصل کر سکے۔

جب سِن تمیز کو پہنچے تو کھیری ضلع اسکول میں مدرسی کا سلسلہ نکالا۔ اور حصولِ معاش کا ڈھنگ ڈالا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں نئے خیالات کا دریا طغیانی پر تھا۔ نظامِ معاشرت کے

ہر صیغے مین اصلاح کے مسائل درپیش تھے - اُردو زبان پر بھی اختراع و ایجاد کا جادو چل رہا تھا - ایسے رسالے اور اخبار جاری ہو رہے تھے جن مین پُرانے ایشیائی تکلفات کو خیرباد کہکر واقعات نفس الامری پر بحث ہوتی تھی - اِس سلسلہ مین ہماری قوم مین بھی ایک ماہوار رسالہ "مراسلۂ کشمیر" کے نام سے شایع ہوتا تھا، جس مین اصلاح اور رفاہ کے متعلق مضامین لکھے جاتے تھے - اِسی زمانہ مین اودھ پنچ بھی اپنا رنگ جما رہا تھا - حضرت سرشار کے دل مین انشاپردازی کا خداداد مذاق موجود تھا - لہذا "مراسلۂ کشمیر" "اودھ پنچ" وغیرہ مین لکھنا شروع کیا - گو کہ اُس وقت حضرتِ سرشار کے کمال کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اُس کی شعاعین دُور تک نہ پھیلی تھین - مگر اُس وقت کے مضامین پڑھنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت مین ایک خاص شوخی اور بے تکلفی ہے اور طرز تحریر مین عجب تازگی ہے جو دلون کو مزہ دے جاتی ہے - ہان اتنا کہنا لازمی ہے کہ حضرتِ سرشار کی اُس زمانے کی نثر فسانۂ عجائب کی نثر کا پہلو مارتی ہے - وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے مین رجب علی سرور مصنّف "فسانۂ عجائب" کا سکہ لکھنؤ مین بیٹھا ہوا تھا - وہ نثر اُردو کے پیمبر سمجھے جاتے تھے - ہر مضمون نگار کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اُن کی تقلید کرے - اِس صورت مین اگر سرشار کی ابتدائی نثر مین سرور کی کیفیت پائی جائے تو جائے تعجب نہین - فارسی کا اُس زمانے مین ایسا رواج تھا کہ پہلے پہل مضامین جو حضرتِ سرشار نے "مراسلۂ کشمیر" مین اشاعت کے لئے بھیجے وہ فارسی زبان مین تھے - اِسی زمانے مین سررشتہ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا - اُس مین اکثر علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شایع ہوا کرتے تھے - اِس رنگ مین بھی حضرت سرشار نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا - چنانچہ سررشتہ تعلیم کے مہتمم اعلیٰ نے اپنی سالانہ رویداد محکمہ مین اس امر کا اعلان کیا کہ جیسا صحیح اور بامحاورہ

ترجمہ پنڈت رتن ناتھ کا ہوتا ہے، ایسا کسی دوسرے شخص کا صوبہ مین نہین ہوتا غرضکہ حضرت سرشار کا مضمون نگاری کا شوق دن دُونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اَودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر، مرآۃ الہند، ریاض الاخبار، وغیرہ آپ کے زورِ قلم سے فیضیاب ہوتے رہے۔

۱۸۷۸ء مین ایک علم طبیعی کی کتاب کا اُردو مین انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اس مین آب و ہوا و برق وغیرہ کی ماہیت کا حال درج ہے چونکہ اس کے ہر صفحے مین تحقیقات علمی کا نور سمایا ہوا تھا لہذا نام "شمس الضحی" رکھا۔ ایسے ادق مضامین کا بیان جن کا نقشہ اُتارنے کے لئے اُردو مین پورے الفاظ بھی موجود نہین نہایت عام فہم اور سلیس عبارت مین لکھا ہے۔

اُسی سال تقدیر نے حضرتِ سرشار کی زندگی کے کارنامے مین ایسا ورق اُلٹا جس سے کہ آپ کا کمال اہل ملک و اہل قوم پر آئینہ ہوگیا اور خود اس صاحب کمال کو قبول عام کی سرکار سے نکتہ سنجی اور زبان دانی کی سند ملی، یعنی یہ وہ مبارک سال تھا جبکہ منشی نولکشور نے حضرتِ سرشار کو "اَودھ اخبار" کی ایڈیٹری کا قلمدان سپرد کیا۔ اس زمانے مین "اودھ اخبار" کو جو عروج حاصل ہوا اس کا زمانہ شاہد ہے۔ حضرتِ سرشار نے وقائع نگاری مین بھی اپنا رنگ جما لیا۔ پولٹیکل اور سوشل مضامین مین بھی وہ نکتے اور باریکیان پیدا کین کہ دلون کو تسخیر کرلیا لیکن ابھی حضرتِ سرشار کی شہرت کے تاج مین سب سے اعلی نگینہ نہین جڑا گیا تھا یعنی فسانۂ آزاد کی ابھی تک بنیاد نہین پڑی تھی۔

جس صورت مین ہم آج فسانۂ آزاد کو دیکھتے ہین۔ اِس طرح پر یہ شروع مین شایع نہین ہوا تھا۔ مصنف نے اس کے آغاز کے وقت اس کی ابتدا و انتہا کا خیال نہ کیا تھا۔ اصل کیفیت فسانۂ مذکور کی بنیاد پڑنے کی یون ہے۔ کہ جب حضرتِ سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہان شب و روز

یارانِ دقیقہ رس وصبح نفس کی صحبت مین گذرتی تھی، اِس صحبت مین جہان ایک سے ایک حاضر جواب و طرّار موجود ہوتا تھا۔ وہان منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ، و پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ جہان ایسے ایسے زندہ دل موجود ہون وہان کی کیفیت کا کیا کہنا۔

ع۔ غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یارون مین

افسوس کہ زمانے نے اس مجموعۂ صحبت کو پریشان کر دیا۔ اب منشی محمد سجاد حسین صاحب کا دم غنیمت ہے اُردو انشا پردازی کا نام لکھنؤ مین انہین کی ذات سے زندہ ہے۔ ؎

یادگارِ زمانہ ہین یہ لوگ　　　یاد رکھنا فسانہ ہین یہ لوگ

اِس صحبت مین ایک روز پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھئے اور ممکن نہین کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیے تو وہ "ڈان کوئک ذاٹ" ہے۔ اگر اُردو مین اس طرز کا فسانہ لکھا جاے تو خوب ہے حضرتِ سرشار کے دل پر اُس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی۔ کہ اُردو مین "ڈان کوئک ذاٹ" کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ "اودھ اخبار" مین ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شایع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرم پر ایک مضمون نکل گیا کبھی چہلم پر کبھی عیش باغ کے میلے پر۔ اُس وقت تک لوگون کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اور حضرتِ سرشار کا بھی شاید یہی منشا ہو۔ مگر لوگون کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اِس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مختلف مضامین کی لڑیون کو گوندھ کر فسانہ کا سلسلہ نکالا۔ ایسے مضامین مین جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت ہی کم تھا، سلسلہ پیدا کرنا آسان کام نہ تھا اور اصل تو یہ ہے کہ

کامل سلسلہ پیدا نہ ہوسکا۔ اگر سلسلہ ہے تو اتنا ہے کہ اس فسانے کے رستم داستان میاں آزاد خانہ برباد ہر فن مین طاق اور ہر کمال مین مشاق ہین۔ جتنے علوم عقلی و نقلی ہین ان مین ان کو مداخلت ہے۔ سپہ گری کے فن مین بھی برق ہین۔ شاعر بھی ہین حُسن مین اگر یوسفِ ثانی کہئے تو بجا ہے۔ صبح ہو لی اور یہ بوئے گُل کی طرح گھر سے نکلے، اور دُنیا بھر کی سیر پر کمر باندھ لی۔ کبھی لکھنؤ کا محرّم دیکھنے چلے آئے، کبھی عیش باغ کے میلے پہنچے، کبھی کسی نوّاب کی درباداری کی۔ غرضکہ یہ جہانیان جہان گشت آدمی ہین۔ ان کے لیے کسی خاص ارادے یا مشغلے کی ضرورت نہین ہے۔ ؎

ہر صبح میزند چو شفق جوش خونِ ما　　　موقوف بر بہار نہ باشد جنونِ ما

اس کوچہ گردی مین ایک وزان کی نگاہ ایک ناظورۂ ملائک فریب سے لڑ گئی۔ اِدھر سے پیغام وصال ہوا۔ بعد ہزار ناز و نیاز اس پری پیکر نے جو کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون تھی اِس شرط پر ان سے شادی کرنا منظور کی کہ یہ روم جائین اور سلطان کی فوج مین شریک ہو کر روس کے خلاف لڑین۔ حضرتِ آزاد بھی اپنی دُھن کے پکّے تھے، سیدھے روم پہونچے اور وہان سے سُرخ رو ہو کر اپنی محبوبہ کے پاس آئے اور خوشی خوشی بیاہ رچایا۔ اصل قصّہ "فسانہ آزاد" اسی قدر ہے۔ مگر مصنّف کے زورِ قلم کا یہ عالم ہے کہ پچیس سو صفحے اِس مختصر مطلب کے ادا کرنے مین صرف کیے۔ اور داستان کی دلچسپی مین فرق نہ آیا۔ علاوہ "ڈان کوئک زاٹ" کے مختلف انگریزی افسانون کے حالات اِس مین درج ہین۔ لیکن مصنّف کے قلم مین وہ جادو ہے کہ ہر بیان کو اپنا کر لیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہین کہ فلان داستان "فسانۂ آزاد" کی فلان انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے۔ مگر ثابت نہین کر سکتے۔ حضرتِ سرشار کی یہ کیفیت تھی۔ کہ چار آدمیون مین بیٹھے ہین۔ باتین

کرتے جاتے ہین اور وہی باتین فسانے مین لکھتے جاتے ہین۔ مگر اِس انداز سے کہ عبارت کی شوخی اور مضامین کی تازگی مین سرِمو فرق نہین آتا۔ واللہ کیا زبان پائی تھی۔ جو اِس زبان سے نکل گیا عالم کو بھایا اور تاثیر کا طلسم بن گیا۔ جس زمانے مین فسانہ "اودھ اخبار" مین نکل رہا تھا حضرت سرشار کا ہندوستان بھر مین طوطی بول رہا تھا۔ ملک کے مختلف حصّون سے آپ کے پاس خطوط آتے تھے۔ جن مین آپ کی اعلیٰ دماغی قابلیت اور زباندانی کی داد وہی مدِ نظر ہوتی تھی۔ یہ خط معمولی لوگون کے نہ ہوتے تھے بلکہ ایسے حضرات کے جن کی قابلیت ولیاقت ضرور قابلِ تحسین ہے۔ تمثیلاً ایک خط مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا ذیل مین درج کیا جاتا ہے۔

جناب پنڈت جی صاحب زاد فصاحتکم۔

حضرت تسلیم۔ آپ نے فسانہ آزاد کیا لکھا ہے زبان اُردو کے حق مین مسیحائی کی ہے۔ باوجودیکہ وہ بیچاری آج کل کے زباندانون سے ایسی ڈرتی ہے جیسے میان خوجی کی قرولی سے مین۔ خیر خدا خدا کرکے ہماری بیچاری پُرانی عمدہ زبان کے ایک آپ تو معین نکلے۔ بللہ الحمد .... اور تو ہم سے کیا ہو سکتا ہے صرف .... قطعہ تاریخ آپ کے پاس بھیجتے ہین خود ملاحظہ فرما کر قسطنطنیہ مین میان آزاد کے ملاحظہ مین ضرور بھیج دیجیے گا تاکہ وہ خود تو دیکھین نہین صاحب آپ کا ہیکو تکلیف فرمائیے۔ جب چھپیگا وہ خود ہی دیکھ لینگے۔

راقم اثیم واحقر محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی

قطعہ تاریخ

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ　　　کن کن محاورون کا کیا ہے نباہ واہ

دیکھین جو شوخیان ترے خامہ کی غور سے بولے شفیق واہ، عدو بولے آہ آہ

کرتا شررہے مصرع تاریخ پیشکش

کیا بول چال لکھی رتن ناتھ، واہ واہ

مگر فلکِ پیر کی تفرقہ پردازی دیکھیے کہ اِس اثنا مین اودھ پنچ جو کہ شروع مین حضرت سرشار کے زورِ قلم سے فیضیاب ہوتا رہا تھا، آپ کے خلاف ہوگیا۔ فسانہ آزاد پر جا و بیجا اعتراضات کی بھرمار شروع ہوگئی۔ پھر تو اس ظرافت کے نہنگ بحر آشام نے بھی کروٹ لی اور ایسے ایسے دندان شکن جواب دیئے کہ معترضین کے مُنہ پھر گئے۔ اِس فساد نے یہان تک طول کھینچا کہ منشی سجاد حسین اور حضرتِ سرشار سے صاحب سلامت ترک ہوگئی، مگر چونکہ دونون کا آئینۂ دل زنگِ کدورت سے صاف تھا۔ اور دونون پُرانے یار تھے لہذا پھر باہم صفائی ہوگئی اور اگلی سی محبّت قائم ہوگئی۔ چنانچہ آخری مضمون حضرتِ سرشار کا جو کہ انھون نے مرنے کے دن لکھا تھا اودھ پنچ ہی کے لئے لکھا گیا تھا اور اس مین شایع ہوا۔ اس باہمی تنازع کا حال پڑھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ انشا پردازی کی آبروریزی ہوئی اور کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آج فسانۂ آزاد مطبوع خلائق ہے۔ اِس کے اچھوتے فقرے اور لطیفے بچے بچے کی زبان پر ہین۔ اعتراض کسی کو یاد بھی نہین۔ بجز اس کے کہ اودھ پنچ کی پُرانی جلدون مین قلمبند ہین مگر وہ بھی اب کیڑے چاٹے جاتے ہین۔

غرضکہ قدردانون کے نعرہائے تحسین اور معترضین کے شور و غل مین یہ فسانہ شگرف اودھ اخبار کے ضمیمہ کے طور پر من ابتداے دسمبر ۱۸۷۸ء لغایتہ دسمبر ۱۸۷۹ء برابر شایع ہوتا رہا۔ بعد ازین ۱۸۸۰ء مین کتاب کی شکل مین شایع کیا گیا۔ قدردانان سخن شوق کا دامن پھیلائے پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔

شائع ہوتے ہی ہاتھون ہاتھ بک گیا۔ لفظون کی نئی تراش، ترکیبون کی خوبصورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرز تحریر کی نزاکت، جواب و سوال کی نوک جھونک، زبان کی پاکیزگی، محاورہ کی صفائی، روزمرّہ کی لطافت، ظرافت کی گلکاری، تراشون کی نئی پھبن، ایجادون کی بانکپن نے لوگون کو حضرتِ سرشار کا والہ و شیدا بنالیا۔ اُردو مین ایسے فسانے کا شائع ہونا بالکل ایک نئی بات تھی۔ اِس موقع پر اِس امر کا اعلان بھی لازمی ہے کہ محض قصّہ سمجھکر فسانہ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سراسر نافہمی ہے۔ اِس فسانہ کی دلچسپی کا انحصار اِس کی داستان کے مسلسل ہونے پر نہین ہے۔ حضرتِ سرشار نے اِس مین لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اِس مین شک نہین کہ لکھنؤ کی اِس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اِس شہر مرحوم کے باشندون کا طرز معاشرت اِس کی گذشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل مین درد محبّت پیدا کرتا ہے۔ ہان نگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہان کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ مین بھی کبھی امیرون اور شہزادون کی آنکھون کا سُرمہ تھی۔ یہان کی عالی شان مگر شکستہ عمارتون کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار، زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویرین ہین۔ ؎

ہر کجا خشت کہن بینی درین ویرانہ   ہست فرد دفترِ احوالِ صاحب خانہ

گو کہ یہان کے شرفا فلک زدہ ہیں اور زمانے نے اُن کے جاہ و جلال کو خاک مین ملادیا ہے۔ مگر ان مین ابھی بوے ریاست پائی جاتی ہے۔ وہ ایک خاص وضع کے پابند ہین جس کو وہ آئین شرافت سمجھتے ہین اور ایک خاص تہذیب کے یادگار ہین۔ ؎

اسلاف کے کچھ اثر ہین باقی   اِس راکھ مین کچھ شرر ہین باقی

گو خوار ہوئے ہین خو وہی ہے　　　مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

ان کی تقریر و گفتگو شستگی و پاکیزگی کی معیار ہے۔ ان کی نشست و برخاست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے۔ ان لوگون کو جنھون نے نئی تہذیب مین نشو و نما پائی ہے۔ اور جو تہذیب قدیم کے مذاق سے بالکل ناآشنا ہین۔ پرانی روشون مین سوائے عیوب کے کوئی جوہر نہ نظر آئے۔ مگر اہل نظر جانتے ہین کہ اس زوال کی حالت مین بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے۔ جس کا رنگ ابھی بالکل نہین اڑ گیا ہے۔ باوجود ہزارون عیوب کے یہان کے باشندون کے طرز معاشرت مین اب بھی ایک لطافت ہے جو کہ بیرونجات کے رہنے والون کو نصیب نہین۔ زبان کی شستگی، طبیعت داری، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ، حسن تقریر تو گویا شرفا لکھنؤ کی گھٹی مین پڑے ہین۔ سرشار نے جو کہ شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ اپنے ساتھ لایا تھا۔ فسانۂ آزاد مین اس تہذیب کا مرقع کھینچا ہے۔ مگر صرف اس تہذیب کا خوشنما پہلو ہی نہین دکھایا ہے بلکہ اس کے وہ عیوب بھی جو اس کے جوہرون کو چھپائے ہوئے ہین اور جو ہر تہذیب کے زوال مین ظہور پذیر ہوتے ہین ظرافت کے پیرایہ مین بیان کئے ہین خصوصاً محلات کے طرز معاشرت اور بول چال کا وہ رنگ دکھایا ہے کہ باید و شاید۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نوخیز اور کمسن لڑکیون کی شوخی اور طراری کا عالم دل پر بجلی گراتا ہے۔ ہر ایک بادۂ جوانی سے سرشار ہے۔ رگ رگ مین شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک بات سے ہزار رنگینیان پیدا ہین۔ قدم قدم پر ناز و انداز قربان ہوتے ہین مگر ایسی حیا پرور کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھین۔ پرانی جہاندیدہ

بڑھیون کی محبت آمیز بدگمانی اپنے رنگ مین لطف دیجاتی ہے۔ ان کی زبان سے جو نصیحت آمیز کلمے نکلتے ہین وہ ادب اور سلیقے سے معمور ہوتے ہین۔ مامائین مغلانیان ہین کہ ہوا سے لڑتی ہین، ضلع جگت مین طاق ہین۔ زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے۔ رستے چلتے لوگون پر پھبتیان کہتی ہین۔ نواب صاحب اپنے رنگ مین مست ہین عجب انداز سے شام کو چوک کی سیر کو نکلتے ہین۔ گلے مین مَنّت کے طوق پڑے ہین، بازو مین امام ضامن کا روپیہ بندھا ہے۔ تین کمر توئی کا چُست انگرکھا زیب بدن ہے۔ کمر کا عدم وجود برابر ہے۔ چوڑی دار پائجامہ پنڈلیون سے چپکا ہوا ہے۔ ٹُنکّے دار ٹوپی آپ ہی سے سر پر رکی ہوئی ہے، پانچ چار افیونی مصاحب ساتھ ہین۔ خدمتگار کے ہاتھ مین خاصدان ہے اور بغل مین بٹیرون کی کابک دبی ہوئی ہے۔ غرضکہ اسی صورت پر اس نگارینہ معانی نے مختلف تصویرین مانی و بہزاد کے قلم سے کھینچی ہین اور بیچ بیچ مین ظرافت نے ایسی گلکاری کی ہے کہ جس طرح اتنی بڑی داستان لکھنے مین مصنف کا قلم نہین تھکا ویسے ہی پڑھنے والا نہین تھکتا۔ جہان خوجی کی قرولی میان سے نکلی کہ پڑھنے والون کی باچھین کھل گئین بہروپیے اور بُوا زعفران کے معرکے ہنستے ہنستے لٹا دیتے ہین۔

اُردو مین حضرت سرشار اس طرز نو کے موجد ہین اور اُن کا یہ فخر کہ ؎

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری — اوّل بہ شگون گرد طواف حرم را

نہایت درست ہے۔ پُرانے زمانے کے فسانون مین جن مین "فسانہ عجائب" پایہ عالی رکھتا ہے زندگی کے کل مرحلے رُوحانی قوتون کی مدد سے طے کئے جاتے ہین۔ ان مین انسانی جذبات اور دانش وبینش کی وہ تصویرین نہین پائی جاتین جن سے کہ فسانہ آزاد کی رونق و وقعت ہے۔

پُرانے افسانون مین قریب قریب ہر داستان اس طرز پر ہوتی ہے۔ کہ طوطا بولا اے شاہزادہ والا تبار فلان ملک مین جو کہ یہان سے اَسّی کرور کوس کے فاصلے پر ہے ایک شہزادی ہے جس کا سا حُسن نہ دیکھا نہ سُنا۔ ضیاے رخ کا یہ عالم ہے کہ اُس شہر مین رات ہوتی ہی نہین۔ یہ سُننا تھا کہ شہزادہ صاحب کو اس سے شادی کرنے کا شوق چرّایا، اب اندھا دُھند نکل کھڑے ہوے۔ کہین صحراے طلسم مین اسیر ہوئے، کہین دیوؤن سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ کہین رات کو پریان فرش خواب سے اُٹھا لے گئین۔ کہین حضرتِ خضر سے ملاقات ہوگئی۔ غرضکہ اسی انداز پر کل داستان کی داستان پوچ و پادر ہوا خیالات کا ذخیرہ ہوا کرتی ہے فسانۂ آزاد کے بعد یہ طرز بالکل متروک ہوگیا۔ اِس کے انداز تحریر نے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا۔ جس نے کہ پُرانے وضع کی فسانہ نگاری کی وقعت کھو دی۔

اِس موقع پر اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "فسانۂ آزاد" مین باوجود اس قدر خوبیون کے اکثر عیوب بھی موجود ہین۔ جو کہ قدر دانون کی نگاہون مین کھٹکتے ہین۔ اور جن کی وجہ سے فسانۂ مذکور کی اشاعت کے وقت معترضین کو حرف گیری کا موقع ملا۔ اوّلاً جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ فسانۂ آزاد مین وہ سلسلہ و ترتیب یا انتظام نہین ہے جو کہ عموماً ناول کی شان مین داخل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ثریا بیگم کی داستان بجاے خود ایک چھوٹا سا فسانہ ہے جس کا تعلق کل قصہ سے ایسا کامل نہین ہے، جیسا کہ لازمی ہے۔ اِسی طرح اکثر مقامات پر گلہاے مضامین کے انبار لگے ہوے ہین جن سے کہ اہل تماشہ کا دماغ معطر ہے۔ لیکن ان پھولون مین کوئی ایسا رشتہ نہین جن سے ایک ہار گُندھ جائے۔ علاوہ برین میان آزاد کا چال چلن متضاد

صفات سے مملو ہے۔ شروع مین یہ شخص ایک آوارہ مزاج اور یارباش آدمی تھا۔ پنج عیب شرعی اِس مین مَوجود تھے لیکن یکایک ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ تہذیب و شائستگی رگ رگ مین سما گئی۔ ایسے وارستہ مزاج شخص کا بلاوجہ اِس قدر مہذّب ہوجانا خلاف قانون قدرت ہے۔ حُسن آرا کا بھی یہی حال ہے یعنی مسلمانون مین ابھی دو صدی تک ایسی آزادی پسند عورت نہین پیدا ہوسکتی۔ نیز یہ عقدہ نہین کھلتا کہ حُسن آرا کے خیالات کیونکر اس درجہ عالی ہو گئے۔ ظاہر ہے خیالات پر صحبت کا اثر پڑتا ہے یا تعلیم کا، حُسن آرا کی صحبت ہمیشہ پُرانے خیالات کی بیگمات سے رہی۔ اور تعلیم فارسی پائی۔ اِس صورت مین مغربی تہذیب کا رنگ اس خاتون کے خیالات پر کیونکر چڑھا۔ غرضکہ حُسن آرا کی چال ڈھال کا انداز جیسا کہ اِس فسانہ مین دکھایا گیا ہے خلاف فطرتِ انسانی ہے۔ لیکن اس سلسلہ مین یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ یہ باتین ایسی ضروری نہین ہین کہ جن سے فسانۂ آزاد ناول کے لقب کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ خوجی جو کہ فسانہ کی جان ہے۔ ہر مقام پر اپنے رنگ مین ڈوبا ہُوا ہے۔ جیسا کہ آزاد کو ہر وقت حُسن آرا کا خیال رہتا ہے، ویسا ہی اس کو افیون سے عشق ہے۔ روم ہو کہ ہندوستان، قرولی ہر وقت میان سے باہر ہے۔ کتنی مرمّت کیون نہ ہو مگر اِس کے تیور میلے نہین ہوتے۔ کیسی ہی مصیبت کیون نہو لیکن زندہ دلی اس کا ساتھ نہین چھوڑتی۔ آزاد کتنا ہی ستائین مگر وہ ان پر جان نثار کرنے کو طیار ہے۔ خوجی کی چال ڈھال شروع سے آخر تک ایک ہی سانچے مین ڈھلی ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمایون فر۔ سپہر آرا۔ بڑی بیگم۔ اللہ رکھی وغیرہ فطرتِ انسانی کی سچّی تصویرین ہین۔ اِس کے علاوہ فسانۂ آزاد مین ناول کے اور قرائن بھی موجود ہین۔ جذباتِ دلی، کیفیتِ قلبی، شادی و غم، عشق و شجاعت، جلوہ ہاے قدرت

صبح وشام، باغ، سیر۔ وغیرہ جس کیفیت کو بیان کیا ہے تصویر کھینچ دی ہے۔

فسانۂ آزاد مین یہ بھی ایک خفیف سا عیب ہے کہ مصنف سے اکثر مقامات پر تناسبِ واقعات نہ نبھ سکا۔ مثلاً ایک روز کا ذکر یون لکھا ہے۔ کہ حُسن آرا نے میان آزاد کے علم وفضل کا امتحان کیا۔ اور فرمائش کی کہ ایک بوڑھے کی شادی ہوئی ہے، اس شادی کی تاریخ کہو۔ میان آزاد نے کہا "پیرِ نابالغ"۔ پیرِ نابالغ سے ۱۲۹۲ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ روم کی لڑائی ۱۲۹۶ ہجری کے دو تین برس پہلے ہوئی۔ مگر میان آزاد اس تاریخ نکالنے کے بعد روم کی لڑائی مین شریک ہونے کے لیے گئے۔ لہٰذا تاریخ غلط ہو گئی اور واقعات مین تناسب قائم رہ سکا۔ اسی طرح ایک مقام پر حضرتِ سرشار خدا جانے کس ترنگ مین لکھ گئے کہ "بام پر پیش بہا شال کا خیمہ نصب ہوا"۔ اب معترض سوال کرتا ہے کہ "میخ کہان ٹھونکی گئی، چھت تو اس کام کی ہوتی نہین"۔ اس موقع پر ہم کو بھی لاجواب ہونا پڑتا ہے۔ ایک مقام پر مصر کا اٹاچی خوجی سے کہتا ہے۔ کہ "کرسی کے احمق ہو"۔ یہ خاص لکھنؤ کا محاورہ ہے، مصر کے اٹاچی کو اس کی کیا خبر۔ اس قسم کی لغزشین فسانۂ آزاد مین پائی جاتی ہین۔ گو کہ تعداد مین بہت کم ہین۔ مگر چونکہ یہ فسانہ نہایت عجلت اور لاپروائی کے ساتھ لکھا گیا تھا لہٰذا ایسی لغزشین قابلِ معافی ہین۔

اکثر محاورے بھی فسانۂ آزاد مین ایسے ملین گے جن کو لکھنؤ کے اہلِ زبان دار الضرب شاہی کا سکہ نہ کہین گے۔ اس قسم کی حرف گیری زیادہ تر "اودھ پنچ" کے معترضین نے کی ہے۔ اس موقع پر ہم کو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عموماً "اودھ پنچ" کے معترضین کی تحریرین انصاف پسندی کے جوہر سے خالی ہین۔ ایک ایک جملہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ دلی تعصب نے بانِ قلم

سے رنگ سخن بن کر پھوٹ نکلا ہے۔ مثلاً ایک صاحب تحریر فرماتے ہین کہ "فسانہ کاہے کو دیوانی ہانڈی یا صدقے کا ست بجا ہے۔ مصنف کا دماغ بالکل اس گندی گڑھیا سے مشابہ ہے جو کہ کوڑے کرکٹ اور لونڈون کے ڈھیلون کی بدولت چودھوین رات کو بھی کسی ستارے یا چاند کا عکس کسی جگہ نہ دیکھ سکے۔" اودھ پنچ۔ مطبوعہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ ایسی تحریر کو نہ کوئی منصفانہ تنقید کہے گا نہ ظرافت۔ اسی طرح اکثر حضرات نے کاتب کی غلطیون کا خاکہ اُڑایا ہے۔ مثلاً "چھوٹی موٹی" کے بدلے "موٹی چھوٹی" یا "چوگوشیہ ٹوپی" کے بدلے چوگوشہ ٹوپی چھپ گیا۔ تو یہ غلطیان بھی مصنف "فسانۂ آزاد" کے سر منڈھی گئی۔ (دیکھو اودھ پنچ مطبوعہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۸۰ء)

اس مین شک نہین کہ اودھ پنچ کے اکثر نامہ نگار خود اعلیٰ درجے کے لکھنے والے تھے۔ اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی مین ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ بھی اس نئے طرز تحریر کو رواج دے رہے تھے جس کو رتن ناتھ نے فسانۂ آزاد مین عرش پر پہنچا دیا۔ مگر فسانۂ آزاد سے ان حضرات کو خاص تعصب ہو گیا تھا۔ اس تعصب کی وجہ بیان کرنا گویا پرانے زخم کا ہرا کرنا ہے۔ علاوہ دوسری وجہون کے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ جس وقت سرشار اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوئے تو یہ اخبار اودھ پنچ کے ظریفون کا تختۂ مشق ہو رہا تھا۔ اس حالت مین فسانۂ آزاد سے مخالفت جائے تعجب نہین۔ کیونکہ اودھ اخبار کی جان یہ فسانہ تھا۔ بایں ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے اکثر محاورے فسانے مین ضرور قابل اعتراض ہین۔ افسوس اس قدر ہے کہ جس پیرایہ مین اودھ پنچ کے معترضین نے ان لغزشون کا خاکہ اڑایا ہے وہ مذاق سلیم کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اگر بے تعصبی اور ہمدردی کے ساتھ بھی اعتراض کئے جاتے تو ان کی وقعت بھی بڑھ جاتی اور کوئی نقصان یا ضرر بھی واقع

نہ ہوتا - اب اعتراض ملاحظہ ہون - حضرتِ سرشار فسانۂ آزاد مین لکھتے ہین "طبیعت بے مزہ ہے ذرہی جانے کیا سبب" (فسانۂ آزاد ضمیمۂ اودھ اخبار صفحہ ۵ مطبوعہ ۲۳ - جولائی ۱۸۸۰ء) اعتراض ہے - "جانے کیا ہوا" لکھنؤ کی بول چال نہین - اور بے مزہ کھانا ہوتا ہے طبیعت کو بدمزہ کہتے ہین - اسی نمبر کے صفحہ ۶ پر "داہین طرف" لکھا ہے - اصل محاورہ ہے "داہنے طرف" ایک مقام پر تحریر ہے کہ "کئی بار پاٹی پر سر دے مارا" (فسانۂ آزاد ضمیمۂ اودھ اخبار صفحہ ۳۶ مطبوعہ اگست ۱۸۸۰ء) "پاٹی" لفظ غلط ہے "پٹی" درست ہے - "غمِ مفارقت مین دل بیٹھا جاتا تھا کلیجہ مُنہ کو آتا تھا" (فسانۂ آزاد ضمیمۂ اودھ اخبار صفحہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۰ء) اِس جگہ پر محاورہ بالکل غلط ہے "دل پھٹ جانا" قطعِ اُمید ہو جانے یا بیزار ہونے کی جگہ آتا ہے نہ کہ عاشق و معشوق سے دل پھٹ جائے - "وہ تو عین دوپہر کے وقت جب چیل انڈے پر انڈا چھوڑتی ہے الخ" (فسانۂ آزاد صفحہ ۱ - مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۰ء) یہ محاورہ بھی غلط ہے - اصل محاورہ صرف اتنا ہے کہ "ایسی گرمی پڑتی ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے" - مراد یہ کہ چیل کسی حالت مین اپنا انڈا نہین چھوڑتی، مگر ایسی گرمی پڑی کہ وہ بھی اپنے انڈون سے الگ ہو جاتی ہے یعنی سینا ترک کر دیتی ہے - اِس محاورے سے صرف گرمی کا مبالغہ مدِّ نظر رہتا ہے - حضرتِ سرشار شاید انڈا چھوڑنے سے انڈا دینا مراد سمجھے - اِس قسم کی لغزشین دیگر مقامات پر بھی پائی جاتی ہین - مگر ایسی لغزشون سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرتِ سرشار زباندان نہ تھے سراسر ناانصافی ہے - ایسی لغزشون کی ہستی اتنی بڑی کتاب مین ایسی ہے، جیسے کہ کسی قلزمِ زخّار مین خس و خاشاک - اور کون ایسا مصنّف ہے کہ جس کی تصنیفات بالکل عیب سے پاک ہین - دیکھو آتش مغفور کا مصرع ہے - ع

"تماشا فلک کا ہے مطالع میرے دیوان کا"

"مطالع" محض غلط ہے، اصل لفظ ہے مطالعہ۔ ایک غزل کا مصرع ہے۔ ع

"درد درمان سے المضاف ہوا"

اصل لفظ ہے "المضاعف"۔ آتش نے المضاف غلط نظم کیا ہے۔ ایک اور مصرعہ یاد آگیا۔

ع "کوئی نہین چھوڑتا حلوہ بے دود کو"

حلوہ بے دود بھی غلط ترکیب ہے۔ "حلوائے بے دود" درست ہے۔ ایک اور مصرعہ یاد آگیا۔ ع

دلِ بیتاب کو پہلو مین اک گرگِ بغل پایا"

اعتراض ہے کہ "گرگِ بغل" غلط ہے۔ "بغلی گھونسا" محاورہ ہے۔ اب ان لغزشون کو دیکھ کر اگر کوئی شخص آتش کی زباندانی اور اُستادی پر حرف رکھے، تو یہ محض حماقت ہی نہین، بلکہ بے ادبی ہے

فسانۂ آزاد مین اکثر بھرتی کے مضامین ہین۔ مثلاً تہیا سفی کے وعظ، یا اخلاقی پند و نصائح کے متعلق تقریرین خانہ پُری کے لئے درج ہین۔ خلاقِ عالم نے حضرت سرشار کو کسی سنجیدہ کام انجام دینے کے لئے پیدا ہی نہین کیا تھا۔ وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے دُنیا مین آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہان کہین پند و نصائح کا دفتر کھولا ہے فسانہ کا رنگ پھیکا ہوگیا ہے۔

مگر باوجود ان عیوب کے جن کا ذکر سلسلہ وار کیا گیا ہے فسانۂ آزاد بحیثیت مجموعی اپنے رنگ مین لاجواب ہے۔ اِس کے جوہر اِس کے عیبون کو چھپائے ہوئے ہین۔ میرے دوستو! تحقیقات جدید سے ثابت ہوا ہے کہ آفتاب مین بھی سیاہ داغ موجود ہین لیکن جس طرح یہ داغ آفتاب کی ضیا نہین گھٹا سکتے۔ اسی طرح حضرتِ سرشار کی طبع نورانی باوجود اکثر خفیف عیوب کے

قدر دانانِ سخن کی آنکھوں کو ہمیشہ نور بخشتی رہیگی۔ ہان جو لوگ تعصب سے شپرہ چشم ہو رہے ہین وہ چاہے کچھ سمجھین۔

جہان تک محض انشا پردازی کا تعلق ہے، اس امر سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا کہ حضرت سرشار نے طرزِ قدیم کو نسخ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ رجب علی سرور کے فسانہ عجائب کی زبان نثر اُردو کا اعلیٰ نمونہ ہے، لیکن سرشار کا طرز زیادہ دلکش ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ فسانۂ آزاد کے شایع ہونے پر فسانہ عجائب کتب قدیم کے عجائب خانہ مین رکھنے کے قابل ہو گیا یعنی جس کا وجود اب صرف اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ زمانۂ قدیم مین نثر اُردو کا کیا رنگ تھا۔ دیکھو دونون مصنفون کے طرز تحریر کے نمونے پیش نظر ہین۔ دُونون کے آغاز داستان کا نمونہ دیکھو:۔

سرور۔ گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن، تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن، یعنی محرّرانِ رنگین و مورخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندہ قلم کو میدانِ وسیع بیان مین باکرشمہ سحر ساز و لطیفہاے حیرت پرواز گرم عنان اور جولان یون کیا ہے کہ سرزمینِ ختن مین ایک شہر تھا مینو سواد بہشت نژاد دلپسند خاطرِ محبوبانِ جہان، قابل بود و باش خوبان۔ الخ۔

سرشار۔ سحر کاذب کے وقت مرغ بے ہنگام نے گربہ مسکین کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر ککڑوں کوں کی بانگ لگائی۔ ہمارے حبیب لبیب دقیقہ رس صبح نفس جو سرِ شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے، یہ آواز خوش آئند سنتے ہی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔ اِدھر آنکھ کھلی، اور باچھین کھل گئین۔

دونون کے اندازِ تحریر دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور کی نثر تصنّع کے بوجھ سے گرانبار ہے

سرشار کا طرز شوخی اور بے تکلفی سے معمور ہے۔ قدرتی جوش اور صفائی بیان مل کر عجب عالم دکھاتے ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ نور کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ برخلاف اِس کے سرور کی نثر مین فرضی لطافت اور خیالی رنگینی کا دخل زیادہ ہے۔ سرور مضامین خیالیہ کی ہوا مین اُڑتے ہین سرشار نے مضامین حالیہ کی تصویر کھینچی ہے۔ اور ایسا ہونا جائے تعجب نہین۔ رجب علی سرور کے زمانے مین فارسی کا رواج بہت تھا۔ یہان تک کہ خط و کتابت فارسی مین ہوتی تھی۔ لہذا اگر اس کے طرز تحریر مین فارسی کا رنگ چوکھا ہے تو حیرت نہین۔ بہرحال جو کچھ اُس نے کیا وہ اُس کے لئے باعث فخر ہے وہ بھی زبان پر قدرتِ کاملہ رکھتا تھا اور اپنے رنگ کا آپ موجد تھا۔ مگر حضرتِ سرشار کے سامنے بھی جو مرحلہ درپیش تھا اُس کا طے کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہ تھا۔ یہ یاد رہے کہ وہی شخص ایجاد کا بانی ہو سکتا ہے جو کہ دلون کی نبض پہچاننے۔ ایسی اصلاحین تجویز کرے جن کے اختیار کرنے کیلئے زمانہ طیار ہو۔ حضرتِ سرشار مین وہ دماغی جوہر موجود تھے۔ جن سے ایسی قابلیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس انشا پردازی کی خدا نے ایک نئی دُنیا پیدا کر دی، وہ روش نکالی جو مطبوع خلائق ہوئی۔ اس وقت جتنے ناول اُردو زبان مین موجود ہین۔ سب فسانہ آزاد کے بعد لکھے گئے ہین اور سب مین حضرتِ سرشار کی طبع نورانی کا عکس نظر آیا ہے۔

یک چراغیست درین خانہ کہ از پرتو آن   ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

وہ ایک آفتاب عالمتاب ہے یہ ذرات خاکی اس سے کسب نور کرتے ہین۔ حضرتِ سرشار کی پوری وقعت کا اندازہ حضرت حالی کی حالت پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔ انہون نے اُردو شاعری کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا تھا جو کہ سرشار نے اُردو نثر کے ساتھ کیا۔ مگر چونکہ دل و دماغ

اِس کارِ عظیم کے انجام دینے کے لئے موزون نہ تھا۔ لہٰذا ناکامیاب رہے حضرت حالی نے اُردو شاعری کے آئینے پر انگریزی خیالات کی تصویر اُتارنی چاہی۔ مگر چونکہ باریک فہمی کا قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا لہٰذا تصویر کا ہزار جگہ سے چہرہ بگاڑ دیا۔ برخلاف اِس کے حضرت سرشار نے اُردو کی عروسِ زیبا شمائل کو انگریزی زیور پہنایا، مگر کسی مقام پر بے عنوانی کا سایہ نہ پڑنے دیا۔ گلہائے مضامین کے قدردان جانتے ہین کہ نثر اُردو کے باغ نے اس چمن بند کی رنگ آمیزیون سے جو رونق پکڑی اس کی ثنا و صفت حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ایک جانب تو پُرانے پتّے اور شاخین کاٹ چھانٹ کر چمن کو از سرِ نو آراستہ کیا، نئی روشین نکالین۔ دوسری طرف نثر انگریزی کے گلبن سے چند ایسی قلمین لایا جو کہ ہندوستان کی آب و ہوا مین نشو و نما پا سکتی ہین۔ اور اُن کے پیوند اپنے چمن کے پودھون مین لگائے جن سے ایسے خوشنما پھول پیدا ہوے کہ لوگ رجب علی کے لگائے ہوے باغ کو بھول گئے۔ حضرتِ حالی نے بھی زمینِ شعر مین جو پُرانا چمن لگا تھا اُس کی درستی کرنی چاہی، مگر بجائے اِس کے کہ برگِ خزان رسیدہ یا مُرجھائے ہوے پھول باغ کی روشون سے ہٹائین، سارا چمن اُجاڑ ڈالا۔ اور بلا لحاظ موافقتِ آب و ہوا چند ٹہنیان نظم انگریزی کے باغ سے کاٹ کر اِس سرزمین مین لگا دین۔ اِن ٹہنیون نے جڑ نہ پکڑی اور چند روز مین مُرجھا کر رہ گئین۔ اِس انوکھے باغبان نے اپنی محنت کو بھی ڈبویا، اور پُرانے باغ کی رونق کو بھی کھویا۔ مُراد اِس کہنے سے یہ ہے کہ پُرانی روش کا ترک کرنا اور نئی وضع کا فروغ دینا بڑی طبّاعی اور عالی دماغی کا کام ہے۔ آج کل اکثر اصحاب نئے خیالات کی تلقین کے معنی یہ سمجھتے ہین کہ انگریزی جملون کی ترکیبین اُردو نثر مین الفاظ کو توڑ مروڑ کر کسی صورت سے داخل کی جائین اور ہربرٹ اسپنسر اور آگسٹ کانٹ کے فلسفیانہ تحقیقات کے

نتایج موقع بے موقع لولی لنگڑی عبارت مین لکھ دیے جائین۔ چاہے پڑھنے والا سمجھے یا نہ سمجھے۔ یہ حضرت سرشار ہی کو فخر حاصل ہے کہ پرانے شیشون مین اچھوتی ترکیبون اور نئے خیالات کی بادۂ فرحت انگیز اِس خوبصورتی سے بھری کہ پرانے اور نئے رنگ کی طبیعتون کو یکسان کیفیت حاصل ہوئی

حضرتِ سرشار صرف فسانہ نگاری کے موجد ہی نہین بلکہ اُردو کے سب فسانہ نگارون مین ان کا پایہ عالی ترہے۔ آج کس کا مُنہ ہے کہ دو صفحے اِن کے رنگ مین لکھ سکے ہندوستان مین آج جس قدر ناول نویس موجود ہین شاید بارش کے موسم مین اِس قدر حشرات الارض بھی نہ پائے جاتے ہونگے لیکن سرشار مین اور اُن مین زمین و آسمان کا فرق ہے۔

چراغِ مُردہ کجا شمعِ آفتاب کجا

جو باتین یہ لوگ نہایت غور و فکر کے بعد پیدا کرتے ہین۔ وہ اُس کے لئے پیش پا افتادہ تھین۔ اگر اُن کے صفحون کے صفحون مین کہین ایک آدھ فقرہ شوخ ہے تو وہ راکھ کے ڈھیر مین چنگاری سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ اس کو دیکھو کہ ہزارون صفحے لکھ ڈالے مگر پھر بھی کلام کی گرمی مین فرق نہین آیا۔ یہ بھی سب جانتے ہین کہ کبھی اِس شخص نے اپنے لکھے ہوے مسودے کی نظر ثانی نہین کی۔ جس زمانے مین "فسانہ آزاد" اودھ اخبار مین شایع ہو رہا تھا۔ یہ لوگون کے چشم دید واقعے ہین کہ اخبار شایع ہونے کو ہے اور کاتب پنڈت جی کو ڈھونڈھ رہا ہے کہ فسانہ کا مقررہ حصہ لکھ دین، تاکہ اُس روز نکل جائے۔ پنڈت جی آئے اور نہایت بےتکلفی سے چار صفحے کھینچ کر پھینک دیئے اور کہا کہ آج کے پرچے مین بھیج دو۔ دیکھنے والے سمجھے کہ عجلت مین کیا لکھا ہوگا مگر نگاہ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موتی پروئے ہین۔

گو کہ ہم کو حضرتِ سرشار کے ساتھ مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ کا نام لیتے ہوے تامل ہوتا ہے، مگر چونکہ اہلِ اسلام کے ایک خاص فرقے مین آپ کی شہرت بہت ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونون کے طرزِ تحریر کا مقابلہ کیا جائے۔ انشا پردازی کے میدان مین سرشار، شررؔ سے کوسون آگے ہین۔ شررؔ کی عبارت سلیس و پاکیزہ ضرور ہوتی ہے مگر جدّت سے خالی۔ وہ بات کہان کہ ہر حرف اپنے دامن مین رنگین ادائی کے پھول لئے ہوے ہے۔ ان کی نثر ہر مقام پر زبان بے نمک و شیر بے شکر ہے۔ ذیل کے اقتباس تمثیلاً درج ہین۔

شررؔ۔ موجودہ زمانے اور مغربی تہذیب نے پنکچولٹی (پابندی وقت) کا سبق ایک حد تک سب ہی کو دیدیا، مگر اِس سے فائدہ نہ اُٹھایا تو ہمارے مشرقی دلرباؤن اور ایشیائی معشوقون نے۔ وہ آج بھی ویسے ہی وعدہ فراموش ہین جیسے سو دو سو برس پہلے تھے ... عنفوانِ شباب کی خود پرستی انھین اس بات کی اجازت ہی نہین دیتی کہ اسیرِ زلف گرہ گیر کے نالۂ شبگیر پر چھوٹون بھی ترس کھائین...... مگر عاقبت نا اندیش عاشق ایک فلک شگاف آہ کے ساتھ کہتا ہے " کیا مضائقہ؟ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اور پہلے سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ پہلے سے زیادہ عشق بازی پر آمادہ ہوتا ہے۔ (دلگداز نمبر ۱ جلد ۲ مطبوعہ جنوری ۱۹۰۰ء)

سرشار۔ مجنون سے کسی ساربان نے کہا۔ کہ میان تم دشت نوردی کیون کرتے ہو، لیلےٰ تمھارے ہتھے چڑھے۔

این خیال است و محال است و جنون

مجنون نے ہنس کر کہا، تو اِس پھیر مین نہ پڑ، تجھے معشوقون کے عشوے اور غمزے سے کیا سروکار۔ تو شتر غمزے کا عادی - جا اپنے اونٹ چرا - ع

در دلم عشقِ زلیلٰے کافیست   خواہشِ وصلِ زنا انصافیست

(دبدبۂ آصفی)

مضامین کے راستے مین شرر کا راستہ بالکل الگ ہے، شرر تاریخی ناول لکھتے ہین ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جب اُنھون نے اِس کوچے مین قدم رکھا تو اپنی قوت تحریر اور طبّاعی کا کافی طور پر اندازہ نہ کر لیا۔ اوّلاً تاریخی فسانہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو کہ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ ثانیًا یہ کہ شاعر کا دماغ اپنے ساتھ لایا ہو یعنی جس زمانے کا ناول لکھے اُس زمانے کے طرزِ معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر آنکھون کے سامنے کھینچ دے۔ انگریزی زبان مین جن فسانہ نگارون نے اِس قسم کے فسانے لکھے اُن کی رگ رگ تاریخ ماضیہ کے عشق سے معمور تھی۔ وہ تاریخ کے لئے پیدا ہوے تھے، اور تاریخ اُن کے لئے ۔ حضرت شرر ایسے واقعاتِ قدیم کے نسبت ناول لکھتے ہین جن کا تعلق تاریخ یورپ سے ہے لیکن یورپ کی کسی زبان مین دستگاہ عالی نہین رکھتے ۔ صرف ترجمون سے اپنا مطلب نکالتے ہین ۔ اِس حالت مین ان کا تاریخی علم مکمّل نہین ہو سکتا۔ نہ وہ قدیم زمانے کی سوسائٹی کے رمز و کنایہ کا کافی طور سے سمجھ سکتے ہین ۔ علاوہ برین قلم مین بھی وہ جادو نہین جو زمانۂ دیرینہ کے مردہ قالبون مین جان ڈال دے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فسانے روکھے پھیکے ہین۔ ان مین صرف تاریخی واقعات درج ہین ۔ مگر جس زمانہ کا وہ اشارہ کرتے ہین اُس زمانے کے طرزِ معاشرت کا رنگ نہین کھلتا۔ شرر کے ناولون کے سپاہی انگریزی فوج کے

سپاہی ہین، جن پر صرف عرب کا لبادہ لاد دیا گیا ہے ۔شرر کے مقابلے مین سرشار کی فسانہ نگاری کا دائرہ ضرور محدود ہے ۔ وہ صرف لکھنؤ کی سوسائٹی کا مرقع نگار ہے لیکن وہ اِس سوسائٹی کے رگ و ریشے سے واقف ہے ۔اِس کا ہر نیک و بد پہلو اس کی نظرون مین جنچا ہُوا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جس حالت کو بیان کرتا ہے اُس کا سمان بندھ جاتا ہے، وہی کیفیت آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے، وہی آوازین کانون مین آنے لگتی ہین ۔اس کے فسانون کی مخلوق جیتی جاگتی تصویرین ہین ۔ہم اُس کے فسانہ پڑھتے ہوے اس کو بھول جاتے ہین ۔ اور جو کیفیت وہ بیان کرتا ہے اِس مین ہمہ تن محو ہو جاتے ہین اور واقعی فسانہ نگار کے کمال کا معیار بھی یہی ہے ۔ برخلاف اِس کے شرر کے فسانون کی مخلوق یہ دلچسپی نہین پیدا کرتی ۔ اگر وہ بولتے ہین تو مصنّف کی آواز سے، اور دیکھتے ہین تو اس کی آنکھ سے ۔مکالمہ مین یہ تمیز نہین ہوتی کہ آدمی بول رہا ہے کہ فونوگراف سے آواز نکل رہی ہے ۔ دیکھو خوجی اور مہاراج بلی کا ذکر لوگون مین اِس طرح ہوتا ہے، جیسے اصل آدمیون کا ۔مگر شرر کی طبع فکر نے ایک مخلوق بھی ایسا نہ پیدا کیا ۔غرضکہ فسانہ نگار وہی کیفیت پیدا کر سکتا ہے جس سے اُس کو کما حقہٗ آگاہی حاصل ہو ۔سرشار جب خود اس اصول سے ہٹے ہین تو دھوکا کھایا ہے ۔مثلاً کامنی مین اُنھون نے ہندوون کے طرز معاشرت کا رنگ دکھانا چاہا ہے ۔مگر چونکہ وہ خود اس رنگ سے ناآشنا تھے، لہذا جس جگہ اُنھون نے ہندو عورتون کی چال ڈھال اور گفتگو کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اُن کا قلم چلتے چلتے رُک گیا ہے ۔مجبور ہو کر اس مرقع مین بھی اسلامی تہذیب کا رنگ بھرنا پڑا ہے ۔ ہندو طرز معاشرت کی تشریح مین در پردہ اسلامی سوسائٹی کی

جھلک نظر آتی ہے۔ یا یون کہو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خاتونون کو ہندوانہ لباس پہنا کر تصویر کھینچی ہے۔ یہ نقص جو سرشار کے ایک ناول مین ہے، شرر کے کل ناولون مین یا دی تی کے ساتھ موجود ہے۔ آخر مین یہ کہنا نامناسب نہین کہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو شرر اور سرشار کا کوئی مقابلہ نہین۔ گو کہ شرر کی شہرت سرشار سے کسی حالت مین کم نہین لیکن امر اِس حکیمانہ اصول کی تائید کرتا ہے کہ محض شہرت کو اصلی لیاقت کا معیار نہ سمجھنا چاہیئے۔

ہان اگر کوئی زمانۂ موجودہ کا مصنف حضرتِ سرشار کا ہم پایہ ہے تو وہ محمد حسین آزاد ہے۔ اِس کو بھی اُردو زبان پر قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ اُس کی مشہور و معروف کتاب "آب حیات" اُس کا نام قیامت تک زندہ رکھیگی۔ سرشار کی طرح وہ بھی ایک طرزِ نو کا موجد ہے۔ دونون مصنفون نے اپنے اپنے رنگ مین معجزہ دکھایا ہے۔ دونون کا دماغ فیضانِ قدرت سے شاداب ہے لیکن اندازِ تحریر جداگانہ ہے۔ سرشار کا طرزِ تحریر شوخ مضامین کے لئے مَوزون ہے۔ آزاد کی نثر سنجیدہ مسائل کی بحث کا بار آسانی سے اُٹھا سکتی ہے۔ سرشار کا رنگ ظریفانہ ہے اور ایک ایک لفظ پر شوخی اور رنگینی قربان ہے۔ آزاد کی عبارت سلیس و فلسفیانہ ہے اور محاورہ متانت سے دست و گریبان ہے۔ سرشار بے تکلف قہقہے پر قہقہہ لگاتا ہے۔ آزاد بھی ہنستا ہے مگر اُس کی ہنسی مسکراہٹ کی حد سے نہین بڑھنے پاتی۔ آزاد ہر مضمون کو فلسفی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور غور و فکر کے سانچے مین ڈھالتا ہے۔ سرشار ہر عالم کی سیر مصور کی آنکھ سے کرتا ہے اور جو کیفیت دیکھتا ہے اُس کو ظرافت کے پیرایہ مین بیان کرتا ہے۔ دونون کا اندازِ تحریر دیکھو۔

آزاد - کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیان بہم پہونچائین،

انہین بقاے دوام کے سامان ہاتھ آئین اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم ہین۔ بزرگ بھی وہ بزرگ جن کی کوششون سے ہمارے ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبار احسان ہو۔ ان کے کامون کا اِس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل وعیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت مین ان باتون کا مرنا ہے جس سے ان کے کمال مرجائینگے اور یہ حقیقت مین سخت غمناک حادثہ ہے۔ ایسے بزرگان باکمال کے رویے اور رفتارون کا دیکھنا انہین ہماری آنکھون کے سامنے زندہ کردکھاتا ہے اور ہمین بھی دُنیا کے پیچیدہ راستون مین چلنا سکھاتا ہے۔" (آب حیات)

سرشار۔ الٰہی یہ کیسی ہوا چلی کہ پیارے ہندوستان کے علم وفضل کا پھلا پھولا چمن اُداس ہوگیا، اولوالعزمی کی ہری بھری شاخین ایک ہی جھونکے مین پھٹ پڑین عظمت کے تناور اور بارآور درخت اراراکر زمین پر آرہے، خزان کے لشکر نے ایسا نرغہ کیا کہ بہار علم کا عمل کھڑے کھڑے اُٹھ گیا۔ اب اہل ہند مین وہ جوش نہ وہ خروش ہے جسے دیکھو بادۂ غفلت کے نشے مین مدہوش ہے۔ خوابِ خرگوش مین پڑے خرّاٹے لے رہے ہین، خیر خوب نیند بھر کر سُو چکے۔ اب بھی جاگین تو ہم سمجھین کہ بخت خفتہ بیدار ہوگیا۔

شب نیمہ گذشت وصبح سرزد   اے مرد خدا بہ خواب تا کے

(شمس الضحیٰ)

حضرتِ سرشار نے علاوہ فسانۂ آزاد کے بہت سے ناول لکھے اور اکثر انگریزی ناولون کے ترجمے بھی کئے۔ اِن تصنیفات مین "سیر کہسار"، "جام سرشار"، "کامنی" اور "خدائی فوجدار"

زیادہ تر مشہور ہیں۔ "سیر کہسار" میں ادنیٰ درجے کی مسلمان سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے عبارت شوخ اور رنگین ہے۔ مگر "فسانۂ آزاد" کے مقابلے میں سست ہے۔ "کامنی" کی کیفیت پیشتر تحریر ہو چکی ہے۔ "جام سرشار" بھی فسانۂ آزاد کی کیفیت سے خالی ہے "خدائی فوجدار" "ڈان کوئک زاٹ" کا ترجمہ ہے۔ اس کا رنگ ان کی تصنیفات میں بہت پھیکا ہے لکھنؤ سے حیدرآباد جانے کے قبل چھوٹے چھوٹے ناولوں کا ایک سلسلہ "خمکدۂ سرشار" کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ ہُشّو، کڑم دھم، بچھڑی ہوئی دُلہن، طوفانِ بے تمیزی وغیرہ اسی سلسلہ میں تصنیف ہوئے مگر ان ناولوں کو دیکھکر انیس مبرور کا شعر یاد آتا ہے۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس — عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

واقعی یہ ناول اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک زبردست مصنّف کا کمال اس قدر زوال پذیر ہو سکتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حضرتِ سرشار اس خمکدہ کی طرف رجوع ہی نہ ہوتے، مگر وہ تو اپنے قابو ہی میں نہ تھے۔ اس خمکدہ کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اِس سفر کا حال حضرت سرشار نے خود "کشمیر پرکاش" بابت ماہ مارچ ۱۸۹۹ء میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"چار برس کا زمانہ ہوا کہ میں کانگرس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا۔ وہاں سے بخت رسا حیدرآباد دکن لائے۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان امرا اور پبلک نے میری بڑی خاطر کی۔۔۔۔۔۔۔۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر فوج آصفی نے جو وزیر اور مدارالمہام بھی رہ چکے ہیں مجھے بلایا اور دو سو کا نوکر رکھ لیا۔ اور شعر و سخن اور نثر کی اصلاح لینے لگے۔ اور کسی کام پر خوش ہوئے تو

فوراً ایک اشرفی انعام خلعت اور جوڑے سال مین تین چار بار عطا ہوتے ہین ...... حضور نظام مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ جس روز اول بار مین نے نذر پیش کی اور کتابین بھی بطریق نذر پیش کین تو حضور نے یہ شرف بخشا کہ ایک گھنٹہ کامل تک ناول "سیر کہسار" کی چین دربار دُربار مین سیر کی۔ "جامِ سرشار" کا ایک سین ملاحظہ کرکے اپنے سینئیر اڈیکانگ نواب محبوب جنگ یار بہادر سے فرمایا کہ یہ دلچسپ ناول مین پڑھ چکا ہون۔ میری لائبریری مین موجود ہے۔ مین نے ولادت شہزادۂ والاتبار کی تاریخ اسی وقت بذریعۂ نواب سردار جنگ پیش کی۔ مادّہ تاریخ حضور پُرنور نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریون مین لکھ لیا گیا۔ اب میرے منصب کی کوشش ہو رہی ہے۔ نسلاً بعد نسلاً و بطناً بعد بطناً انشا اللہ تعالیٰ ...... خدا نے چاہا تو پندرہ دن کے اندر میرا نو تصنیف ناول "گورِ غریبان" شایع ہوگا۔"

حیدرآباد سے حضرتِ سرشار نے ایک رسالہ موسوم بہ "دبدبۂ آصفی" نکالا تھا۔ ابتدا مین اس مین اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے رہے۔ خود بھی اکثر لکھتے تھے۔ مگر طرزِ تحریر مین اگلی سی آب و تاب نہین رہی تھی۔ "گورِ غریبان" ناول خدا جانے شائع ہوا کہ نہین۔ دبدبۂ آصفی مین ایک ناول موسومہ بہ "چنچل نار" سلسلہ وار شائع ہوتا تھا وہ بھی ناتمام رہا۔ اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔

حضرتِ سرشار شاعری مین مظفر علی صاحب اسیر کے شاگرد تھے۔ اپنے اُستاد کو نہایت محبت کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ منشی آسیر خالی اُستاد ہی نہین تھے، بلکہ اُستاد گر تھے، شاگردون کو اُستاد بنا گئے۔ حضرت سرشار کا کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا۔ مگر طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی عجب عالم دکھاتی تھی۔ اکثر مضمون آفرینی کی طرف

بھی جُھک پڑتے تھے۔ لکھنؤ مین ایک مرتبہ مشاعرے مین ایسا شعر پڑھا کہ مشاعرہ لُٹ گیا۔

حال سب میری سخت جانی کا
باڑھ کہتی ہے مُڑ کے خنجر سے

واقعی کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے۔ ایک اور شعر ان کا انہین کے حسب حال یاد آگیا۔ ؎

پینے پہ جب آتے ہین تو پھر بس نہین کرتے
میخانے مین سُنتے نہین سرشار کسی کی

ایک غزل کا مطلع ہے۔ ؎

سیاہ بخت بتہ روزگار ہم بھی ہین
جوابِ زلف پریشان یار ہم بھی ہین

جب پنڈت بشن نراین صاحب در کے ولایت سے واپس آنے پر قوم مین طوفان بے تمیزی برپا ہوا۔ تو اُس کے فرو کرنے کے لئے ایک مثنوی "تحفہ سرشار" کے نام سے لکھی، دیکھو تمہید کس مزے کی ہے۔ ؎

لندن کی پلا دو آتشہ مے
آ پیرِ مغان کدھر چھپا ہے

ہُن برسیگا میکدہ پرلے یار
رندون کو جو تو کریگا سرشار

داتا پلوا شراب اچھوتی
خوشبو خوش رنگ تیز جو کھی

کوثر کی کھینچی نہین ہے منظور
لیڈی وائن جسے پیے حور

سرجوش شراب ناب لادے
بوتل مُنہ سے مرے لگادے

بدمست ہون پی کے ایک چلّو
زاہد کو بنائین خوب اُلّو

گھنگھور گھٹا ہے آج بادل
میخانے کو کردے تو بھی جل تھل

برسادے شراب ناب ساقی — دکھلا دے آفتاب ساقی
فتویٰ کاشی کا کون مانے — لاکھون مین یون کھلے خزانے
رم جھم یہ برس رہا ہے پانی — بے مے ہے حرام زندگانی

ایک مقام پر صبح کا عالم یون دکھایا ہے۔ ؎

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح — ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح
تارے چھپتے ہین جھلملا کر — ہے نور رسا جلوہ گر فلک پر
بھینی بھینی مہک گلون کی — اور نغمہ زنی وہ بلبلون کی
اے ساقیِ مہ لقا بدہ مے — اے مردِ خدا بخواب تا کے
وقت سحر اور خنک ہوا ہے — بے مے سب کرکرا مزا ہے
اک چٹکو کے دینے مین یہ تکرار — اُٹھو، جاگو، سحر ہوئی یار
دریا کی طرف چلے نہانے — غٹ پریون کے زنان خانے
مرغانِ چمن بہ نکتہ رانی — چون برہمنان بہ بید خوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے — شہنائے مزہ دکھا رہی ہے

ہان اتنا ضرور خیال رہے کہ اس مثنوی مین متعدد مقامات پر "گلزار نسیم" سے رنگ و بو لیکر اپنے مضامین کو تازہ کیا ہے۔ ۱۹۴۴ء مین جو کشمیری سوشل کانفرنس ہوئی تھی اس مین ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا یہ مطلع ہے۔ ؎

پھلینگے پھولینگے گلزار قوم کے اشجار — اُٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گوہر بار

فارسی بھی کہتے تھے۔ مگر بہت کم۔

عجیب بذلہ سنج، حاضر جواب، ظریف اور خندہ جبین شخص تھا۔ بات بات مین نکتہ اور ہر نکتے مین ہزارون نگینیان پیدا کرتا تھا۔ ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ نور برساتی تھی۔ جس صحبت مین بیٹھ گیا معلوم ہوتا تھا کہ بلبل ہزار داستان چہک رہا ہے۔ زندگی بھر کبھی غم و غصہ اور رنج پاس نہ آنے پائے۔ تمام عمر بیباکانہ اور آزادانہ حالت مین کاٹ دی طبیعت کبھی غور و فکر کی طرف مائل ہی نہین ہوئی، وہ اپنی طبیعت کو خوب پہچانتا تھا۔ چنانچہ کشمیری سوشل کانفرنس مین جو قصیدہ پڑھا اِس مین تعلّی کے اشعار کے زمرہ مین ایک شعر یہ بھی تھا۔ ؎

زبان وہ پائی کہ بے نطق سیکڑون بولے ... طبیعت ایسی ملی شوخ جیسے چنچل نار

واقعی سرشار کی طبیعت ایک چنچل نار ہے، جس کی ہر ادا مین شوخی اور ہر انداز مین بانکپن ہے۔ جب یہ شوخی اور بانکپن درجۂ اعتدال سے بڑھ جاتے ہین تو دیکھنے والے شرما جاتے ہین مگر وہ خود نہین شرماتی۔ اِس آزادی اور بیباکی کی وجہ سے کبھی شہرت یا جاہ و ثروت کی آرزو دل مین نہ آنے پائی۔ گو کہ زمانے سے کمال کی سند مل گئی تھی، مگر بے نیاز طبیعت نے کسی امیر یا رئیس کے در کی طرف رُخ نہ کرنے دیا۔ ؎

تمنائے دولتِ دنیا کی لے آتش نہین رہتی ... قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے مسکین کو

آخر عمر مین حیدرآباد مین ایک رئیس کے دربار مین رسائی ہو گئی تھی۔ مگر وہ بھی اپنی کوشش سے نہین۔

عجب ذہن خداداد پایا تھا، فارسی اور عربی مین فاضلانہ لیاقت نہ تھی۔ مگر طبیعت داری کا

یہ عالم تھا۔کہ علما، اور فضلا کی صحبت مین اپنا رنگ جما لیتا تھا۔ حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ ہزارون شعر فارسی اور اُردو کے ازبر تھے۔ یہی اشعار مختلف موقعون پر اپنے مضامین مین عجب انداز سے چسپان کئے ہین۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ فلان شعر فلان موقع ہی کے لئے کہا گیا ہے۔

مگر کیا افسوس کی بات ہے کہ اس باکمال نے اپنی قدر آپ نہ کی۔ بے اعتدالیون نے بے طرح دل مین جگہ کر لی تھی۔ سرشار اسم بامسمّٰی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبردست مصنّف کا کمال روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا۔ اور زندگی فارغ البالی کے ساتھ نہ بسر ہو سکی۔ سُنتے ہین کہ آخر زمانہ مین حیدرآباد مین بھی مہاراجہ کشن پرشاد نے انہین بے اعتدالیون سے ناراض ہو کر اپنا دست شفقت کھینچ لیا تھا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صاحبِ کمال بڈھا ہوتا ہے تو اُس کا کمال جوان ہوتا جاتا ہے۔ لیکن سرشار کی عمر کے ساتھ اس کے کمال مین بھی ضعف آتا گیا۔ اس عالی فہم مصنّف کو خود اس امر کا حس تھا۔ چنانچہ کشمیری کانفرنس والے قصیدے مین اپنے تئین یون خطاب کیا ہے۔ ؎

ہوا اس کمال پہ لیکن ترا بار بار افسوس | کہ تو نے قدر نہ کچھ جانی اپنی خود زنہار
کمال کے لئے لازم جو ہو زوال ضرور | اب ایک قطرہ ہے پہلے تھا قلزم ذخار
نہ آب و تاب وہ اگلی سی ہے نہ رنگ نہ روپ | نہ ہین وہ شاہد مضمون کے پھول سے رخسار
نہ حافظہ ہی رہا وہ نہ قوت ادراک | رہے کہان کہ ہر اک شے کی حد ہے آخر کار
اسی زمانے مین تو بھی امیر ہو جاتا | قبول زر مین نہ ہوتا اگر تجھے انکار

یہ زوال لازمی تھا۔ نثاری ہو یا شاعری، یہ سب دماغ کا کھیل ہے۔ آپ تسکین نے جب

دماغ ہی مین آگ لگا دی تو گلہاے مضامین بھی آتشبازی کے پھول ہوکر رہ گئے طبیعت بجھ گئی۔ کلام مین گرمی نہ باقی رہی۔ یہ ممکن نہین کہ ایسا ذہین اور ذکی شخص اس بلاے بے درمان کے اثر سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ اپنے مختلف فسانون مین اس کی ہجو و مذمت مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اپنے اوپر بس نہین چلا۔ اُستاد سچ کہہ گیا ہے

چھٹتی نہین ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اِس لکھنے سے ہماری مراد نکتہ چینی نہین اگر کسی قسم کی گستاخی کا شبہہ بھی ہو تو ہم مرحوم کی روح سے نہایت ادب کے ساتھ معافی مانگتے ہین۔ ہان بیشک یہ باتین ہمارے دلون کو عبرت کا سبق دیتی ہین۔ ہاے اِس باکمال کا دماغ اگر اپنی اصلی حالت پر رہتا تو خدا جانے وہ کن کن بلند پروازیون کی ہوا مین اُڑتا اور کیسے کیسے تارے انشا پردازی کے عرش سے توڑ کر لاتا۔ بہرحال جن لوگون کو ابھی کچھ دن اور اِس خرابہ مین عمر کاٹنی ہے اُن کو اس دردناک مثال سے سبق لینا چاہیے۔ کہتے ہین آخر عمر مین تپ دروں نے بالکل گھلا دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آخر کار ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۰۳ع کو اس دار فانی سے رحلت کی۔ تقریباً پچپن یا چھپن برس کی عمر پائی۔ ؎

سرشار فصیح و نکتہ پرور نہ رہا — سرمایۂ ناز اہل جوہر نہ رہا
اعجاز قلم کے جس کے سب قائل تھے — وہ نثر کا اُردو کی پیمبر نہ رہا

داغ

(ماخوذ از "زمانہ" جولائی ۱۹۰۵ء)

آج راہی جہان سے داغ ہوا　　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

کیا افسوس کا مقام ہے کہ اردو شاعری کے آخری دور کا آخری شاعر قدر دانان سخن کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ مدت ہوئی کہ نظم اردو کے شباب کی تاروں بھری رات خاتمے پر آچکی تھی۔ یہ پچھلے پہر کا ایک تارا باقی رہ گیا تھا جس کی روشنی دمبدم گھٹتی جاتی تھی۔ آخرکار یہ تارا بھی ہماری نظروں سے پنہان ہوگیا۔ اور اسی کے ساتھ قدیم مذاق سخن کا چراغ سحری بھی گل ہوگیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن ہی کی خاک پر چمنستان نظم اردو کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اور اس چمن کا آخری پھول دکن ہی کی خاک کا پیوند ہوا۔ یہ آخری پھول دہلی مرحوم کا رنگین مزاج اور شوخ طبع شاعر داغ تھا جس کی روح آج فردوس میں کسی حور کے گیسو میں بو کی طرح سمائی ہوگی

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اگر دنیا کے مصنوعی اعزاز و وقار کی نگاہ سے دیکھو۔ تو جہان استاد مقرب سلطان ناظم

یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک بلبل ہندوستان نواب مرزا خان داغ دہلوی کا ایسا خوش قسمت شاعر ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا۔ ذوق مرحوم شاہنشاہ دہلی کے اُستاد تھے مگر تیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ اُن کے لئے معراج ترقی ہو کر رہ گیا۔ غالب کی رگ رگ میں آبائی ریاست کا نازخون کے ساتھ شامل تھا۔ مگر اس عالی حوصلہ اور زندہ دل شاعر کی جس شکستہ حالی میں بسر ہوئی سب پر ظاہر ہے۔ آتش کے کمال پر غور کرو اور پھر یہ دیکھو کہ خاک کے بچھونے کے سوا بوریا بھی میسر نہ ہوا۔ اور اکثر اس شہنشاہ سخن کو تین تین دن فاقے سے گذر گئے۔ ناسخ کی ضرور کسی قدر فارغ البالی میں گذری، لیکن وہ شان و شوکت اُن کو بھی نہ نصیب ہوئی جو قسّام ازل نے داغ دہلوی کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ اس مال و دولت کے علاوہ اگر شہرت پر نظر ڈالو، تو جو نام آج داغ کا ہے اس پر ہر فرد بشر کو ناز ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں آج کون شہر ایسا ہے جہاں کے کوچہ و بازار میں داغ کی غزلیں ارباب نشاط کے دلوں کو نہ گرماتی ہوں۔ اور رنگین طبع سامعین کو وجد میں نہ لاتی ہوں۔ اس جاہ و ثروت اور اس عالمگیر شہرت کے اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس امر واقعی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ داغ کو یہ قابل رشک نعمتیں حاصل تھیں۔

تخلص بھی اس خوش نصیب شاعر نے ایسا نفیس پایا کہ سوائے دو چار شعرا کے کسی کے حصّے میں کم آیا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ تخلص نیا نہیں ہے۔ میر سوز کے بیٹے کا تخلص بھی داغ تھا، مگر وہ بیچارے اُبھرے نہیں۔ اور آج اُن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اور نہ اُن کا کوئی شعر کسی کو یاد ہے۔

اس مصنوعی شان و شوکت کے علاوہ اگر داغ کے شاعرانہ کمال پر نظر ڈالی جائے تو او

ہی عالم نظر آتا ہے ۔ داغ کی شاعری عجب معرکہ آرا شاعری ہے ۔ ایک فرقہ اس نامی شاعر کے معتقدین کا ہے جو اس پیمبر سخن کی شاعری کو معراج دینا اپنا ایمان سمجھتا ہے ۔ اور ان حضرات کو یہ کہنے مین تکلف نہین ہوتا کہ آتش و ناسخ و ذوق و غالب وغیرہ بھی جو چراغ شاہراہ سخن پر روشن کر گئے ہین وہ داغ کے کمال شاعری کے آفتاب کی روشنی مین ماند نظر آتے ہین ۔ یا داغ کا کمال میر و مرزا کے کمال کا مجموعہ ہے ۔ دوسرا گروہ اُن باوضع حضرات کا ہے جو داغ کے کمال سخن مین دھبہ لگانا اپنا مذہب سمجھے ہوے ہین اور جن کا یہ مقولہ ہے کہ امیر مینائی کے اکثر شاگرد داغ سے اچھا کہتے ہین ۔ یا یہ کہ داغ کی زبان دہلی کی مستند زبان نہین ہے ۔ غرضکہ داغ کے شاعرانہ وقار کی کشتی اِس وقت تحسین ناشناس اور نفرین بیجا کے دوآبہ مین پھنسی ہوئی ہے' اور ایک عجیب طوفان اِس کے گرد برپا ہے ۔ مگر زمانہ کا ناخدا اس سے زیادہ زور و شور کے طوفان جھیلے ہوے ہے ۔ وہ اِس کشتی کو بھی ایک دن اپنے اصلی مرکز پر پہونچا دیگا ۔ ہان بالفعل اس نامور شاعر کے کمال کا بے تعصبی کے ساتھ اندازہ کرنا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے ۔ کیونکہ اس راہ مین قدم رکھتے ہی اکثر ایسی صورتین درپیش آتی ہین جو گمراہ کرنے کے لیے غول صحرائی سے کم نہین لیکن انصاف پسندی اور بے تعصبی کا وہ اسم اعظم ہے جو مسافرِ تحقیق کو ضرور منزلِ مقصود تک پہونچا سکتا ہے ۔ اس حالت مین اگر دہلی اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیون کے پُرانے زخمون پر مرہم رکھ کر داغ کی شاعری پر ایک منصفانہ نظر ڈالی جاے تو یہ ثابت ہو جائیگا کہ یہ شوخ طبع شاعر نہ اس معراج کا مستحق ہے جو تحسین ناشناس کی بدولت اسے اکثر نگاہون مین حاصل ہے ۔ نہ یہ غریب اس قعر بے کمالی مین پڑا ہے جس مین اس کے بیدرد اور کم نظر مخالف اسکو دھکیلنا چاہتے ہین

داغ کے کلام کی تاثیر اس امر کی شاہد ہے۔ کہ اس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے مین
کلام نہین۔ اِس کے کلام کا اثر حرارت برقی کی طرح سُننے والے کے دل مین دوڑ جاتا ہے۔
اور ایک کیفیّت پیدا کر دیتا ہے، جس کا نام تاثیر سخن ہے۔ مگر تاثیر تاثیر مین فرق ہے اور شاعر
شاعر کے کمال مین امتیاز ہو سکتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ داغ کا پایہ اُردو شعرا کے
دربار مین کیا ہے۔ اور اس کا کلام کس قسم کی تاثیر دل مین پیدا کرتا ہے۔ اِس امر کا فیصلہ کرنے
کے لئے اِس بات کی ضرورت ہے۔ کہ یہ دیکھا جائے، کہ وہ معیار کیا ہے جس سے شاعرانہ
وقار کے مختلف مدارج کا اندازہ ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ معیار اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے، جب کہ
شاعری کے اصلی مفہوم سے واقفیت ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ شاعری کا اصلی مفہوم کیا ہے
شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے۔ کہ انسان کے خیالات اور احساسات
اُس کے جذبات دلی کے سانچے مین ڈھل کر زبان سے نکلتے ہین۔ اور ایک عالمِ تصویر پیدا
کر دیتے ہین۔ اور چونکہ شاعر کی کانون کی فضا مین سلاستِ زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا
ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اِس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ اُن مین علاوہ عالمِ تصویر
کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس مین اُس کے
اُن خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اِس کے جذبات دلی کے رنگ مین ڈوبے
ہوے اِس کی زبان سے نکلتے ہین۔ غرضکہ جذبات شاعری کی روح رواں ہین۔ اور چونکہ دل کو
دل سے راہ ہے۔ لہٰذا جس قسم کے جذبات کے رنگ مین شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہو گا وہ اسی
قسم کے جذبات سامع کے دل مین بھی جوش مین لائیگا۔ مگر ان جذبات و خیالات وغیرہ کی دو

قسمین ہین - اعلیٰ اور ادنیٰ - اعلیٰ جذبات وخیالات سے بحیثیت مجموعی فطرت انسانی کا روحانی حصّہ مراد لیا جاتا ہے - اور ادنیٰ جذبات وخیالات سے حیوانی حصّہ - جس شاعر کی فطرت مین اعلیٰ جذبات وخیالات ترقی پر ہوتے ہین وہ پاکیزہ نظری اور بلند خیالی کی ہوا مین اُڑتا ہے - برعکس اس کے جس شاعر کی فطرت مین ادنیٰ جذبات وخیالات کا دریا موجزن ہوتا ہے اِس کے اعلیٰ جذبات وخیالات ریگ تہ نشین کی طرح پامال رہتے ہین اور اُس کی شاعری سُننے والے کے دل مین بھی ادنیٰ جذبات برانگیختہ کرتی ہے - اِس معیار کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم داغ کے کمال کا اندازہ کرین تو یہ روشن ہو جاتا ہے کہ داغ کی شاعری اُن جذبات وخیالات کی تصویر ہے، جن سے فطرتِ انسانی کا حیوانی حصّہ مراد لیا جاتا ہے - اُردو شاعری عموماً عاشقانہ شاعری کہلاتی ہے - اور ایسا کہنا ایک حد تک صحیح بھی ہے - کیونکہ اُردو شعرا نے عموماً حُسن و عشق کی تصویرین اپنے جادو کار قلم سے کھینچی ہین - مگر جو اعلیٰ درجے کے اُردو شاعر ہین اُنھون نے حُسن کو محض بازاری حُسن نہین سمجھا ہے اور عشق کو محض جذبۂ حیوانی نہین خیال کیا ہے - برعکس اُس کے داغ کا معشوق ہمیشہ بازاری معشوق ہے - اور داغ کے نزدیک عشق نفس پرستی کا دوسرا نام ہے - اِس صورت مین داغ کی شاعری کو عاشقانہ شاعری کہنا زیبا نہین ہے کیونکہ داغ حُسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے بیخبر تھے - داغ کی شاعری عیّاشانہ شاعری ہے - جو عاشقانہ شاعری کے مقابلے مین ادنے درجے کی شاعری ہے - داغ کے اشعار سے وہ جذبات عالیہ جوش مین نہین آتے جن کا تعلّق حسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے ہے - بلکہ اُن کا کلام اُن خواہشاتِ نفسانی کو برانگیختہ کرتا ہے جو محض جذباتِ حیوانی سے وابستہ ہین - اعلیٰ درجے کے اُردو

شعرا نے بھی اکثر حُسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے قطع نظر کرکے داغ کے رنگ کے شعر کہے ہین مگر یہ اُن کا رنگِ خاص نہین ہے۔ جب اُن کا طائرِ خیال اپنی قدرتی پرواز کے جوہر دکھاتا ہے تو اُس عالم کی خبر لاتا ہے، جہان بازاری حُسن و عشق کا بازار سرد نظر آتا ہے۔ تمثیلاً آتش و ذوق کے کلام سے چند اشعار ذیل مین درج ہین۔ دیکھو اِن اعلیٰ درجے کے شعرا کے حُسن و عشق کا مفہوم کتنا عالی ہے۔

آتش

چشمِ نامحرم کو برقِ حُسن کردیتی تھی بند — دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا
حقیقت ہم سے پوچھے کوئی اِس عشقِ مجازی کی — بہت دیکھا ہے تصویرِ گلی کے رنگ و روغن کو
شیرین زبان ہوئی ہو فرہاد کے دہن مین — لیلیٰ پکارتی ہے مجنون کے پیرہن مین
صحرائے تن کی سیر تو مجنون ذرا کرے — محمل سوار ہے اسی گرد و غبار مین
جو نعمت عشق کی چاہے تو راحت جان ایذا کو — عصا پیچھے دیا پہلے جلایا دستِ موسیٰ کو
کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مذاق مین — مئے الفت نہ خُم مین ہے نہ شیشے مین نہ ساغر مین
محبت کی نگہ سے لطف ہر اک رنگ مین پایا — تماشا تھا جو دیکھا چشمِ بلبل سے گلستان کو
تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی — قبائے گُل مین گُل بوٹا کہان ہے
جذبِ بلبل مین اثر ہو تو قفس مین آتش — بوئے گل پھاند کے دیوارِ گلستان آئے

ذوق

مین ایسے صاحبِ عصمت پری پیکر کا عاشق ہون — نمازین پڑھتی ہین حورین ہمیشہ جس کے دامن پر

سینے میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا

پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پر کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زبان کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت ہے بند و دق
بہتر ہے اُس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

اسی طرح میر و سودا اور غالب وغیرہ کے یہاں اس رنگ کے شعر مل جائیں گے لیکن داغ کے کلام میں اس رنگ کا شعر مشکل سے ملیگا۔ اُن کے عشق و حُسن کا جو مفہوم ہے وہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

داغ

عشق کیا شے ہے یہ وہ شے ہے کہ دل میں شوقِ وصل
خون ہو کر آ گیا غم بن گیا سم ہو گیا

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کے نوکر نہیں ہوتے

یوں تو معشوق گل و شمع بھی کہلاتے ہیں
دیکھنا یہ ہے۔ کہ مرتا ہے زمانہ کس پر

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ ان کی ذات سے دُنیا کا انتظام نہیں

شوخی سے دیکھنا بھی آتا نہیں انہیں
غرفے سے دیکھ لیتے ہیں بازار کی طرف

نہ دلاسا، نہ تسلّی، نہ تشفّی، نہ وفا
دوستی اُس بُتِ بدخو سے نباہیں کیونکر

وہ شرمائی ہوئی آنکھیں وہ گھبرائی ہوئی باتیں
نکل کر گھر سے وہ گھبرانا ترا امیدواروں میں

ہائے کہنا وہ کسی بُت کا دمِ نظارہ
آنکھ بھر کر ہمیں دیکھے تو بس اندھا ہو جائے

وعدے پہ مرے اُنکے قیامت کی ہے تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اِدھر کل ہو اُدھر آج

کوئی بھی مجھ سے شبِ وعدہ یہ نہین کہتا — اُٹھو چلو کہین جلدی، وہ راہ دیکھتے ہین

داغ یا بت وہ سُن لے تو غضب ٹوٹ پڑے — کہتے پھرتے ہو بُلایا ہے سر شام مجھے

یہی اقرار، یہی قول، یہی وعدہ تھا — او دغا باز، فسون ساز مکرنے والے

ان تمام اشعار مین داغ کا مفہوم حُسن وعشق بہت ہی ادنےٰ ہے۔ یہ بھی کہہ دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر سوا دو تین شعرون کے تمام شعر "گلزار داغ" سے لیے گئے ہین جس کی تصنیف کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ داغ کے کمال کا آفتاب نصف النہار تک پہونچ گیا تھا۔ ورنہ "مہتاب داغ" مین داغ کا مذاق سخن حد سے زیادہ عیاشانہ ہو گیا ہے۔ مثلاً اُس مین اس قسم کے شعر ملین گے۔ ؎

لطف ہے مین بھی شبِ وصل کہین چھپ رہتا — آدمی اُن کا مری ٹوہ مین گھر گھر پھرتا

شاید اس سے بڑھ کر معشوق کا غلط مفہوم کسی اُردو شاعر کے کلام مین کم ملیگا۔ مہتاب داغ سے داغ کے کمال کا اندازہ کرنا انصاف سے بعید ہے۔ کیونکہ مہتاب داغ اُس وقت کی تصنیف ہے جب کہ عمر کے ساتھ داغ کے کمال شاعری پر بھی زوال آچکا تھا۔

علاوہ برین اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کا یہ دستور رہا ہے کہ ان کا طائرِ فکر حسن وعشق کے محدود قفس سے نکل کر روحانی جذبات وخیالات عالی کے طبقے مین اکثر گرم سیر رہا ہے۔ جہان نفس پرستی اور عیش پسندی کا پرندہ پر نہین مار سکتا۔ مثلاً آتش و ذوق وغیرہ نے بے ثباتی دُنیا، توکل عجز ونیاز، بلند نظری، عالی حوصلگی۔ قناعت، درد دل، سوز وگداز، تصوف وغیرہ کے مضامین شاعرانہ لطافت کے ساتھ نظم کیے ہین۔ یا اکثر مناظر قدرت کو محض مصوّر کی نگاہ سے نہین دیکھا ہے

بلکہ اُن کی باریک بین نظر کو صفحۂ ہستی کے ہر نقش و نگار کے پردے مین ایک روحانی کیفیت کا جلوہ دکھائی دیا ہے۔ جس کو اُنھون نے شاعرانہ نزاکت کے سانچے مین ڈھال دیا ہے۔ اِس نکات کا مشاہدۂ قدرت کرنا وہ اعلیٰ درجے کا شاعرانہ جوہر ہے جس پر دُنیا کے بڑے بڑے شاعر ناز کرتے ہوئے چلے گئے ہین۔ اِس رنگ کے کلام کا نمونہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

آتش

دو روزہ ہے یہ لُطفِ عیش و نشاطِ دُنیا / بوئے شبِ عروسی مہمان ہے پیرہن مین
مُسافر ہی نظر آیا نظر آیا جو دُنیا مین / جسے دیکھا اُسے آلودۂ گردِ سفر دیکھا
باغِ عالم مین ہے نا فہمون کو بے برگی کا غم / سبز پتّے اِس چمن سے زرد صورت لے گئے
عالمِ اسباب سے حاصل ہوا آخر کفن / آسمان سے مرتے مرتے ہم بھی خلعت لے گئے
نعمتِ فقر ہے موجود جسے رغبت ہو / آبِ شیرین مین ہے نانِ نمکین ٹھنڈی سہی
ادب آموز ہے ہر ایک ذرّہ اپنے وادی کا / نہین ممکن کہ گرد اُڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر
محل ادب کا ہے ٹھکرا کے چل نہ قبرون کو / پیادہ ہو کے قدم یان سوار رکھتا ہے
طلبِ دُنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہین سکتی / خیالِ آبروئے ہمّتِ مردانہ آتا ہے
نہ جب تک ہم پیالہ ہو کوئی مے مین نہین پیتا / نہین مہمان تو فاقہ ہے خلیل اللہ کے گھر سے
دستِ یارانِ وطن سے نہین مٹّی درکار / دَبّ مرونگا مین کہین گر بیابان کے تلے
باغِ جہان مین گل کی قناعت ہے جائے رشک / عمرِ دو روزہ ایک قبا مین تمام کی
تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گل کر دیا / صبح کو دزدے اُٹھا کر شمعِ تربت لے گئے

موت مانگو تو رہے آرزوئے خواب مجھے — ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

مطلب ہے سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر — دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

کعبہ و دیر میں وہ خانہ بر انداز کہاں — گردش کافر و دیندار لئے پھرتی ہے

بتخانہ کھود ڈالئے مسجد کو ڈھائیے — دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

پشت بر دیوار حیرت ہیں ہزاروں صورتیں — صاحب آئینہ خانہ آج تک روپوش ہے

اے موج بے لحاظ سمجھ کر مٹائیو — دریا بھی ہے اسیر طلسم حباب کا

نہیں کچھ دفتر گل ہی میں لکھی سرنوشت اسکی — شہادت نامۂ بلبل ہے ہر پتا گلستان کا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی — کیا کیا جلا ہے ساکھو پھولا جو ڈھاک بن میں

ہوا ہے قحط کیوں عالم میں موسیٰ و تجلی کا — وہی پتھر نظر آتے ہیں اب تک کوہساروں میں

اثر رکھتی ہے گلگاؤں کی کیفیت کی ہستی ہے — ابھرتے ہیں حباب بحر کے اک جوش مستی سے

خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی — یہ بیکسوں کے مزاروں کا شامیانہ ہوا

ذوق

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

بند آنکھیں کئے جاتا ہے کدھر کو، کہہ تجھے — ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

ہنسی کے ساتھ یہاں رونا ہے مثل قلقل مینا — کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت — تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہم رونے پر آجائیں تو دریا ہی بہا دیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
پتنگے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی — جب قصدِ خون کو آئے تو پہلے پکار دے
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے
کھل کے گل کچھ تو بہارِ جانفزا دکھلا گئے — حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے
افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف — لپٹا پڑا ہے مُردہ سا گویا کفن کے ساتھ
آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلےٰ — صد حیف کہ مجنون کا قدم اُٹھ نہیں سکتا
اِس گلستانِ جہان میں کیا گلِ عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے لیکن سیر کی فرصت نہیں
جو یہ سمجھتے کہ چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے — تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے
رنگین سوا ہے ایکے گلِ نو بہار سے — اُگا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں سے،
نہیں گوش شنوا باغ جہان میں غافل — ورنہ ہر برگ ہے یان نغمہ سرائی کرتا
گندم ہو سینہ چاک فراقِ بہشت میں — آدم کو کیا نہ ہو گی محبت وطن کے ساتھ
اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے
کب لباسِ ظاہری میں چھپتے ہیں روشن ضمیر — پردۂ فانوس میں بھی شعلہ عُریان ہی رہا

داغ کے کلام میں ایسے جذباتِ رُوحانی اور خیالاتِ عالی کا پتا نہ ملیگا۔ نہ اس رنگ کی مشاہدۂ قدرت کی تصویریں نظر آئیں گی۔ بیشک داغ پر کہیں کہیں ذوق کا سایہ پڑ گیا ہے۔ اور دو چار شعر بیکسی و یاس کے رنگ میں قلم سے نکل گئے ہیں۔ مثلاً داغ کہتے ہیں۔

اے آرزوئی تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ — میں پائے شوق و دستِ تمنا بُریدہ ہوں

لامکان مین بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے ۔۔۔ بیکسی مین تو اُدھر ہون کہ جدھر کچھ بھی نہین

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی ۔۔۔ چمپا کھلا گلاب کھلا موتیا کھلی

خدا کرے نہ کسی کو امیدوار وصال ۔۔۔ دُعائین مانگتے ہین ترکِ مدّعا کے لئے

مگر ایسے شعرون کی تعداد داغ کے کلام مین بہت کم ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ عموماً اِس شوخ طبع شاعر کا کلام ہجر و وصل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کا ذخیرہ ہے۔ واقعی سچ کہا ہے

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی قصّہ ہے وصلت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

پس جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ داغ کی شاعری کے لئے سب سے مَوزون لقب عیّاشانہ شاعری ہے۔ اکثر حضرات فرماتے ہین کہ داغ کا کلام دل مین چُٹکی لیتا ہے، یہ بات آتش و ذوق و غالب وغیرہ کو نصیب نہین۔ مگر ان حضرات کو یہ خیال کر لینا چاہئیے کہ داغ کا کلام کس قسم کی "چٹکی" لیتا ہے یعنی کس قسم کی تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی حسین و حیا پرور صُورت نظر آئے یا کسی شاداب چمن یا دل فریب منظر کی سیر نصیب ہو تو انسان کے دل کو ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کا نام بھی تاثیر ہے۔ اور مین کہون گا۔ کہ ذوق و آتش وغیرہ کی شاعری اسی قسم کی تاثیر سے مالامال ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی چربانک عورت بانکا دوپٹا اوڑھ کر سامنے سے نکل جائے تب بھی دل مین ایک خاص کیفیّت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کو بھی تاثیر کہین گے۔ داغ کا کلام سُننے سے اسی قسم کی تاثیر دل مین پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ذوق کا شعر ہے۔ ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ۔۔۔ ورنہ طاعت کے لئے کرّوبیان کچھ کم نہ تھے

ذوق کا یہ خیال کہ انسان دردِ دل کے واسطے پیدا ہوا ہے یعنی غیروں سے ہمدردی کرنے کے لئے، نہ کہ محض اپنے بھلے کے لئے عبادت کرنے کو۔ یہ وہ پاکیزہ خیال ہے جس کو تہذیبِ انسانی کا معیار سمجھنا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ خیال اِس شعر مین شاعرانہ لطافت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے پڑھنے سے یا سُننے سے بلند ہمتی اور ہمدردی کے جذباتِ عالی جوش مین آتے ہین۔ داغ نے بھی اسی طرز کا ایک شعر کہا ہے۔ ؎

پندِ واعظ سُنتے سُنتے کان اپنے بھر گئے
کیا عبادت کو ہمین ہین سب فرشتے مر گئے

اِس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم کیون عبادت کرنے لگے یہ کام فرشتون کا ہے۔ اندازِ بیان مین ایک ظریفانہ شوخی ہے جو دل مین چٹکی ضرور لیتی ہے، مگر کسی جذبۂ عالی کو جوش مین نہین لاتی وہ بات کہان۔ ع ”دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو“

اسی طرح اکثر حضرات داغ کی زبردست شہرت سے یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ داغ کی شاعری بھی اعلیٰ درجے کی شاعری ہے چنانچہ کہتے ہین کہ داغ کے شعر آج ہندوستان مین بچے بچے کی زبان پر ہین۔ آتش و ذوق و غالب وغیرہ کو بھی ایسی شہرت حاصل نہوئی۔ بیشک داغ کی شہرت سے کوئی انکار نہین کر سکتا۔ لیکن امر غور طلب یہ ہے کہ محض شہرت کو اصلی قابلیت کا معیار سمجھنا ہرگز جائز نہین ہے۔

داغ کی یہ شہرت محض اس لئے ہے کہ اُن کا کلام عموماً اُن جذبات اور خواہشاتِ نفسانی کی تصویر ہے جو عوام کے دل مین اُمنگ پیدا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتی ہین۔ برعکس اس کے

آتش و ذوق و غالب وغیرہ کے کلام کی قدر کرنے اور سمجھنے کے لئے ایک قسم کی شاعرانہ تربیت اور مذاق کی شائستگی درکار ہے۔ عوام النّاس کی فطرت مین چونکہ جذبات روحانی اور خیالاتِ عالی خس پوش پھولون کی طرح خواہشات نفسانی اور ادنے جذبات سے دبے رہتے ہین اور چونکہ علم سے اُن کے آئینۂ فہم کو جِلا نہین ہوتی، لہذا وہ آتش اور غالب وغیرہ کی بلند پروازی کی داد نہین دے سکتے۔ اُن اعلیٰ درجے کے شعرا کی وقعت ترتیب یافتہ طبقون تک لازمی طور سے محدود ہے مثلاً داغ کا شعر ہے۔ ؎

ہائے کہنا وہ کسی بُت کا دمِ نظّارہ ۔۔۔ آنکھ بھر کر ہمین دیکھے تو بس اندھا ہو جائے

ہر بازاری شخص کو یہ شعر اسی قسم کا کوئی نہ کوئی گذشتہ تجربہ یاد دلا دیگا۔ اور اس لئے وہ اس کو سُن کر تڑپ جائیگا لیکن اگر اسی شخص کے سامنے آتش کا ذیل کا شعر پڑھ دیا جائے۔ ؎

چشمِ نامحرم کو برقِ حُسن کر دیتی تھی بند ۔۔۔ دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا

تو اُس کو خاک لطف حاصل نہ ہوگا کیونکہ جو جذبۂ عالی اِس شعر کے پڑھنے سے جوش مین آسکتا ہے وہ شخص مذکور کے دل مین مُردہ حیثیت مین ہے۔ اِس شعر کی داد وہی سخن فہم دیگا جس کی طبیعت مین پاکیزگی کا جوہر موجود ہے۔ اور جس کو شاعرانہ ترتیب حاصل ہے۔ داغ کا کلام اُنہین لوگون مین ضرورت سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے جو اعلیٰ درجے کی شاعری سے واقف نہین ہین۔ مثلاً ارباب نشاط کا فرقہ داغ کو اپنا پیمبر سمجھتا ہے۔ اور ایسا ہونا تعجب کی بات نہین ہے کیونکہ عیاشانہ شاعری سے جو جذبات جوش مین آتے ہین اُن کی لذت سے اِس طبقۂ خاص کے برابر کون واقف ہو سکتا ہے پس کسی شاعر کے کلام کا عام فہم ہونا اُس کے کمال شاعری پر دلالت نہین کرتا۔ اکثر شاعر ایسے

ہین جن کو پسند عام کے ساتھ قبول خاص کا شرف بھی حاصل ہے، مگر داغ اس شرف سے محروم ہین۔ اُن کا کلام جس قدر عام پسند ہے اُس حدتک خاص طبقون مین مقبول نہین۔

اکثر بزرگوار یہ بھی کہتے ہین کہ داغ کا سُلجھا ہُوا کلام عموماً استعارون اور تشبیہون کی گتھیون سے پاک ہے، محض سُتھری ستھری ترکیبین ہین اور ہر شعر روزمرّہ کی گفتگو کی تصویر ہے۔ اِن حضرات کے نزدیک کمال شاعری کے معنے یہی ہین۔ کہ اندازِ بیان سلیس ہو اور کوئی محاورہ یا چٹکلا روانی کے ساتھ نظم کردیا جائے۔ مگر سخن فہم جانتے ہین کہ یہ باتین ادنے قسم کے محاسن شعری مین داخل ہین۔ شاعری کے جوہرون مین استعارہ و تشبیہ کا پایہ بہت بلند ہے۔ استعارہؔ و تشبیہ کی پختگی سے کلام کی تاثیر ہی نہین بڑھ جاتی بلکہ شاعر کی نازک خیالی اور باریک بینی کا بھی پتا چلتا ہے جن دو اشیا مین بادی النظر مین کوئی مشابہت نظر نہین آتی شاعر اُن کا پرتو اپنے آئینۂ خیال مین دیکھتا ہے۔ اور اس کی باریک بین نگاہ کو اُن اشیا مین معنوی حیثیت سے ایک مناسبت نظر آتی ہے وہ اِس کیفیت کی تصویر الفاظ مین کھینچ دیتا ہے۔ اِسی کا نام تشبیہ و استعارہ ہے۔ دیکھو اعلیٰ درجے کے اُردو شاعرون نے اِس رنگ مین کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے۔ ؎

آتش

کیا پوچھتے ہو حال خزان و بہار کا
اک زخم تھا کہ خشک ہوا اور نم ہُوا

جو کام ہین نہین اندیشۂ آتش اُن کو بدن کا
وہان زخم کاری خندہ زن ہین چشم سوزن پر

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مرد ودوستان ہو
جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبار خاطر ہوا چمن کا

ایذا مین روح ہے تنِ خانہ خراب سے
پائے سمند اُلجھا ہوا ہے رکاب سے

نازک خیال اَب بھی ہین موجِ اَفلاک — خالی رہا نہین کبھی دریا حباب سے
قیدِ عفت مین ہو وہ محبوب عاشق جان بلب — نزع مین بیمارِ عیسیٰ دامنِ مریم مین ہے
جوشِ جنون مین دیکھیے پیچھے نہ مُڑکے پھر — رُخ جس طرف کو صحبتِ دریا اُٹھایئے

ذوق

سمجھ یہ دار و رسن تار و سوزن اے منصور — یہ چاک پردہ حقیقت کا ہین رفو کرتے
ہوا پہ دوڑتا ہی اس طرح سے ابرِ سیاہ — کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر
نہ چھوڑ تو کسی عالم مین راستی کہ یہ شے — عصا ہی پیر کو اور سیف ہے جوان کے لئے
بیٹھے بھرے ہوے ہین خمِ مے کی طرح سے — پر کیا کرین کہ مُہر ہے لب پر لگی ہوئی
وادیِ ظلمت مین اپنے دخل کب ہے نور کا — پھر اک شعلہ سا ہے وہ بھی چراغِ طور کا
دل کا یہ حال ہو غم سے ترے اے مستِ ناز — جیسے مُرجھایا ہوا دانہ کوئی انگور کا
رہے جون شیشۂ ساعت وہ مکدر دونون — کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
دیکھو چھوٹون کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسمان آنکھ کے تل مین ہے دکھائی دیتا

ان اشعار کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعلے درجے کے شعرا نے محض محاورہ یا چٹکلا یا چونچلا نظم کرنے کو معراج کمال نہین تصور کیا ہے۔ بلکہ اپنے لطیف خیالات کے دریاے موجزن کو استعارہ یا تشبیہ کے کوزے مین بند کرکے معجزہ دکھایا ہے۔ داغ کا مذاق سخن عموماً محاورے یا چٹکلے نظم کرنے تک محدود ہے۔ اگر کبھی استعارہ یا تشبیہ کی طرف توجہ ہوئی ہے تو محض پامال اور

پیش پا افتادہ تشبیہون اور استعارون سے کام لیا ہے۔ مثلاً زلف کو سنبل سے۔ لب کو گلاب کی پتی سے۔ ہلال کو ابرو سے۔ آبلہ کو آنکھ سے تشبیہ دی ہے۔ یا گل کا ہنسنا، شبنم کا رونا، یا سایہ کا اُفتادہ ہونا نظم کیا ہے ؛۔

داغ

سوز و گدازِ عشق کا لذّت چشیدہ ہون ۔۔۔ مانند آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہون

افتادگی پہ بھی نہ گئی میری جستجو ۔۔۔ گویا زمین پہ سایۂ مرغ پریدہ ہون

ابتدائے رمضان میں ہے مہ عید کی دھوم ۔۔۔ کسی کافر نے دکھایا نہ ہو ابرو اپنا

اِس قسم کی تشبیہون اور استعارون سے اِس امر کا ثبوت نہین ملتا کہ شاعر مین نازک خیالی اور باریک بینی کا مادّہ غیر معمولی طور سے موجود ہے۔

اب تک ہم نے محض جذبات و خیالات وغیرہ کی لطافت، طبیعت کی بلند پروازی، نازک خیالی اور باریک بینی وغیرہ کے لحاظ سے داغ کی شاعری پر بحث کی ہے۔ اور اس امر کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ یہ جوہر جو کہ شاعری کے جزو اعظم ہین۔ داغ کے کلام مین بمقابلہ دیگر گرامایہ شعرائے اُردو کے کس حد تک موجود ہین۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہین کہ داغ کی زبان کا کیا رنگ ہے۔

زبان مضامین کا لباس ہے۔ اور جیسا کہ لباس و ملبوس مین عموماً ایک تناسب پایا جاتا ہے اسی طرح داغ کی زبان خاص طور پر اُن مضامین کے نظم کرنے کے لئے موزون ہے جو اس رنگ کی طبیعت کے ساتھ خصوصیّت رکھتے ہین۔ چنانچہ داغ کی زبان کی بے تکلفی اور شوخی عیاشانہ مضامین کا حسن دوبالا کر دیتی ہے۔ اور یہ شوخی اور بے تکلفی بھی ضرور ایک حد تک قابل تعریف ہے،

کیونکہ یہ خوبیان بھی ہرکس و ناکس کے حصّے مین نہین آئین لیکن وہ جوہر عالی جو شاعرانہ زبان کی جان ہے داغ کی زبان مین موجود نہین - یہ وہ جوہر ہے جو زبان مین الفاظ سے صنّاعی کرنے سے پیدا ہوتا ہے - صنّاعی سے میری مراد تصنّع نہین ہے - تصنّع اُس تکلّف زائد کا نام ہے جو قدرتی خوبیون پر پردہ ہو جاتا ہے - برعکس اس کے صنّاعی سے کسی شَے کے قدرتی محاسن کا عالم دوبالا ہو جاتا ہے - جس طرح کوئی عالی دماغ صنّاع کسی چاندی یا سونے کے ٹکڑے سے نفیس نفیس زیور تیار کرلیتا ہے - اسی طرح اعلیٰ درجے کے شعرا روزمرّہ کی گفتگو کو نازک بندشون اور چُست ترکیبون سے آراستہ کرکے اپنی زبان مین ایک عالم تصویر پیدا کردیتے ہین جس کا حسن تاثیر بیان نہین کیا جا سکتا مگر محسوس ہو سکتا ہے - آتش نے اپنے ذیل کے شعر مین اسی کیفیت کا اشارہ کیا ہے - ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگون کے کم نہین
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

داغ کی زبان مین اس صنّاعی کو دخل نہین ہے اُنھون نے محاورے اور چٹکلے بجنسہٖ اسی طرح نظم کردیے ہین جس طرح روزمرّہ کی گفتگو مین بولے جاتے ہین - حاصل یہ کہ داغ کی زبان زبانِ اُردو کا وہ پاک اور نفیس سرچشمہ نہین ہے جو آتش ذوق انیس وغیرہ کے فیضان سخن سے ہندوستان مین جاری ہے اور جس کا ترنم قدر دانانِ سخن کو ہمیشہ وجد مین لاتا رہیگا - دیکھو اعلیٰ درجے کی شاعرانہ زبان یہ ہے - ؎

آتش

وہی نشو و نماے سبزہ ہے گورِ غریبان پر
ہواے چرخ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

مصوّر کو تری تصویر کا سودا مبارک ہو
مقامِ گیسوے مشکین و خالِ عنبرین آیا

تراشا تجھکو جس بُت ساز نے اے بُت قیامت کی
بنایا شیشے سے نازک مزاج سنگ خارا کو

موسمِ گل کی ہوا کرنے لگی نازپری
سکّہ بازارِ جنون کا داغ سودا ہو گیا

چمن مین جا کے بھولے سے مین خستہ دل کراہا تھا
گیا کی گل سے بلبل حیلۂ دردِ گلو برسون

سبوے غنچہ ہے معمور جامِ گل لبریز
ٹپکے ہی ہے شراب ابرِ نو بہار سے

آنکھ وہ فتنۂ دوران کسے دکھلاتا ہے
شعبدہ جانتے ہین گردشِ ایّام کو ہم

شباب تک نہین پہونچا ہے عالمِ طفلی
ہنوز حُسن جوانی یار راہ مین ہے

بہارِ لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن مین
گریبان پھاڑ کر چل بیٹھیے صحرا کے دامن مین

اسی طرح اور اعلےٰ درجے کے اُردو شعرا نے اپنی اپنی لیاقت و قابلیت کے مطابق صنّاعی کو زبان مین دخل دیا ہے۔

اب داغ کا رنگ زبان ملاحظہ ہو۔

داغ

حضرتِ دل آپ ہین کس دھیان مین
مر گئے لاکھون اسی ارمان مین

دل کی قیمت اک نگہ ہے اے صنم
آ گئے جو آئے تیرے ایمان مین

لُطفِ مے تجھ سے کیا کہون زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہین

شبِ وعدہ گزر گئی آدھی
اب سُنا ہے کہ تیل سر مین پڑا

مرحبا او دل دین لے کے مکرنے والے
ہاتھ کانون پہ مرے نام سے دھرنے والے

داغ کہتے ہین جنھین دیکھیے وہ بیٹھے ہین
آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے

بتاؤن نام اے دربان تجھے کیا
یہ کہدے کوئی آیا ہے کہین سے

دل مین سما گئی ہین قیامت کی شوخیان
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ مین

وقت ملنے کا جو پوچھا تو کہا کہدین گے
غیر کا حال جو پوچھا تو کہا کہتے ہین

دیکھا ہو بتکدے مین جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

داغ کے نام سے نفرت ہے وہ جل جاتے ہین
ذکر آنے کو تو کمبخت کا اکثر آیا

جس طرح علم الارض کے جاننے والے زمین کے دو طبقون مین وہ فرق محسوس کر لیتے ہین جو معمولی شخص کو نظر نہین آسکتا۔ اسی طرح سخن شناس اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہین کہ داغ کی زبان مین اور آتش کی زبان مین کیا فرق ہے۔ دونون کی زبان مین پاکیزگی اور روانی کے جوہر موجود ہین۔ مگر ایک مین قدرتی سادگی کے علاوہ شاعر کے جادو نگار قلم نے عالم تصویر پیدا کر دیا ہے۔ دوسرے مین محض وہی سادگی اور روانی ہے جو پانی مین ہوتی ہے۔ یا یون کہیے کہ دو آئینے ہین ایک محض شیشے کا ٹکڑا ہے۔ دوسرے مین جلا بھی کر دی گئی ہے۔

اکثر ایسے معمولی مضامین ہین جن کو ہر اُردو شاعر اپنی میراث سمجھتا ہے اور جن کو نظم کرنے مین صرف اسی قدر جدّت صرف کرنا پڑتی ہے کہ بندش و ترکیب الفاظ کا لباس نیا ہو۔ دیکھو داغ نے اس قسم کے مضامین کو زبان کا کیسا سادہ لباس پہنایا ہے، اور اُردو کے اعلیٰ درجے کے شعرا نے ان شاہدانِ معنی کے لئے کیسا نفیس پیراہن تیار کیا ہے۔

داغ	اے داغ بُرا مان نہ کچھ اُسکے کہے کا	معشوق کی گالی سے تو عزت نہین جاتی
مومن	دشنام یار طبع حزین پر گران نہین	اے ہمنشین نزاکتِ آواز دیکھنا
داغ	کون تھا مجھ سا تمنائی کہ برسون میرے بعد	قبر پر آکے چلاّئی پکاری آرزو
آتش	برابر جان کے رکھّا ہوُ اسکو مرتے مرتے تک	ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسون
داغ	جاتے تھے مُنہ چھپائے ہوئے میکدے کو ہم	آتے ہوے اُدھر سے کئی پارسا ملے
غالب	کہان میخانے کا دروازہ غالب اور کہان واعظ	پر اتنا جانتے ہین کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
داغ	دیکھا ہے تم کو آخر شب پاس غیر کے	سُنتے ہین خواب صبح کا ہوتا ہے کم غلط
غالب	بغل مین غیر کے آج آپ سوئے ہین کہین ورنہ	سبب کیا خواب مین آکر تبسمہاے نہان کا
داغ	وہ اثر سے مین ڈرا ہون کہ دعا مین مانگتا ہون	کہ مری دُعا الٰہی نہ ہو مستجاب ہرگز
مومن	مانگا کرین گے ہم بھی دُعا ہجر یار کی	آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ
داغ	بھلا ہو پیر مغان کا ذرا نگاہ ملے	فقیر ہین کوئی مچلّو خدا کی راہ ملے
آتش	کیا بادۂ گلگون سے مسرور کیا دل کو	آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

اِس طولانی بحث سے ہمارا منشا یہ ہے کہ اہلِ سخن پر ظاہر ہو جائے کہ بلحاظ نوعیت مضامین ونیز بلحاظ حُسن بیان وپاکیزگی زبان داغ اُن اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کے ہمپایہ نہین ہین جن کا شمار نظم اُردو کے دربار کے بالانشینون مین ہے۔ اور جو داغ کے رنگ کے خصوصیات ہین۔ مثلاً محاورے یا چٹکلے نظم کرنا۔ استعارہ وتشبیہ سے کم کام لینا۔ عاشق ومعشوق کی نوک جھونک کے عیاشانہ مضامین شوخی اور چلبلاہٹ کے ساتھ باندھنا یہ خصوصیات اعلیٰ درجے

کی شاعری کے جوہر نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ داغ کی شاعری بحیثیت مجموعی عیاشانہ شاعری ہے۔ اور عیاشانہ شاعری ادنے درجے کی شاعری خیال کی جاتی ہے۔ آج جبکہ شاعری کا اصلی مفہوم اکثروں سے فراموش ہوگیا ہے تو ممکن ہے کہ ایسا کہنا بہت سے حضرات کو ناگوار گذرے لیکن اُردو کے اساتذۂ قدیم بھی عیاشانہ شاعری کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ قدما میں میاں جُرأت اس رنگ کے کہنے والے تھے۔ ان کی نسبت میر تقی میر کا جو خیال تھا وہ ذیل کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

کسی مشاعرے میں ایک دفعہ جرأت نے غزل پڑھی اور غزل بھی وہ ہوئی کہ تعریفوں کے غل سے شعر تک سُنائی نہ دیے۔ میاں جُرات یا تو اُس جوش سرور میں جو اس حالت میں انسان کو سرشار کردیتا ہے یا شوخی مزاج سے میر صاحب کے چھیڑنے کے ارادے سے ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے اُن کے پاس آکر بیٹھے اور کہا کہ حضرت اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنا بے ادبی اور بے حیائی ہے مگر خیر۔ اِس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی وہ آپ نے سماعت فرمائی؟ میر صاحب تیوری چڑھا کر جھکے ہو رہے۔ جرات نے پھر کہا، میر صاحب کچھ ہوں ہاں کرکے پھر ٹال گئے۔ جب اُنہوں نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہیں:۔

"کیفیت اِس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔" (آب حیات)

اِس موقع پر ایک غلط فہمی کا رفع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یعنی معترض کہہ سکتا ہے کہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ کے یہاں بھی ایسے شعر ملیں گے جو عیاشانہ شاعری کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جن کی زبان کا رنگ داغ کی زبان سے ملتا ہو مثلاً آتش کہتے ہیں:۔

ع وصل کی شب رنگ گروں نوع دیگر ہوگیا ۔۔۔ شام سے یار او رمیں جامے سے باہر ہوگیا

یا غالب کہتے ہین :۔

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن
ڈھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہین

پس ان شعرائے گرانمایہ مین اور داغ مین کیا فرق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام کا اندازہ متفرقات سے نہین کیا جاتا بلکہ اس کے کلام پر اک جامع اور وسیع نظر ڈالی جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ بالعموم اس کی طبیعت کا رنگ کیا ہے۔ اور کس قسم کے مضامین نظر کرنے مین اس کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آتش و غالب وغیرہ کے یہان اکثر عیاشانہ مضامین کے شعر ملین گے۔ مگر وہ اِن کی شاعری کے دامن پر داغ خیال کئے جاتے ہین۔ جس رنگ کے اشعار سے اِن کا وقار قائم ہے۔ وہ کسی اور ہی عالم کا اشارہ کرتے ہین۔ اِسی طرح داغ کا ایک شعر اسیر یا ناسخ کے رنگ مین ہے

پانی کی کب گرہ پر ماہی مین رہ گئی
رُکتے ہین پیچ و تاب سے بھی تیز رو کہین

اگر دو چار شعر داغ کے کلام مین اس رنگ کے اور نکل آئین تو اُن کی بنیاد پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ داغ کے رنگ مین اور ناسخ یا اسیر کے رنگ مین کوئی فرق نہین ہے۔ کیونکہ اس قسم کے اشعار کی تعداد داغ کے کلام مین بہت ہی محدود ہے اور نیز اس رنگ کے مضامین کے نظم کرنے مین داغ کو وہ کامیابی نہین حاصل ہوئی جس کا پتا اُن کے عیاشانہ رنگ کے اشعار مین ملتا ہے یعنی وہ بے تکلفی اور شوخی جو داغ کے لئے باعث فخر ہے اس طرز کے اشعار مین نظر نہین آتی۔ پس اگر داغ کا اور دیگر اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کا موازنہ منظور ہے تو یہ دیکھو کہ آتش و غالب وغیرہ کے طائر فکر کی قدرتی پرواز کیا ہے اور اُن کے اُن اشعار پر غور

کرو جوان کی شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمک رہے ہین اور پھر یہ دیکھو کہ داغ کی پرواز فکر کا نقطۂ انتہائی کیا ہے اور کس رنگ کے اشعار اس کی شہرت کے لئے طرۂ دستار ہین - اِس روش پر چلنے سے یہ آئینہ ہو جائیگا کہ جو عیاشانہ مضامین آتش و غالب وغیرہ کے جام سخن مین تلچھٹ کی طرح نظر آتے ہین - داغ کا ساغرِ فکر انہین سے لبریز ہے - داغ کی شاعری کی زمین و عمارت کا بام عالی ان کے رفیع الشان قصر سخن کا آستانہ ہے - پس آتش و غالب وغیرہ کے یہان اکثر مقامات پر عیاشانہ رنگ کے اشعار کا ہونا بہ حیثیت مجموعی ان اعلیٰ درجے کے شعرا کا وقار نہین گھٹا سکتا - نہ داغ کو ان کا ہمپایہ ثابت کر سکتا ہے -

مگر با این ہمہ اِس وقت اِس تیرہ خاکدان ہند مین داغ کے دم کی روشنی غنیمت تھی - اُردو شاعری کا نام اسی کی ذات سے زندہ تھا - گو وہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ کا ہمپایہ نہ ہو لیکن اس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے مین کوئی شک نہین - اور اِس نعمت خداداد کا حاصل ہونا بھی کچھ کم فخر کی بات نہین ہے کہ اس کے کلام کی شوخی مصنوعی شوخی نہین ہے - جو شعر اس کی زبان سے نکلتا ہے تاثیر مین ڈوبا ہوا نکلتا ہے اور اصل یہ ہے کہ اپنے رنگ خاص مین وہ معجزہ دکھا گیا ہے - واقعی کیا خوب کہا ہے -

دل کا کیا حال کہون صبح کو جب اُس بت نے — لیکے انگڑائی کہا ناز سے ہم جاتے ہین
آتا ہے مجھ کو یاد سوالِ وصال پر — کہنا کسی کا ہاے وہ منہ پھیر کر نہین
گلے شکوے کہانتک ہونگے آدھی رات تو گذری — پریشان تم بھی ہوتے ہو پریشان ہم بھی ہوتے ہین
خبر سُن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبون سے — خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

کسی کی نرگس مخمور کچھ کہدے اشارون مین ۔۔۔ مزا ہے رات دن چلتی رہے پرہیزگارون مین

غضب ہے دیکھنا اس سادگی پر مر گئے لاکھون ۔۔۔ کہا تھا کس نے بن ٹھن بیٹھیں وہ میرے سوگوارون مین

لڑ گئی یار گلعذار سے آنکھ ۔۔۔ اب نہین چھپتی ہزار سے آنکھ

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤن تک چھائی ہوئی ۔۔۔ اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

بتاؤن نام اے دربان تجھے کیا ۔۔۔ یہ کہدے کوئی آیا ہے کہین سے

زاہد کو بندگی کا نتیجہ تو مل گیا ۔۔۔ گردن خمیدہ یاد الٰہی مین رہ گئی

وصل کا وعدہ اشارون مین کہین ہوتا ہے ۔۔۔ مین ترے سر کی قسم کچھ نہ مری جان سمجھا

ہاتھون سے جو بچے تری باتون سے مر گئے ۔۔۔ چٹکی مین تیر جو تھا وہ لب پر سخن ہوا

راز دل کوئی کہے لاکھون مین کیونکر اپنا ۔۔۔ داور حشر جدا چاہیے محشر اپنا

زبان سے کر لیا بھی وعدہ تو نے تو یقین کس کو ۔۔۔ نگاہین صاف کہتی ہین کہ دیکھو یون مکرتے ہین

رنج وہ رنج ہے جس مین نہ بتون کو بھولین ۔۔۔ عیش وہ عیش ہے جس مین نہ خدا یاد رہے

کیسا نظارہ کس کا اشارہ کہان کی بات ۔۔۔ سب کچھ ہے اور کچھ نہین نیچی نگاہ مین

بڑا مزا ہے جو محشر مین ہم کرین شکوہ ۔۔۔ وہ منتون سے کہین چپ رہو خدا کے لئے

سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی ۔۔۔ یہی کمبخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

دیکھنے والون سے انداز کہین چھپتے ہین ۔۔۔ ہم کو پردے مین نظر آتی ہے صورت اچھی

آپ محشر مین بنین قول کے سچے کیا خوب ۔۔۔ اُنگلیان اُٹھینگی وہ آئے مکرنے والے

اِس رنگ مین اِس سے بڑھ کر کوئی کیا کہیگا۔ داغ کی شاعری کا دائرہ چاہے وسیع نہ ہو لیکن جو اس کا انداز خاص ہے اس پر وہ حاوی ہے اور اپنے بیشۂ سخن کا شیر ہے۔ داغ کے مقابلہ مین یون تو بہت سے حضرات آستینین چڑھایا کیے لیکن اگر میدانِ سخن مین اس کا کوئی قابل وقعت مدعی تھا تو وہ لکھنو کا چراغ امیر احمد مینائی تھا۔ گو کہ امیر مرحوم کو داغ کے برابر شہرت نہین حاصل ہوئی تھی لیکن خاص خاص طبقون مین امیر کا نام ہمیشہ داغ کے مقابلے مین لیا گیا۔ اِس مین شک نہین کہ امیر کی مشکل پسند طبیعت نے اکثر ایسے جوہر دکھائے جس کی بدولت اِس پہلوانِ سخن کو زمانہ سے اُستادی کی سند ملی لیکن امیر کی طبیعت کو شاعری سے وہ ازلی مناسبت نہین ہے جو داغ کا حصّہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ داغ کا مذاقِ سخن اعلیٰ درجے کا نہین ہے لیکن اس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے مین کلام نہین۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی نگاہ بلند بینی کے عوض مائل بہ پستی ہو۔ اور قدرت کے وسیع میدان سے قطع نظر کرکے ایک خاص دائرے تک محدود ہو۔ مگر اس سے کوئی انکار نہین کرسکتا کہ یہ نگاہ شاعر کی نگاہ ہے۔ داغ کے سینے مین شاعری کی آگ روشن ہے۔ لہٰذا اس کا کلام گرمی تاثیر سے مالامال ہے۔ امیر کا کلام اِس کیفیت سے خالی ہے۔ اُن کی شاعری مصنوعی شاعری ہے۔ اُنھون نے شاعری کو مشق کے زور سے حاصل کیا ہے۔ وہ اصل جوہر شاعری جو قدرتی شاعر اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ امیر کی طبیعت کا حصّہ نہین۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کے اندازِ کلام مین جو پختگی ہے اُس کا نشان امیر کے طرزِ سخن مین نہین ملتا۔ داغ کا کلام شروع سے آخر تک اس کی طبیعت کے قدرتی رنگ مین ڈوبا ہوا ہے۔ اس کا شعر زبانِ حال سے پکار کر کہتا ہے کہ مین داغ کا شعر ہون۔ اِس کا مرتبہ

اعلیٰ درجے کے شعرا کے مقابل مین پست ہو۔ مگر وہ کسی کا مقلد نہین ہے وہ ایک خاص طرز کا مالک ہے جس کو ایک حد تک اسی کا ایجاد سمجھنا چاہیئے۔ آمیر کے ساتھ کسی طرز خاص کی خصوصیت نہین ہے۔ اِن کے دو دیوان ہین، اور دو رنگ کے۔ مراۃ الغیب مین آسیر و ناسخ کی شاعری کا اُترا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ اور صنمخانۂ عشق مین قدیمی متانت کو بالاے طاق رکھ کر داغ کی شوخی کا چربہ اُتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ دوسرے دیوان مین خود فرماتے ہین ؎

پچھلا کلام بھی ہے جو اس مین شریک امیر
دیوان مین اب کار رنگ کہین ہے کہین نہین

آمیر کے کلام کی دورنگی اِس بات کی شاہد ہے کہ ان کی طبیعت قدرتی طور پر شاعرانہ نہین واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ اصلی شاعر اپنی طبیعت کا رنگ نہین بدل سکتا۔ وہ اگر خواب مین بھی شعر کہیگا تو اُسی رنگ مین کہیگا جو قدرت نے اِس کی طبیعت مین ودیعت کیا ہے۔ بیشک ایک آدھ شعر کسی خاص موقع پر خاص حالت مین طبیعت کے قدرتی رنگ کے خلاف موزون ہو سکتا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی قدرتی شاعر کا کلام ایک ہی سانچے مین ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ بیشک جس کی شاعری کا دارمدار مصنوعی تکلفات پر ہے وہ اِن تکلفات کا رنگ جب چاہے بدل سکتا ہے۔ داغ نے اکثر معرکہ آرا طرحون پر غزلین کہی ہین۔ گو کہ استاتذہ قدیم کے مقابل مین فروغ نہین حاصل ہوا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے اِس مین ایک قسم کی جدت و تازگی پائی جاتی ہے۔ یہ نہین معلوم ہوتا کہ اِس نے اساتذہ کے خرمن سے خوشہ چینی کی ہے مثلاً گردن مین، آہن مین، ایک قدیمی طرح ہے۔ اِس طرح مین "گردن" کے قافیے کو نظم کیا ہے

مگر سب سے الگ۔

لاعلم	اسیری عشق کو منظور تھی میرے لڑکپن مین	پنہایا طوق منت کے بہانے میری گردن مین
آتش	یہ سودائے شہادت ہے ہمارے سر کو اے قاتل	تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو رگ ہے گردن مین
صبا	بہارِ وصل ہے ہم میکشی کرتے ہین گلشن مین	پڑے ہین ہار پھولون کے ہر اک شیشے کی گردن مین
داغ	مزا ہے وصل کی شب اس طرح ہون پیار کی باتین	ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن مین

اِسی طرح "یاد آیا" "فریاد آیا" ایک مشہور طرح ہے۔ اور "یاد آیا" نظم کرنے مین اساتذہ نے بڑی بڑی جدتین دکھائی تھین۔ داغ نے اس طرح مین بھی "یاد آیا" عجب تازگی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

آتش	رو دیا ابر بہاری جو برستے دیکھا	کرم پیرِ خرابات مجھے یاد آیا
صبا	چشم موسیٰ ہمہ تن بنگیا ہین حیرت سے	دیکھا اک بُت کا وہ عالم کہ خدا یاد آیا
قلق	سچ تو ہے حضرتِ انسان ہین بڑے خود مطلب	جب دیا رنج بتون نے تو خدا یاد آیا
داغ	دی مؤذن نے شبِ وصل اذان پچھلی رات	ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

امیر مرحوم کی طبیعت اِس جدت سے خالی تھی بلکہ اُنھون نے جب اساتذۂ قدیم کی مشہور غزلین غزلون پر کہی ہین تو اکثر اُنہین کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ اشعار ذیل تمثیلاً درج ہین۔

قلق	ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا	بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
امیر	اُٹھو گلے سے لگا لو مٹے گلہ دل کا	ذرا سی بات مین ہوتا ہے فیصلہ دل کا

قلق — وہ ظلم کرتے ہین ہم پر تو لوگ کہتے ہین — خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

امیر — دم آکے آنکھون مین اٹکا تو کچھ نہین کھٹکا — اٹک نہ جائے اکہی معاملہ دل کا

رند — پھر وہی کُنج قفس ہے وہی صیّاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

امیر — آخر اک روز خزان ہو کہ طلسمی ہی بہار — چار دن تک گلستان مین چہالے بُلبُل

اکثر امیر و داغ دونون نے اساتذہ قدیم کی مشہور غزلون پر غزلین کہی ہین ۔ مثلاً ناسخ کی اُس مشہور غزل پر جس کا مطلع ہے

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجران کا — طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریبان کا

دونون کی غزلین موجود ہین ۔ امیر نے تقریباً اسّی شعر کہے ہین اور تصنّع و آورد کا خوب حق ادا کیا ہے لیکن ایک شعر سے تازگی کا رنگ نہین عیان ہوتا ۔ بلکہ اکثر اشعار مین ناسخ کے اشعار کا پرتو صاف نظر آتا ہے ۔ مثلاً ناسخ کا شعر ہے ۔ ؎

یہ کس خورشید رو کو جذب دل نے آج کھینچا ہے — کہ نور صبح صادق ہے غبار اپنے بیابان کا

امیر کا شعر ہے :۔

ہوا ہے زلف مین اک عمر کے سودا یہ چمکا ہے — بیاض صبح جنت ہے سواد اپنے بیابان کا

داغ نے جو کچھ اس زمین مین کہا ہے اپنے رنگ مین کہا ہے اور جدّت کو ہاتھ سے نہین جانے دیا ہے ۔ چنانچہ ایک شعر اس کا مشہور بھی ہے ۔

کسی کی شرم آلود نگاہون مین یہ شوخی ہے — اِسے دیکھا اُسے دیکھا ادھر تاکا اُدھر جھانکا

اسی طرح اگر اور غزلون کا موازنہ کیا جائے تو ہمارے بیان کی تائید ہوتی جائیگی داغ کی

زبان مین گو کہ شاعرانہ صنّاعی کو دخل نہین ہے لیکن اسکی زبان روانی اور بے تکلفی سے ضرور معمور ہے
امیر کی زبان کا رنگ روانی اور بے تکلفی کے لحاظ سے داغ کے مقابل مین پھیکا ہے بلکہ اکثر اشعار
مین ایسے مغلق الفاظ بھر دیے ہین جو کانون کو بُرے معلوم ہوتے ہین۔ مثلاً ؎

پڑا خط بھی نہ میرے تن پہ میری سخت جانی سے
تفاخر تھا بہت قاتل کو اپنے زور بازو پر

شان پیدا ہوئی ہے عشق مین معشوقی کی
جوڑ ہے تیری نزاکت کا نحافت میری

لکھنا ہے مجھ کو دیدۂ گریان کا اپنے حال
جذّاب چاہیئے کوئی کاغذ کتاب پر

ہے چرخ پر یہ ایما ابروے ماہِ نو کا
کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکپن مین

تفوق رکھتی ہے سرگشتگی نخوت فروشی پر
کہین دامن سے ہوتا ہے مقام اونچا گریبان کا

داغ کی زبان سے ایسے الفاظ نظم ہونا دشوار ہین۔

بیشک شکوہ الفاظ اور متانت بیان کے لحاظ سے امیر کا پایہ داغ سے عالی ہے۔ اور جب
اِس شکوہ و متانت کے ساتھ امیر کے کلام پر شاعرانہ لطافت کا پرتو بھی پڑ جاتا ہے تو خاص لطف
پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کیا خوب کہا ہے ؎

جو چہرہ زعفرانی تھا وہی اب زعفرانی ہے
شکن چہرے پہ نقش پائے طاوسِ جوانی ہے

ستا نہ خاطرِ مظلوم کو ڈرا ے قاتل
پڑے نہ تیغ کبھی جیسے آہ پڑتی ہے

کبابِ سیخ ہین ہم کروٹین ہر سو بدلتے ہین
جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہین

کس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ مین
مشعل دکھائی برق تجلے نے راہ مین

داغ کی زبان اس شوکت بیان سے خالی ہے۔

آخر میں دونوں اُستادوں کا کلام ہم طرح غزلوں سے انتخاب کرکے لکھا جاتا ہے جس سے دونوں کی زبان اور مذاق سخن کا رنگ معلوم ہوتا ہے۔

داغ — عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو — اور پھر ڈھونڈھتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو
جب سے آنکھوں میں سمائی ہیں وہ کافر نظریں — رات دن اپنی نظر سے ہے توہم مجھ کو
دیکھتا پیر مغان حضرتِ واعظ تو نہیں — کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو

امیر — صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلّم مجھ کو — منہ کے سو ٹکڑے ہوئے آگئے جو تبسم مجھ کو
حشر میں وجد کناں قبر سے یارب اُٹھوں — نفخۂ صور ہو آوازِ ترنم مجھ کو
میں جو مر جاؤں تو اے پیر مغاں کہہ دینا — مغبچے کھینچ کے ڈال آئیں پسِ خُم مجھ کو

داغ — ساقیا اس میں کھنچی کیا کسی مجذوب کی روح — کوئی کھینچے لئے جاتا ہے سوئے خم مجھ کو

امیر — مجلسِ وعظ میں میں مست اگر جا بیٹھوں — مغبچے کھینچ کے لے جائیں سوئے خم مجھ کو

داغ — یار کا پاس نزاکت دلِ ناشاد رہے — نالہ رُکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے
رنج وہ رنج ہے جس میں نہ بتوں کو بھولیں — عیش وہ عیش ہے جس میں نہ خدا یاد رہے
عکس رخسار سے بن جائے مصور تصویر — دیکھ لے تجھ کو تو بہزاد نہ بہزاد رہے

امیر — زعفران زار میں بھی گر دلِ ناشاد رہے — یہی نالہ یہی گریہ، یہی فریاد رہے
قتل بے خنجر و شمشیر جو ہو مدنظر — اک ذرا آپ کو کھینچے ہوئے جلاد رہے
اُس کی تصویر میں اس درجہ نزاکت کا ہو حصر — لوچ باقی نہ قلم میں ترے بہزاد رہے

داغ — کوئی پہلو تو ہے کہہ کے پلٹ جانے کا — آنکھ سے وہ نہ رہے لب سے جو ارشاد رہے

امیر	آنکھیں مری جانے کو کہتی ہیں وہ لب جینے کو	کہیے یہ حکم رہے کہیے وہ ارشاد رہے
داغ	جب تک کسی کی چاہ نہ تھی کیا غرور تھا	میرا ہی دل بغل میں مرے رشکِ حور تھا
	واعظ ترے لحاظ سے ہم سُن کے پی گئے	کیا ناگوار ذکر شرابِ طہور تھا
	کیوں تو نے چشم لطف سے دیکھا غضب کیا	قربان اُس نگاہ کے جس میں غرور تھا
امیر	موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا	بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا
	آیا بڑا مزہ مجھے مجلس میں وعظ کی	واعظ تھا مست ذکر شرابِ طہور تھا
	نیچی رقیب سے نہ ہوئی آنکھ عمر بھر	جُھکتا میں کیا نظر میں تمہارا غرور تھا
داغ	کیوں نا اُمید عفو ہوں کیا یہ سُنے گا وہ	اس کا نہ بخشنا تری رحمت سے دُور تھا
امیر	میرے عمل تو قابل دوزخ ہی تھے، مگر	کرتا نہ وہ جو رحم تو رحمت سے دور تھا
داغ	ہم بوسہ لے کے اُن سے عجب چال کر گئے	یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا
امیر	لپٹا میں بوسہ لے کے تو بولے کہ دیکھیے	یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا
داغ	مہمان ہے وہ غیرتِ خورشید و قمر آج	دن آج ہے، رات آج ہے، شام آج سحر آج
	روکا ہی کیا رشک بٹھایا ہی کیا ضعف	بیتابی دل لے ہی گئی غیر کے گھر آج
	یہ شوق یہ ارمان یہ حسرت یہ تمنا	کیا ہو مرے قابو میں تم آجاؤ اگر آج
	جب تاب فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی.	کیا کیا لبِ خاموش پہ قربان ہے اثر آج
امیر	ہوتا ہی تو ہے فیصلۂ گردن و سر آج	وہ قتل پہ ہیں مرگ پہ باندھے ہوں کمر آج
	گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن	دوڑی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج

کس غیرتِ خورشید سے ہوتی ہی لڑائی — اوڑھے ہوے کیون شام کی کملی ہی سحر آج

مانگی ہی دُعا کس نے آلہی کہ کھُلا ہے — آغوشِ تمنا کی طرح بابِ اثر آج

داغ — شوخی سے ٹھہرتی نہین قاتل کی نظر آج — یہ برق بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

امیر — شوخی سے ہی بیچین وہ بجلی سی نظر آج — کہتی ہے حیا دیکھیے گرتی ہی کدھر آج

داغ — وعدے پہ مرے اُنکے قیامت کی ہی تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہی اِدھر آج

امیر — دیدار طلب تو بھی ہی اور مین بھی ہون اے اہد — لیکن ترے گھر کل ہی وہ دن اور مرے گھر آج

داغ — یون تو برسون نہ پلاؤن نہ پیون اے زاہد — توبہ کرتے ہی بدل جاتی ہی نیت میری

امیر — توبہ کی جان کو بجلی ہے چمک بجلی کی — بدلی آتے ہی بدل جاتی ہی نیت میری

داغ — کیا فلک ٹوٹ پڑا بعدِ فنا بھی مجھ پر — بیٹھی جاتی ہی دبی جاتی ہی تربت میری

امیر — شمع روتی ہی بہت اسکو اُٹھالے کوئی — بیٹھ جائے نہ کہین کچی ہے تربت میری

داغ — شریر آنکھ، نگہ بیقرار، چتون شوخ — تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

امیر — خدا کی شان جو شوخی سے آشنا ہی تھین — ترس رہی ہین وہی آنکھین اب حیا کے لئے

داغ — پوچھتا جاے مرقد سے گزرنے والے — کیا گذرتی ہی تری جان پہ مرنے والے

امیر — اک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہین مرنے والے — او غریبون کے مزارون پہ گذرنے والے

داغ — روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے — مے اُڑی جاتی ہی ساقی ترے پیمانے سے

امیر — دُخترِ رز اٹکی ہی ساقی کسی دیوانے سے — کہ پری بن کے اُڑی جاتی ہی پیمانے سے

داغ — زبان سے گر کیا بھی وعدہ تو نے تو یقین کس کو — نگاہین صاف کہتی ہین کہ دیکھو یون مکرتے ہین

امیر	تسلی خاک ہو وعدون سے اُنکے چتونین اُنکی	اشارون سے یہ کہتی ہین کہ دیکھو یون مکرتے ہین
داغ	کوئی کہدے کہ تمنے دل لیا پھر دیکھیے کیا کیا	اچٹتے ہین اکڑتے ہین پلٹتے ہین مکرتے ہین
امیر	مین کہتا ہون تمہین نے دل لیا میرا تو کہتے ہین	کہ ہان ہان لے لیا اچھا کیا ہم کب مکرتے ہین
داغ	وہ اور ہین جو پیتے ہین موسم کو دیکھکر	آتی رہی بہار مین توبہ شکن ہوا
امیر	واعظ کا تھا لحاظ تو فصلِ خزان تلک	لو آگئی بہار مین توبہ شکن ہوا
داغ	اِس روے بے نقاب کا جلوہ ہو انقلاب	نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی
امیر	پردہ چمک سے ہے اسکے رخِ بے حجاب کی	حاجت ہے کیا نقاب پر اسکو نقاب کی

ان اشعار سے دونون اُستادون کی طبیعت کے رنگ کے علاوہ اندازِ بیان کا فرق بھی معلوم ہوتا ہے۔ داغ کی زبان کی قدرتی شوخی اور بے تکلفی امیر کے مصنوعی تکلفات سے صاف الگ نظر آتی ہے۔ امیر نے اکثر داغ کی شوخی کی نقل کی ہے لیکن کامیاب نہین ہوئے ہین۔

داغ کا کلام عموماً شاعری کے ظاہری عیبون سے پاک ہے۔ اور اُن کا ضروریات شعر سے باخبر ہونا ثابت کرتا ہے لیکن حریفون نے اعتراضات کی فکر مین دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہین۔ عموماً اعتراضات زبان پر ہین کہ فلان محاورہ غلط نظم کیا ہے۔ یا فلان بندش غیر فصیح ہے۔ اس زمانے مین جب کہ کمال شاعری کا دارمدار محض صحت زبان پر سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت مین اگر داغ کے مٹانے کی فکر مین اس کی زبان پر اعتراض کئے گئے تو زیادہ تعجب نہین ہے لیکن قابل افسوس یہ بات ہے کہ ان اعتراضات کے پھیر مین داغ پر ایسے ذاتی حملے کئے گئے ہین

جن کا شاعری سے کوئی تعلق نہین اور جو بالکل مذاق سلیم کے معیار سے گرے ہوے ہین۔ مثلاً داغ کے نجیب الطرفین ہونے مین شک ظاہر کیا گیا ہے چاہے علم تاریخ کے لئے ایسے واقعات کی تشریح ضروری ہو۔لیکن ادبی مباحثون کا دامن ایسے گندہ مضامین سے آلودہ کرنا تہذیب کو خاک مین ملانا ہے۔

ہم کو داغ کی شاعری سے غرض ہے نہ کہ اُس کے اعزاز خاندانی سے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کُن جامی

کہ درین راہ فلان ابن فلان چیزی نیست

اِس رُسوائی کے لئے وہ حضرات بھی ایک حد تک ذمہ دار ہین جو داغ کے کمال کو فروغ بیجا دینا اپنا فخر سمجھتے ہین۔اِن حضرات نے محض یہی بات ثابت کرنے کی کوشش نہین کی ہے کہ داغ کا سا شاعر ہندوستان مین کم پیدا ہوا بلکہ داغ کی ذات کو تمام فضائل انسانی کا مجموعہ بتایا ہے۔ خاندانی اعزاز۔اخلاقی فضیلت۔حُسن صورت کے لحاظ سے داغ کی بہت کچھ مدحت سرائی کی ہے۔علاوہ اِس کے فنون سپہگری۔رمل۔جفر۔نجوم اور دیگر علوم عقلی و نقلی کی ہوا مین بھی داغ کو تحسین و ستایش کے پر لگا کر اُڑانا چاہا ہے۔اگر اسی پر اکتفا کیا جائے تب بھی غنیمت تھا لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اِس فانوسِ خیالی کے تیار کرنے کی فکر مین اکثر شعرائے لکھنؤ کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔بھلا لکھنؤ کے آتش مزاجون کو اس کی تاب کہان۔وہ پہلے ہی داغ کی گرم بازاری سے داغ کھائے ہوے بیٹھے تھے۔اِس اشتعال نے دبی ہوئی آگ کو اچھی طرح سے مشتعل کر دیا۔پھر جو اہل لکھنؤ کی جانب سے اعتراضات کی بوچھار ہوئی

ہے ۔ تو کوئی اُس کی انتہا ہی نہ تھی ۔ اور داغ کے مداحون نے ان اعتراضات کے جواب مین جو جو زبان درازیان کین وہ بھی اپنے رنگ مین جواب نہین رکھتین بس بعینہ یہی کیفیت تھی ؎

تو گوئی خروسانِ شاطر بہ جنگ
در اُفتادہ باہم بہ منقار و چنگ

غرضکہ ہر دو جانب سے خوب خوب زہر اُگلا گیا ۔ افسوس ہے تو اس قدر، کہ اس تلخ گفتاری سے سوائے اس کے کہ اُردو زبان کے شیرین چشمے کی لطافت مین فرق آتا گیا ۔ اور کچھ نہ حاصل ہوا ۔ اب ذرا ان مباحثون کا رنگ ملاحظہ ہو ۔

اکثر داغ کے شاگرد اپنے اُستاد کو اتّقا اور پرہیزگاری کا خلعت پہناتے ہین ۔ یعنی داغ کو باکمال شاعر ہی نہین تبلاتے ہین بلکہ عابد روشنضمیر بھی کہتے ہین ۔ حریف ایسے موقع پر کب چوکتے ہین وہ داغ اور حجاب[1] کے عشق کا پردہ اچھی طرح سے فاش کرتے ہین ۔ کل داستان رُسوائی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہین ۔ اور اکثر موقعون پر تصرف بھی کرتے جاتے ہین ۔ اور جہان تک سنا گیا ہے مرزا داغ ایک عاشق تن اور عیّاش طبع شخص تھے ۔ اُنھون نے حجاب کے عشق کی داستان "فریاد داغ" مین نظم کی ہے ۔ اور اپنی غزلون مین بھی کبھی کبھی اس قسم کے اشارے کئے ہین ۔ مثلاً کہتے ہین ۔ ؎

میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو ۔۔۔ ادر پردہ تم جلاؤ جلاؤن نہ مین تمہین

علاوہ اِس کے عیش پرستی کے اور بھی بہت سے سامان موجود تھے ۔ اور انہین

---

[1] حجاب ایک کلکتہ کی طوائف کا تخلص ہے ۔

بے اعتدالیوں کا نتیجہ تھا کہ داغ کا کمال بھی شباب کے ساتھ مٹ گیا مگر اکثر قدردانان داغ ان واقعات پر خاک ڈال کر زمانے بھر کو بیوقوف بنانا چاہتے ہین۔

اسی طرح داغ کے حُسن سخن کے قدردان ان کے حُسن صورت کو بھی اپنی تعریف سے جلا دیتے ہین اور کہتے ہین کہ وہ شباب مین خوش رو اور خوش رنگ جوان ہونگے معترض کہتے ہین کہ داغ کی بدصورتی ضرب المثل ہے اور سند مین یہ مصرع داغ کا پیش کرتے ہین۔ ع "جسے داغ کہتے ہین دوستو اسی روسیاہ کا نام ہے"۔

خیر خواہانِ داغ کہتے ہین کہ رامپور مین جو قدر داغ کی ہوئی وہ کسی کی نہ ہوئی۔ مخالفین اس دعوے کی اس طرح تردید کرتے ہین کہ رامپور مین داغ پچاس روپیہ ماہوار پر داروغہ اصطبل مقرر ہوئے تھے چنانچہ اس واقعے کی تائید مین کسی دریدہ دہن گستاخ شخص کا یہ شعر پیش کرتے ہین۔

آیا دلّی سے اک نیا مشکی
آتے ہی اصطبل مین داغ ہوا

مُریدانِ داغ کہتے ہین کہ رامپور کے مشاعرون مین جب داغ غزل پڑھ چکتے تھے تو آدھے لوگ اُٹھ جاتے تھے۔ اور مشاعرہ برخاست ہونے پر حضرت اسیر پیشتر سے آکر باہر آڑ مین کھڑے ہو جاتے تھے، اور یہ دیکھتے تھے کہ زبان پر کس کا شعر ہے۔ تو اکثر داغ ہی کا شعر زبان زد پاتے تھے۔ حریف اس کا جواب یہ دیتے ہین کہ "گلزار داغ" جو داغ کی شہرت کا باعث ہے اُن کی تصنیف ہی نہین ہے۔ اس کا بہترین حصہ حضرتِ ذوق کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے جو اُنھون نے صاحب عالم مرزا فصیح الملک بہادر کے واسطے کہا تھا۔ اور یہ بھی کہتے ہین کہ یہ دیوان امیر و آسیر کی اصلاح کی بدولت اس قدر مقبول ہے۔

داغ کی زبان پر بھی جو اعتراض کئے ہین۔ ان مین بھی عموماً اسی قدر مبالغہ سے کام لیا

گیا ہے۔ جس قدر مبالغہ مرحوم کے شاگردون نے اپنے اُستاد کے کلام کو فروغ دینے مین صرف کیا ہے۔ مثلاً داغ کا ایک مصرع ہے۔ ع

بیقراری ٹھہر گئی دل مین

اس پر اعتراض ہے کہ بیقراری کے لئے کہنا کہ "ٹھہر گئی" غلط ہے۔ کیونکہ بیقراری تو خود اُس کیفیت کا نام ہے جو ٹھہرنے کے برعکس ہے۔ مگر ایسا کہنا انصاف سے خالی ہے داغ نے اس موقع پر ٹھہرنا سکون کے معنون مین نہین استعمال کیا ہے بلکہ "جاگزین ہونے" کے معنون مین بیشک "ٹھہر گئی" کے ذو معنے ہونے سے شعر مین ایک قسم کی شاعرانہ لطافت پیدا ہو گئی ہے،

چنانچہ میر حسن نے بھی اسی طرز کا ایک شعر کہا ہے۔ ؎

لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب ٹھہرنے لگا جان مین اضطراب

یا داغ کا ایک شعر ہے۔ ؎

دل کا کانٹا زبان سے نکلا خارِ حسرت بیان سے نکلا

اعتراض ہے کہ "دل کا کانٹا" خلاف محاورہ ہے۔ اس اعتراض کا جواب داغ نے ایک خط مین کسی دوست کو لکھا ہے۔ وہ خط درج ذیل ہے۔

مورخہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ یوم یکشنبہ

جناب من سلمہ اللہ تعالیٰ۔

آپ کا کارڈ جواب مین آیا۔ حسادنا فہم سے بحث نہین۔ ان کا جواب خاموشی ہے اور آج تک جتنے اعتراضات میرے کلام پر ہوئے اُن کو مین نے ہیچ سمجھا۔ مگر آپ کے

اطمینان کے واسطے دو حرف لکھے دیتا ہون ۔ ؎

دل کا کانٹا زبان سے نکلا　　　خار حسرت بیان سے نکلا

یہ کانٹا دل کی پھانس کی جگہ نہین ہے بلکہ خار حسرت سے بنایا گیا ہے۔ اِس سے محاورے سے بحث نہین ہے ۔ زیادہ نیاز۔

فصیح الملک داغ دہلوی

ہمارے خیال مین جواب نہایت معقول ہے ۔ عموماً تمام اعتراض کا یہی رنگ ہے اِس موقع پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ اِن اعتراضات کی بحث مین دونون جانب سے وہی لوگ شریک تھے جن کی طبیعتین جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی تھین ۔ دہلی اور لکھنؤ کے منصف مزاج نقادان سخن کو ہنگامہ آرائیون سے کچھ مطلب نہ تھا ۔ چنانچہ منشی امیر احمد صاحب مینائی جو واقعی بزم سخن مین داغ کے رقیب تھے اِن اعتراضات کی نسبت خود داغ کو تحریر فرماتے ہین ۔

میرے پرانے یار غمگسار حضرتِ داغ سلامت

خدا روز بروز آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے ۔ ملک کو آپ کی قدر ہو، یا نہ ہو ۔ میری نظر مین تو جس قدر ہے آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا ۔ آپ حاسدین کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کرین ۔ ارباب کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہین ۔ محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے ۔ خدا حاسد ہونے سے محفوظ رکھے ۔

یاد آوری کا منت پذیر ۔ امیر فقیر

بیشک داغ کے کلام مین بمقتضائے بشریت اکثر عیوب ہین ۔ اُن سے داغ کے انصاف

پسند قدردانون کو بھی انکار نہ ہوگا۔

مثلاً داغ کے کلام مین اکثر محاورے ملین گے۔ جن کا نظم کرنا ریختۂ متین کی شان کے خلاف ہے۔ اگر ہزل یا ریختی مین ایسے محاورے نظم کئے جائین۔ تو مضائقہ نہین۔

ہاے کہنا وہ کسی بُت کا دمِ نظارہ ۔۔۔ آنکھ بھر کر ہمین دیکھے تو بس اندھا ہو جاے

کیون صرفۂ نگاہ مری جان ہو گیا ۔۔۔ اک تیر اور مین ترے قربان ہو گیا

کوئی خوشی تو ہوئی ہو کہ ہنستے آتے ہو ۔۔۔ گئے تھے کیا کسی مرنے پہ آشنا کے تم

اے شیخ جو بتائے مے عشق کو حرام ۔۔۔ ایسے کو دو لگائے بھگو کر شراب مین

حورون کا انتظار کرے کون حشر تک ۔۔۔ مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب مین

سرِ عدالتِ محشر جواب کیا دو گے ۔۔۔ جو داد خواہون نے تم پر کہین سوال دیا

بزم سے گلدستے سب اُٹھوا دیئے ۔۔۔ داغ کا نزلہ گلِ تر پر گرا

اکثر ایسے محاورے بھی داغ نے نظم کئے ہین جن کا اصلی مفہوم غت ربود ہو گیا۔ مثلاً

آنسو نہ پیے جائین گے اے ناصح نادان
ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہین جاتی

دوسرے مصرع کا جو مفہوم ہے وہ اِس محاورے سے ادا ہوتا ہے کہ "جیتی مکھی دیکھ کے نہین نگلی جاتی" ہیرے کی کنی تو جو کھاتا ہے وہ جان کر کھاتا ہے۔ مثلاً اکثر عورتین اپنی عصمت بچانے کے لئے اپنی ناک کی کیل سے ہیرے کی کنی نکال کر کھا لیتی ہین۔ ایک اور شعر ہے۔

کیا قبر ناتوان کی ترے بے نمود ہے ۔۔۔ افسوس فاتحہ ہے نہ جس کی درود ہے

دوسرے مصرعے مین جو محاورہ نظم کیا ہے وہ عالم بیکسی ظاہر کرنے کے لئے نہین استعمال کیا جاتا بلکہ غصّے کے عالم مین بولا جاتا ہے "مرگیا مردود نہ فاتحہ نہ درود"۔ داغ کی جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

الٰہی کیا کرین ضبط محبّت ہم تو مرتے ہین
کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے مین اُترتے ہین

اسی غزل کا ایک شعر ہے۔ ؎

کبھی یہ دل تماشا گاہ تھا عیش و مسرت کا
اب اس مین حسرت و یاس و تمنّا سیر کرتے ہین

چونکہ "حسرت و یاس و تمنّا" تانیث کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہین لہذا دوسرے مصرعے کا قافیہ بہ یائے معروف ہونا چاہیے۔ نہ کہ بہ یائے مجہول۔ اور اس صورت مین قافیہ غلط ہو جائیگا۔ یا ایک شعر ہے۔ ؎

کبھی تو صلح بھی ہو جائے زہد و مستی مین
الٰہی شیخ بھی میخوار ہون مغان کی طرح

اب "مغان کی طرح" مین "مغان" کی ترکیب خلاف فصاحت سمجھی جاتی ہے۔ آتش وغیرہ کے وقت مین ایسی ترکیب جائز تھی۔ چنانچہ آتش کا شعر ہے۔ ؎

رفتگان کا بھی خیال اے اہل عالم کیجیے
عالمِ ارواح سے صحبت کوئی دم کیجیے

سانس کو اہل دہلی اور اہل لکھنؤ نے مؤنث کہا ہے۔ ظفر کہتے ہین۔ ؎

ہمیشہ چُپ ہی رہے ہم کبھی جو ٹھنڈی سانس
بھری بھی ہم نے تو ہو کر کے تنگ جان سے بھری

یا نسیم لکھنوی کا شعر ہے۔ ؎

وان پھانس چُبھی ہے اس کو غم کی
یان سانس نہین ہے ایک دم کی

لیکن داغ نے سانس کو مذکر کہا ہے۔ ؎

اک ترے دم کے لئے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمار غم ہجر مین کیا رکھا ہے

غالباً حال مین دہلی کے اہل زبان سانس کو مذکر ہی بولتے ہین۔ کیونکہ محمد حسین آزاد نے بھی "آب حیات" مین سانس کو تذکیر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

حریف اکثر جزئیات پر بھی حرف رکھتے ہین۔ مثلاً داغ کا شعر ہے۔ ؎

اے مری جان جان سے بہتر
جان کیا ہے جہان سے بہتر

اعتراض ہے کہ جس وقت عام مثل ہے کہ "جان ہے تو جہان ہے" اُس وقت یہ کہنا کیا معنی کہ "جان کیا ہے جہان سے بہتر" یا ایک شعر ہے۔ ؎

دمبدم دل کو دلاسے شب غم دیتے ہین   جس کو تم دے نہین سکتے اُسے ہم دیتے ہین

اس شعر کے دوسرے مصرع مین ضم کا پہلو بتلایا جاتا ہے۔ ایک اور شعر ہے۔ ؎

انکار میکشی نے ہمین کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اُس نے خُم سے پلا دیا

حریف اِس شعر کا خوب مضحکہ اُڑاتے ہین اور کہتے ہین کہ معشوق کا ہے کو تھا کہ شیدی لندھور تھا اور عاشق کے پیٹ کا ظرف بھی مبالغے سے خالی نہین۔

یا داغ کا ایک شعر ہے۔ ؎

دلبر سے جُدا ہونا یا دل کا جُدا کرنا
اِس فکر مین بیٹھا ہون آخر مجھے کیا کرنا

اعتراض ہے کہ دوسرے مصرع مین "کیا کرنا چاہیے" کے بدلے محض "کیا کرنا" کہنا درست نہین۔ ایسا اختصار نا جائز ہے۔

مگر ایسی لغزشین اِس شہسوار سخن کی گرم جولانی کا وقار نہین گھٹا سکتین۔ آج ہندوستان کے لئے داغ باعث فخر تھا۔ چمنستان نظم شاداب تھا تو اس کے قدم سے' اور اُردو شاعری کا چراغ روشن تھا تو اس کے دم سے۔ یون تو اب بھی ایسے بزرگ موجود ہین جو پُرانے اُستادون کی آنکھین دیکھے ہوے ہین اور جنہون نے علم اور مشق کے زور سے اپنی شاعری کو مصنوعی تکلفات سے آراستہ کرنے مین ایک حد تک کمال حاصل کر لیا ہے۔ یا نئی روشنی پر چلنے والے بہت سے واعظان قافیہ پیما ہو گئے ہین جو اپنی نظم نثر نما کو شاعری کے نام سے تعبیر کرتے ہین۔ لیکن وہ شخص جس کو شاعری سے طبعی تعلق تھا اور جس کی زبان مین جادو تھا وہ داغ ہی تھا۔ اس کی شاعری

طبیعت کے زور سے تھی نہ کہ محض علم کے زور سے ۔ ؎

مُرغانِ خوش آہنگ اندر باغ سخن لیکن

نالیدنِ این بلبل شورے دگرے دارد

افسوس کہ یہ بلبل ہزار داستان خاموش ہوگیا !

اللہ اللہ اُردو شاعری نے بھی کیا کیا رنگ دیکھے ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ میر و سودا کے آغوشِ ناز مین اِس نے پرورش پائی ۔ ایک وہ زمانہ آیا جب کہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ نے اس کے شباب کی بہار دیکھی ۔ اب آخر وقت مین اِس کے مٹے ہوے حُسن کے چراغ سحری کی روشنی سے داغ نے آنکھین سیکین لیکن آج اس کے آخری عاشقِ زار کے ساتھ اِس شاعری کا بھی خاتمہ ہوگیا ۔ اب دیکھیے کون مسیحا نفس پیدا ہو ۔ جو اُردو شاعری کی مُردہ ہڈیون مین نئی روح پھونکے اور زمانے کے رنگ سے اس کے پیراہن کو رنگے ۔

لچھی رام سَرُور

(ماخوذ از "کشمیر درپن" ستمبر ۱۹۰۵ء)

جب کشمیر کے چمن زار مین آوارہ وطنی کی آندھی آئی - تو بہت سے ہواخواہانِ چمن اپنا مسکن چھوڑ کر بوے گل کی طرح نکل کھڑے ہوے - اِن پریشان حالون مین اکثر بلبل خوش لہجہ بھی شامل تھے جن کے کانون مین نغمۂ شیراز سمایا ہُوا تھا - اور جن کی زبان قند پارسی کی شیرینی سے کامیاب تھی - اِن نواسنجانِ کشمیر کو عموماً آب و دانہ کی کشش سرزمین دہلی کی طرف کھینچ لیگئی اور وہین اُن کی زمزمہ پردازیون کی ہوا بھی بندھی - مثلاً پنڈت داتا رام برہمن کی شاعری نے مرزا جوان بخت بہادر اور مرزا خرم بخت بہادر کے دامانِ دولت کے سائے مین فروغ پایا - یا پنڈت گوبند رام زیرک کو شاہ عالم کی رفاقت کا فخر عمر بھر حاصل رہا - اسی طرح صیرفی و ضمیر کی شاعری نے دہلی کی خاک پر نشو و نما پائی - اور یہ بزرگ دہلی ہی کے خاک کے پیوند ہوے - لیکن خاک کشمیر کا یہ ذرہ جس کا نام نامی زیب عنوان ہے لکھنؤ کی سرزمین پر آفتاب ہو کر چمکا -

آج لچھی رام سَرُور کے خاندانی حالات تفصیل کے ساتھ لکھنا ممکن نہین کیونکہ اُن کے خاندان کا کوئی یادگار باقی نہین اور اگر کوئی ہوتا بھی تب بھی اس سے زیادہ مدد ملنے کی اُمید نہ تھی - کیونکہ

بزرگون کے سوانحی حالات یادگار کے طور پر پا تبرکاً قلبند کر کے رکھنا ایشیائی تہذیب کا حصہ نہین۔ اِس حالت مین لچھمی رام سرورؔ کے حسب و نسب کا حال لکھنا بھولے ہوئے خواب کا یاد کرنا ہے۔ علاوہ برین جو بزرگ اس وقت ہمارے سر پر سلامت ہین، اور جو اس گذرگاہ ہستی کی ستّر اسّی منزلین طے کر چکے ہین وہ یہی کہتے ہین کہ جب انہون نے آنکھین کھولین تو لچھمی رام سرورؔ کا اِس دارِ فانی سے کوچ ہو چکا تھا۔ ان کہن سال بزرگون نے اپنے بزرگون سے جو کچھ لچھمی رام سرورؔ کے متعلق سُنا ہے وہ تبرکاً مجھ تک بھی پہونچا ہے یہی وہ غیر مسلسل حالات کاغذ و قلم کے سپرد کئے دیتا ہون۔

تقریباً ڈیڑھ سو برس کا عرصہ ہوا کہ شجاع الدولہ کے آخری عہد مین یا آصف الدولہ کے ابتدائی عہد مین پنڈت لچھمی رام سرورؔ کشمیر سے صوبہ اودھ مین آئے اور سعادت علی خان کے دَورانِ حکومت مین انہون نے وفات پائی حضرت سرورؔ کے سلسلۂ معاش کی نسبت صرف اِس قدر معلوم ہو سکا کہ وہ کچھ عرصے تک قندھاریون کے رسالے مین وکیل رہے۔ پنڈت نرہ ام تنخواہ اسی زمانے مین اِس رسالے کے میر منشی تھے۔ اور ان چند سر برآوردہ اشخاص مین تھے جن کا وقار نواب کے دربار مین قائم تھا حضرت سرورؔ انہین کے ماتحت تھے۔ عبدالرحمن خان کے لڑکے حبیب اللہ خان قندھاریون کے رسالے کے افسر تھے اور ایک خوشرو اور خوش رنگ جوان تھے۔ سرورؔ کی شاعرانہ طبیعت کا لوازمہ حُسن پرستی بھی تھی چنانچہ حبیب اللہ خان سے عشق تھا اور انہون نے اکثر اپنی غزلون مین اِس خوبصورت جوان کے حُسن کی تعریف کی ہے۔ دو شعر تمثیلاً درج ذیل ہین۔

کرد از حبیب حور بہ شکلِ بشر عیان | سرو نگر تو صنع خدائے جلیل را

دادہ سرور بہ یوسف نسبتِ روئے حبیب | ہان غلط کردی کہ حسنش را صفائی دیگر است

کچھ زمانہ چھی رام سرور کا اندور مین بھی گذرا ہے اس کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک زمانے مین مفسدون کی فتنہ پردازی کے سبب پنڈت زندہ رام نخواہ سے اور نواب سے بگڑ گئی۔ پنڈت زندہ رام نے اودھ کی سرکار کو سلام کہا اور اندور کی راہ لی۔ چھی رام سرور نے بھی اپنے آقا کی رفاقت مین اُسی سرزمین کا رُخ کیا۔ مہاراجہ ہولکر یعنی والیِ اندور ان لوگون سے بہت عزت سے پیش آئے۔ اور ان کے اعزاز اور پایہ کے مطابق اپنے لشکر مین عہدہ عطا فرمایا۔ لیکن اندور کے دربار کے پُرانے امرا نے ان غریب الوطنون کی بیخ کنی شروع کی اور مہاراجہ کو ان کی طرف سے بدظن کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مہاراجہ ان لوگون سے کم التفاتی سے پیش آنے لگے۔ یہ ناقدری پنڈت زندہ رام کو بہت ناگوار گذری اور اُنہون نے پھر اپنے قدیمی وطن کی راہ لی۔ چھی رام سرور کے دل مین بھی جو آتشِ غضب اِن معاملات سے جوش مین آئی وہ زبان سے گرمیِ سخن بن کر ظاہر ہوئی۔ اُنہون نے مہاراجہ ہلکر کی ایک ہجو اندور سے چلتے چلتے کہہ دی۔ مہاراجہ ہلکر کانے تھے۔ اور دوسری آنکھ کو بھی نور کا کافی حصّہ نہ ملا تھا۔ چھی رام سرور نے ہجو مین اِس عیب کا بھی اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہین ؎

یاران ہوائے سیم و زر از سر بدر کنید | گیرید راہ خانہ و ترکِ سفر کنید

زین کور چشم چشم بہی داشتن خطاست | قطع نظر ز ہلکر کوتہ نظر کنید

گو میدہزار وقت . . . . . . نہ می دہد | از مکر و چاپلوسی ہلکر حذر کنید

ماندن کنون بہ شکر ہلاکِ صلاح نیست　　　اصلاح کار خود بہ صلاحِ دگر کنید

سرور پیادہ می رود و ہمرہان سوار
اے والیِ باجیبؔ[1] ز حالش خبر کنید

پچھی رام سرورؔ سے ایک دیوان یادگار ہے جس کے قلمی نسخے شاذ و نادر اکثر بزرگون کے پاس موجود ہین۔ ایک نسخہ اس دیوان کا بخت رسا کی مدد سے میرے پاس بھی آگیا۔[2] اِس مین تقریبًا تین سو غزلین ردیف وار درج ہین۔ دیوان کے آخر مین دو ایک ترجیع بند ہین۔ ایک مثنوی ہے اور ایک قصیدہ ہے۔ قصیدہ اور مثنوی حبیب اللہ خان کی شان مین ہے کلام کا رنگ دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نوا سنج کشمیر نے بلبلِ شیراز کا طرز فریاد اُڑایا ہے۔ اور عاشقانہ اور رندانہ مضامین فصیح اور پاکیزہ زبان مین نظم کئے ہین۔ صفائی بندش سے قدرتی روانی کا پتہ ملتا ہے۔ دقیق مضامین اور بلیغ ترکیبون سے عام طور سے پرہیز کیا ہے۔ چونکہ بڑا حصہ مصیبت ہی مین گذرا لہٰذا کلام مین ایک قسم کا درد بھی ہے۔ چند اشعار تمثیلاً درج ہین۔

باچشم کم مبین من ظاہر ذلیل را　　　بحث از غلاف کہنہ چہ تیغ اصیل را

ناصح خموش و گوش خراشم مشو کہ نیست　　　رہ در حریم خلوتِ من قال و قیل را

مفروش جلوۂ اہر خشک از ارم برو　　　عاشق بہ چشم تر نخرد سلسبیل را

---

[1] یعنی حبیب اللہ خان ۱۲ [2] میرے عنایت فرما پنڈت شمبر ناتھ صاحب مشران سے مجھکو یہ دیوان ملا مشکور ہون ۱۲

همچو رندان نه بود باده کشی پیشهٔ ما   بادهٔ ما همه خون دل و دل شیشهٔ ما
نیست خورشید که بر سقف فلک می تابد   جسته از سنگ شرارے ز دم تیشهٔ ما
بسکه در یاد تو سرمست انا الحق شده ایم   سر منصور زند سر ز رگ و ریشهٔ ما
وه چه خوش گلبن رنگین گلستان غمیم   آب از خون جگر یافته هر ریشهٔ ما
وصف ذات تو حبیبا چه بگوید سرور   نیست در بزم صفاتت ره اندیشهٔ ما

نے مقیم مسجد و نے ساکن بتخانه ایم   گشته ایم از کفر و دین آزاد و ما دیوانه ایم
زاهدا ما را چه تکلیف از صوم و نماز   بندهٔ پیر مغان و خادم میخانه ایم
ساختن با سوختن در عشق خوبان کار ماست   جا بگرد هر جا که شمع هست ما پروانه ایم

در کنج غم افتادم و دمساز کسے نیست   دردا که به فریادم و فریاد رسے نیست
در گلشن پر خار و خس و هر ند یدم   یک مرغ خوش الحان که اسیر قفسے نیست

بشور آمد جنون در سینهٔ من ناله شد پیدا   گره شد نالهٔ من بر لب و تبخاله شد پیدا
چه رنگین آتشے زد در دلم عشقش که در گلشن   شرارے جست از داغم چراغ لاله شد پیدا

رخصت آه دهم گر دل شیدائی را   آتشے در زدم این گنبد مینائی را

پردهٔ برداشت از رخ عشق تو رسوائی را   خیرباد است ز من صبر و شکیبائی را

مژده ای دل که ترا هم نفسی می آید   عندلیب چمن در قفسی می آید
هر نفس قافلهٔ عمر روان می گذرد   گوش کن گوش که بانگ جرسی می آید

تجلیست از تو خانهٔ ما   رشک طور است آشیانهٔ ما
خواب در دیده سوخت ای سرو   آه از گرمی فسانهٔ ما

بهار آمد بده ساقی شراب ارغوانی را   که تا زین آب سازم سبز نخل زندگانی را

گر حواس آشفته ایم ای همنفس یا مرنج   در غم گیسوی پریشانی پریشانیم ما
هر دم از افغان آه آتشین و چشم تر   رعد نالان برق سوزان ابر گریانیم ما

داغهای که بود در دل سودازده ام   لاله زاریست که در دامن صحرای است

بی تو جان بر لبم و ذوق طپیدن باقیست   یک نفس فرصت صد ناله کشیدن باقیست

گہہ کرشمہ گہہ نگہہ گہہ غمزہ گاہے ناز کرد　　سحر یا در کار دل آن چشم جادو ساز کرد

مست شد تا ہم تا چو رخ او شد و بیہوش شد　　گاہ بیدار تا نسیم ابرو شود بیہوش شد

بوعدہ چشم تو سازم چو ابتدائے غزل　　غزال سر زند از خامہ ام بجائے غزل

مطرب نوازشی کن و ساز طرب بساز　　بنواز نے کہ نغمۂ مستانہ بر کشیم

یہی رنگ کلام کا شروع سے آخر تک ہے۔ زبان پر قدرت کا یہ عالم ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں بھی اس شہسوار سخن کے قدم نہیں ڈگمگائے ہیں اور فصاحت کی شاہراہ نہیں چھوٹنے پائی ہے چند شعر اس رنگ کے بھی ملاحظہ ہوں۔

اے دل چنین بخون چو طپیدی چہ شد ترا　　از تیغ غمزۂ کہ شہیدی چہ شد ترا
صد فصل نو بہار گذشت و درین چمن　　بلبل تو نالۂ نہ کشیدی چہ شد ترا

یارب ز دستم تباہ در چہ گنہگاری دگر　　بسکہ دارم شرمساری گریہ می آید مرا
مزرع خشک امیدم را بسے ہم تر نہ کرد　　از تو اے ابر بہاری گریہ می آید مرا

فصل گل ست اے چمن آرائے میکدہ　　بگذار زیر سایۂ ہر تاک شیشہ را

افتادہ است بر سرِ خاک از فراقِ مے — بردار ساقیا ز سرِ خاک شیشہ را
از فیضِ رنگِ بادۂ رنگین برنگِ گل — بر سنگ گرفتہ نبود باک شیشہ را

شبے کسے بدرِ او طپید و ہیچ نہ گفت — چہ نالہا کہ ز دل برکشید و ہیچ نہ گفت
ہلاکِ شیوۂ آن سرکشم کہ ز استغنا — مرا طپان بسرِ راہ دید و ہیچ نہ گفت
زد از دہانِ تو حرفے بہ غنچہ بادِ صبا — ز شرم سر بہ گریبان کشید و ہیچ نہ گفت

ز بادِ آن زلفِ عنبر بار گاہے راست گاہے کج — چہ خوش زیباست بر رخسار گاہے راست گاہے کج
گہے از قہر و گہ از خشمِ چشمِ فتنہ پردازش — نگاہے میکند ہر بار گاہے راست گاہے کج

حافظ کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں اور بعض موقعوں پر خوب طبیعت داری دکھائی ہے۔ حافظ کی اُس مشہور غزل پر بھی غزل کہی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا — کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اس زمین میں اکثر فارسی شعرا نے زور مارے ہیں۔ مگر میرے خیال میں حافظ کے بعد جیسا مطلع سرور نے کہا ہے اِس پایہ کا شعر اس خاص زمین میں دوسروں کے یہاں نہ ملیگا۔ سرور کا مطلع ہے ؎

بہ تحریر آورم گر نامۂ بیتابی دلہا — نویسد خامہ جائے بسم اللہ بسملہا

ظہیر فاریابی، ناصر علی اور ہلالی نے اِس زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ ذیل میں حافظ کے شعر بھی

تبرکاً لکھتا ہون اور ان شعرا کے بھی سب کا رنگ سخن ملاحظہ ہو۔

حافظ　الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا　　که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

سرور　به تحریر آورم گر نامهٔ بیتابی دلہا　　نویسد خامه جاے مد بسم اللہ بسملہا

ظہیر　من از باد صبا یا ورندارم حل مشکلہا　　چه حاصل عقده از زلفت کشود و بست دلہا

ہلالی　ز آب چشم من گل شد براه عشق منزلہا　　ندانم تا چه گلہا بشگفد آخر ازین گلہا

ناصر علی　محبت جاده دارد و نہان در خلوت دلہا　　چو تار سبحه گم گردید این ره زیر منزلہا

حافظ　به مے سجاده رنگین کن گرت پیر مغان گوید　　که سالک بے خبر نبود ز راه و رسم منزلہا

سرور　ز خود شو بیخبر گر وصل جانان آرزو داری　　بود از خود بریدن اندرین ره قطع منزلہا

حافظ　شب تاریک و بیم موج و گردابے چنین حائل　　کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

ظہیر　ظہیر از موج این دریاے بے پایان نمی‌اندیشد　　خبر از شے بحر نزدیک بیداران ساحلہا

ہلالی　ز طوفان سرشک خود بگردابے گرفتارم　　که عمر نوح گر یابم نه بینم روے ساحلہا

ناصر علی　گذشتم از ره دریاے دل زین کہنه منزلہا　　دو عالم خشک بر جا ماند از حسرت چو ساحلہا

سرور　زند پہلو به طوفان بلا ہر موج اشک من　　ز جوش گریه‌ام رشک دل دریاست ساحلہا

حافظ　ہمه کارم به خود کامی به بدنامی کشید آخر　　نہان کے ماند آن رازے کزو سازند محفلہا

ناصر علی - بہ نشاط دولت گردش چشم تو می سازد | بہ یک پیمانہ رنگین کردہ یک شہر محفلہا
سرور - اگر حور و پری پروانہ اش گردد سزد امشب | قبا در آتش ز شمع روئے او دو جان محفلہا
ہلالی - چون آن مہ پارا غیار است گرد او مگر وا دل | چرا پروانہ باید شد برائے شمع محفلہا
ظہیر - برائے دیگرانم زندہ گر بے بہرہ از خویشم | دہد نور ارچہ تاریک است پائے شمع محفلہا

حافظ - حضوری گر ہمی خواہی ازو غایب مشو حافظ | متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا
ہلالی - ہلالی چون حریف بزم رندان شد بخوان جہرا | الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
سرور - بوجد آورد امشب نغمۂ شیراز سرور را | الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
ناصر علی - علی امشب ز شیراز در جام و سبو دارد | الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

اسی طرح کچھی رام سرور کے دیوان مین اور غزلین بھی حافظ کی طرحون پر ملین گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور نے اپنا جام سخن حافظ کی شاعری کے شیرین چشمے سے بھرا ہے۔ دیوان کے آخر مین ایک طوائف[1] کی تاریخ وفات بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کو تاریخ گوئی مین بھی کس قدر کمال حاصل تھا۔ تاریخ مذکور کا آخری شعر یہ ہے۔

مرد گنا و گشت سبے سرو پا | نغمہ[2] و رقص و چنگ و طبلہ و عود

---

[1] نام طوائف ۱۲ [2] اگر نغمہ۔ رقص۔ چنگ۔ طبلہ اور عود کے اولین اور آخری حروف نکال ڈالے جائین اور باقی ماندہ الفاظ کے عدد جوڑے جائین تو مادہ تاریخ نکل آتا ہے۔ ۱۲

ممکن ہے کہ اس زمانے کے تہذیب یافتہ نوجوان یہ تاریخ دیکھ کر زیرِ لب مسکرائیں لیکن اُن کو یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ ہر زمانے کی تہذیب کا رنگ جداگانہ ہُوا کرتا ہے۔ اس زمانے میں گو کہ کسی باکمال شاعر کے لیئے ایک طوائف کی تاریخ کہنا ناموزوں سمجھا جائے مگر کچھی رام سرور کے زمانے میں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ نیرنگ روزگار اسی کا نام ہے۔ آج جن باتوں کو ہم آئینِ شرافت میں داخل سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ سو برس بعد انہیں باتوں پر آئندہ نسلیں حرف گیریں کسی نے سچ کہا ہے۔ ع

چنان نماند و چنین نیز ہم نخواہد ماند

جب حبیب اللہ خان نے اودھ سے دکن کا رُخ کیا تو سرور کو اپنے حبیب کی جُدائی بہت شاق گذری۔ چنانچہ اسی مضمون کی ایک غزل دردِ فراق کے لہجے میں کہی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ ؎

دلا عزمِ سفر اے راحتِ جان داشتی رفتی — بہ کنجِ غم مرا در خون طپیدن بگذاشتی رفتی
نہ کردی آگہ از رفتن مرا نازم تغافل را — چرا اے آشنا بیگانہ ام انگاشتی رفتی
دل از حبِّ وطن برداشتی اے خسروِ خوبان — علم مردانہ در ملکِ دکن افراشتی رفتی
چو رفتی رفت صبر و طاقت و ہوش و قرارِ من — ستم ہا بر سرم کردی نہ کردی آشتی رفتی
حبیبا[1] از تو امیدِ وفا ہا بود سرور را — روا بر وے چنین جور و جفا چون داشتی رفتی

مفلسی اکثر اہلِ جوہر کی رفیق رہی ہے۔ چنانچہ کچھی رام سرور کا دامن بھی کبھی دولت

---

[1] حبیب اللہ خان سے مراد ہے ۱۲

جو مثنوی حبیب اللہ خان کی شان مین کہی ہے اُس مین اپنی بیکسی کا بیان عجب درد آمیز لہجے مین کیا ہے۔ حبیب اللہ خان کو مخاطب فرما کر کہتے ہین۔ ؎

توئی جوہر شناس گوہر من — ببین بر من بہ بین بر جوہر من
بہ صورت در نظر ہا گر حقیرم — ولے در کشور معنی امیرم
ولے از دست غم گردیدہ ویران — درین ویرانہ گنج ہست پنہان
چہ گنج وہ چہ گنجے پُر ز گوہر — چہ گوہر ہر یکے تابندہ اختر
منم آن طوطی شیرین ترانہ — کہ ہستم در سخن دانی فسانہ
ولے از گردش ایام اے واے — ز جور بخت نا فرجام اے واے
گرفتار قفس گشتم بزاغے — ازین غم بر دل من ہست داغے
خداوندا ز دست تنگدستی — ز پا افتادہ ام بر خاک پستی
بسے در ماندہ ام سازم چہ تدبیر — نمایم حال من پیش کہ تقریر
نہ غمخوارے مرا نے غمگسارے ست — نہ دمسازے نہ ہمرازے نہ یارے ست
چہ سازم حال خود را باکہ گویم — علاج درد دل را از چہ جویم

لیکن باوجود اس مفلسی اور تنگدستی کے زمانے نے لچھی رام سرور کے شاعرانہ کمال کی ضرور قدر کی۔ ایک مرتبہ لکھنؤ مین مشاعرہ قرار پایا۔ اُس وقت کے باکمال فارسی شعرا اس مین جمع تھے۔ لچھی رام سرور کو بھی شوق سخن اس بزم سخن کی طرف کھینچ لے گیا۔ اس وقت کشمیر سے آئے ہوے ان کو کم زمانہ گذرا تھا اور وطن کی محبت قدیمی پوشاک کی شکل مین دامنگیر تھی۔ ایک

پیراہن زیب تن تھا جس پر مفلسی کی گرد جمی ہوئی تھی۔ کمر میں پٹکا بندھا تھا۔ سر پر دستار رکھی ہوئی تھی۔ اور ایک لوئی اوڑھے ہوے تھے۔ اِس ہیئت سے یہ ایک گوشے میں پائین فرش جا کر بیٹھ گئے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شمع پر شمع پانی ہوتی چلی گئی۔ مگر ان کی طرف کسی نے رُخ بھی نہ کیا۔ اتفاقاً ایک ایسے صاحب کی نظر ان پر بھی پڑی جو اِن کے جاننے والوں میں تھے اور ان کے کمال سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحریک سے اِن سے بھی غزل پڑھنے کی فرمایش کی گئی اور شمع ان کے سامنے بھی آئی۔ بیشتر لوگوں نے سمجھا کہ یہ آوارہ وطن بدہیئت مسافر کیا پڑھیگا لیکن جب اُنھوں نے اپنی غزل پڑھی تو تمام مشاعرہ تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اُٹھا اور اہل مشاعرہ نے اُن کی بہت عزت و توقیر کی۔ رات آخر ہوئی۔ مشاعرہ ختم ہوا اور صبح کی روشنی کے ساتھ لچھمی رام سرور کی شہرت قدر دانانِ سخن میں پھیل گئی[1]۔ پھر لکھنؤ میں ایک اور مشاعرہ ہوا جس میں یہ طرح تھی۔ ع

همسر مگر بآن قدِ دلجو شود نه شد

مرزا قتیل بھی اِس مشاعرے میں شریک تھے۔ جب لچھمی رام سرور نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا۔ ؎

مه شد تمام تا چو رخِ او شود نه شد

کاهید یاز تا خمِ ابرو شود نه شد

تو مرزا قتیل نے اپنی غزل چاک کر ڈالی اور کہا کہ اس مطلع کے بعد غزل پڑھنا بیکار ہے[2]۔ اللہ اللہ

---

[1] پنڈت لچھمی نراین منشی ایک پیر سال اور سخن سنج بزرگ تھے اُن سے یہ واقعہ سُنا گیا تھا۔ اُن کو وہ غزل بھی یاد تھی جو لچھمی رام سرور نے اس مشاعرے میں پڑھی تھی مگر افسوس ہے کہ لچھمی نراین صاحب کا تو انتقال ہو گیا اور جن صاحب نے یہ واقعہ اُن سے سُنا تھا اور مجھ سے بیان کیا اُن کو اس غزل کا ایک مصرع بھی نہ یاد رہا ورنہ دیوان میں غزل تلاش کر لی جاتی۔

[2] یہ واقعہ پنڈت اجودھیا ناتھ صاحب تنخواہ سے معلوم ہوا۔ اُنھوں نے پنڈت جوالا ناتھ صاحب کچھو سے سنا تھا۔

کیا عالی ظرف لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ مذہبی تعصب کی تاریکی نے ان کے دلون کو سیہ خانہ
نہین بنا دیا تھا۔ وہ صاحب جوہر اہل ہنر کی قدردانی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ ایک
آج کل کا زمانہ ہے کہ تنگ خیالی اور کم نظری سے کام لینا اور نکتہ چینی کرنا مذہب مین
داخل سمجھا جاتا ہے۔ کسی ایسے صاحبِ جوہر کی دستگیری کرنا جو کہ گمنامی کے قعر مین پڑا
ہوا ہے تو درکنار محض جہل و تعصّب کی بنیاد پر ان صاحب کمالون کے جوہر مٹانے
کی کوشش کی جاتی ہے جن کے سر پر زمانہ قبول عام کا تاج رکھ چکا ہے۔ اور جن کی شہرت
کی عالی شان عمارت سیکڑون مخالفت کے طوفان جھیلنے کے بعد زبان حال سے پکار
پکار کر کہ رہی ہے کہ میری دیوارون سے اب سر ٹکرانا فضول ہے۔ مگر جن کے سرون مین
تعصّب کا سودا سمایا ہوا ہے وہ ٹکرین لڑنے سے باز نہین آتے اور اس فکر مین رہتے
ہین کہ شاید کوئی خشتِ کہن جنبش مین آجائے۔

دیباچہ گلزار نسیم

(ماخوذ از گلزار نسیم معہ انتخاب دیوان نسیم، مرتبہ پنڈت برج نراین چکبست)

پنڈت دیا شنکر صاحب کول متخلص بہ نسیم سنہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنؤ آپ کا وطن تھا۔ بزرگوں سے سنا جاتا ہے کہ وجاہت جس کے لیے عموماً اہل خطہ مشہور ہیں آپ کا حصہ نہ تھی۔ پستہ قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ سلسلۂ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ جیسا کہ اُس زمانے کا دستور تھا۔ اُردو، فارسی کی تعلیم عالمِ صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اُردو و فارسی کا کلام نظر سے گزرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ غرضکہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا خاصہ اچھا مذاق پیدا کر لیا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی گرمیِ سخن اور آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ انکی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق رہا لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل میں نہ نکل سکا جدتِ طبع نے کہا ؎

بقدرِ شوق نہیں اپنے تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیان کے لئے

مگر وسعت کہاں ملے۔ اُردو شاعری کی کائنات کیا۔ غزل، قصیدہ، رباعی یا مثنوی۔ میر حسن کی

مثنوی سحر البیان کا اُس زمانے مین ہر طرف چرچا تھا۔ اصنافِ سخن مین مثنوی کا رنگ ایسا پسند آیا کہ خود بھی اِس کوچے مین قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مناسبت طبع نے آمین کہا۔ غرضکہ گل بکاؤلی کا قصہ جو کہ نثر مین تھا اُس کو نظم کے سانچے مین ڈھالا پچیس برس کی عمر مین یہ مثنوی طیار ہوئی۔ چونکہ گلہاے مضامین سے پُر تھی لہذا نام "گلزار نسیم" رکھا۔ واقعی اِس گلزار کا کیا کہنا تھا۔ ع

سینچا تھا جس کو خونِ جگر سے وہ باغ تھا

لیکن جس وقت یہ مثنوی طیار ہوئی اس کا حجم بہت زیادہ تھا جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو اُنھون نے کہا ارے بھئی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھیگا۔ یا تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا مین اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤنگا۔ اُستاد کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی نظر ثانی کی۔ جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے۔ بلکہ جو مطلب چار شعرون مین ادا ہوتا تھا اُس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر مین ادا کیا۔ اس صورت پر گلزار نسیم کو خس وخاشاک سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفرین کہی اور اصلاح کا قلم اُٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحین نسیم نے نہ مانین اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا ؎

قلیان پہ مشکبو دھوان دھار   بیڑے چکھے پان کے مزیدار

آتش نے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح بدلنا چاہا۔ ع بیڑے چکھے بہت مزیدار [1] لیکن نسیم کو یہ اصلاح پسند نہ آئی اور مصرع کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی۔ غرضکہ آتش کی نظر ثانی کے بعد یہ مثنوی

---

[1] یہ واقعہ میر رضا حسین صاحب شہا کی زبانی مجھکو معلوم ہوا۔ یہ بزرگ آتش کے شاگرد رشید میر وزیر علی صبا کے داماد اور شاگرد تھے اُن معدودے چند بزرگون مین سے تھے جنہون نے پُرانے اُستادون کی آنکھین دیکھی تھین اور جنکی وضع کے بزرگون سے ابتک لکھنؤ مین اُردو شاعری کا نام زندہ ہے۔ تین چار سال کا عرصہ ہوا کہ قضا کی۔ ع کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے ؛

ایک مشاعرے مین پڑھی گئی جس مین کہ لکھنؤ کے تمام سرآوردہ شعرا جمع تھے - بعد ازان طبع ہوئی شایع ہوتے ہی ہاتھون ہاتھ بک گئی - زمانے نے پورے طور سے قدر کی - ابھی تک مثنوی کے رنگ مین یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا - اب گلزار نسیم کے بھی جابجا چرچے ہونے لگے - جواہر سخن کے پرکھنے والے سمجھ گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہین نسیم کو بھی شہرتِ عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقاے دوام کے دربار مین میر حسن کے برابر کرسی ملی - اور واقعی حق یہ ہے کہ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اُس وقت تک گلزار نسیم کی شادابی مین فرق نہین آسکتا - مگر افسوس کہ نسیم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی - گلزار نسیم کو طبع ہوے ایک برس گذرا تھا کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی - ہیضہ کی بیماری نے دفعتًا خاتمہ کر دیا - اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوے - ؎

روح روان و جسم کی صورت مین کیا کہون ۔۔۔ جھونکا ہوا تھا اودھر آیا اُدھر گیا

سنہ ۱۸۴۳ء مین تخمینًا بتیس سال کی عمر مین وفات پائی -

سخن شناس جانتے ہین کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کے مقابلے پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ مین کہی - کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چین نہین کہہ سکتا - اگر وہ اپنے رنگ مین فرد ہین تو یہ اپنے طرز مین یکتا ہے - اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اُٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو اگر باریک بینی اور مضمون آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزار نسیم کی سیر کرو - دیکھو فراق یار مین صدمہ گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے - دونون اُستادون کی طبیعت اِس مضمون پر برابر لڑی ہے - مگر دونون کے انداز سخن پر خیال کرو -

میر حسن ۔۔ دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی ۔۔۔ درختون مین جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے رونے لگی
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے — محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کسی نے اگر بات کی بات کی — تو دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلایا تو پینا اسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے

نسیم

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی — کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
کھانی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یک چند جو گذری بے خور و خواب — زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوس خیال بن گیا گھر

دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں حق سخنوری ادا کیا۔ میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شب ہجران کی بیقراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعاروں کی نزاکت، تشبیہوں کی پختگی سے مصنف کا زور طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہاں پہونچتے ہوئے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہیں۔ غرضکہ اگر صورت حال کا بیان

میرحسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میرحسن کہتے ہین ۔۔ ؎

سب اعضا بدن کے موافق درست ۔۔۔ ہر ایک کام مین اپنے چالاک و چست
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام ۔۔۔ قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اسی مضمون کو اپنے رنگ مین ادا کرتے ہین ۔۔ ؎

دن دن اُسے ہو گیا قیامت ۔۔۔ بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمین مین سرو گڑتے ۔۔۔ باتین کرتی تو پھول جھڑتے

یا حسن تعمیر کا مضمون دونون نے اپنے اپنے طرز پر نظم کیا ہے ۔

میرحسن ۔ عمارت کی خوبی درون کی وہ شان ۔۔۔ لگے جس مین زربفت کے سائبان
چقین اور پردے بندھے زرنگار ۔۔۔ درون پر کھڑی دست بستہ بہار

نسیم ۔ گول اس کے ستون تھے ساعد حور ۔۔۔ چلمن مژگان چشم مخمور
دکھلاتا تھا وہ مکان جادو ۔۔۔ محراب سے در سے چشم و ابرو

شاہزادے کے غائب ہو جانے پر میرحسن نے پس ماندہ لوگون کی پریشانی کا حال اس صورت پر نظم کیا ہے ؎

کھلی آنکھ جو ایک کی وان کہین ۔۔۔ جو دیکھا تو وان شاہزادہ نہین

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی ۔۔۔ کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی ۔۔۔ کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو ۔۔۔ گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

ہوا گم وہ یوسف پڑی پھر یہ دھوم　　کیا خادمانِ محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا　　عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لبِ بام پر　　دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیم بر
جو دیکھی جگہ وہ جہاں سے گیا　　کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
مرے نوجواں اب کدھر جائے پیر　　نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحرِ غم میں ڈبویا مجھے　　غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

پھول کے غائب ہو جانے پر بکاؤلی کے اضطراب کی تصویر نسیم نے اپنے رنگ میں یوں کھینچی ہے

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے　　کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل　　جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون　　ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے　　بو ہو کے تو گُل اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل　　سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا　　شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورتِ بید　　ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس　　غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھون سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اِس کا صبا نہ لیتی تھی مین — اِس گل کو ہوا نہ دیتی تھی مین
گلچین کا جو ہاے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی مُنہ سے کچھ نہ چھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا اچنگل — مشکین کس لین نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

میر حسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل مین دَوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اُس کی تصویر آنکھون کے سامنے کھینچ دیتا ہے نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوے ہین۔ ایک کی زینت حُسن صورت سے ہے۔ دوسرے کی شان لطف معنی سے قائم ہے۔ میر حسن سخن آفرین ہین نسیم معنی آفرین ہین۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہین۔ استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے۔ مگر اتنا کہنا نا انصافی نہین کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام مین ہے۔ وہ نسیم کے کلام مین نہین ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو درد عموماً شعراے دہلی کے کلام مین پایا جاتا ہے وہ اہل لکھنؤ کے کلام مین نہین پایا جاتا۔ مگر با این ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے نسیم کی مثنوی اپنے رنگ مین لاجواب ہے یہی وجہ ہے کہ جب ان کے طائرِ شہرت نے پر پرواز نکالے تو یہ کسی کے خرمن کے خوشہ چین نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحبِ طرز کہلائے۔

گلزار نسیم کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا حصہ ہے تناسب لفظی ہے۔ تناسب لفظی کی صفت ہمیشہ اُردو شاعرون کے پسند خاطر رہی ہے لیکن کسی نے اس کو اس درجہ کمال پر نہین پہونچایا جیسا

کہ گلزار نسیم میں ہم دیکھتے ہیں۔ چند اشعار تمثیلاً لکھے جاتے ہیں۔ ؎

پردہ سے جو دایہ نے نکالا　　پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

اک مرغ ہوا اسیرِ صیّاد　　دانا تھا طائرِ چمن زاد

پالا تو مفارقت ہے انجام　　دانا ہے تو مجھ سے لے کے دام

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجے　　سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

سودا ہے مری بکاؤلی کو　　ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

سختی سہی یا کڑی اٹھائی　　آفتا وقتی جو پڑی اٹھائی

اس رنگ کے اشعار گلزار نسیم میں کثرت سے ملیں گے۔ واقعی اس رنگ کو خوب نباہا ہے۔ اور طرہ یہ کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ۔ تناسب لفظی کی صنعت کا لطف یہ ہے کہ یہ کسی مقام پر نہ معلوم ہو کہ فلاں لفظ خواہ مخواہ شعر میں اس لئے بھر دیا گیا ہے کہ وہ کسی لفظ سے تناسب رکھتا ہے اور یہ لطف گلزار نسیم میں ہے۔ مثلاً کیا خوب مصرع ہے۔ ع

سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

اس مصرع میں سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے لیکن دونوں لفظ اس نوعیت
سے آئے ہیں کہ بالکل ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں اور الگ بھی۔ حالانکہ ایک کی رونق
دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سایہ کا لفظ خواہ مخواہ دھوپ کے لئے
لایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس صنعت کا خوبی کے ساتھ نباہنا آسان نہیں ہے۔ یہ راہ بڑی
کٹھن ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً امانت کے لئے تناسب لفظی کا شوق
جنون کے درجے تک پہونچ گیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے اور طبیعت میں شستگی
کا جوہر نہیں لہذا جو شعر اس رنگ میں کہا ہے اسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

پانی نہ آبرو پہ پھرے بحر حسن مال ۔۔۔ موتی ملیں تو دانت نہ اپنے نکالیے

ایک اور شعر اسی رنگ میں ہے۔ ؎

قبر پر میری لگایا نیم کا اُس نے درخت ۔۔۔ بعد مرنے کے مری تو قبر آدھی رہ گئی

سبحان اللہ کیا تناسب الفاظ ہے نیم حکیم اور نیم مُلّا سنے تھے اِس شعر کا مصنف نیم شاعر ہے۔ ایک
صاحب نے گلزار نسیم کا جواب کہا ہے اور چونکہ تناسب لفظی گلزار نسیم کا خاص جوہر ہے لہذا انھوں نے
بھی اس رنگ کے شعر کہے ہیں مگر لطافت سخن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک شعر ان کا بھی تمثیلاً لکھا جاتا ہے

باچھی ہیں شہر سے نفے سب اُجڑ جائیں ۔۔۔ بیری ہو سے بیر کیڑے پڑ جائیں

اپنے نزدیک ان صاحب نے یہ شعر نسیم کے ذیل کے شعر کا جواب کہا ہے۔ ؎

سنبل مرا تازیانہ لانا ۔۔۔ شمشاد اسے سولی پہ چڑھانا

لیکن سخن شناس جانتے ہیں دونوں شعروں میں اندھیرے اُجالے کا فرق ہے۔ خلیل کا بھی

ایک شعر اس رنگ میں یاد آگیا۔ ؎

وہ شمع رو پتنگ اُڑاتا ہے شاید آج
کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل کی

یا آزند کہتے ہیں۔ ؎

میلا ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج
تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے

قلق بھی طلسم الفت میں کہتے ہیں۔ ع

قندلب پی رہے تھے گڑ گڑیاں

ان اشعار کے تمثیلاً پیش کرنے سے محض یہ مُراد ہے کہ تناسُب الفاظ کا لطافت کے ساتھ نباہنا اک امر دشوار ہے۔ نسیم کو اس رنگ میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ آتش کا شعر ان کی شاعری پر صادق آتا ہے۔ ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگون کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ کہیں نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قائم نہیں رہ سکی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔ ؎

ان مختصروں نے جب دیا طول
بولی وہ بکاولی کہ معقول

پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل
پہونچا لب حوض سے نہ جنگل

لیکن اس قسم کے اشعار کل مثنوی میں دو فی صدی سے زیادہ نہ ملیں گے۔ لہذا قابل معافی ہیں۔

اختصار جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے اس مثنوی کا عجیب جوہر ہے۔ واقعی دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملیگا۔ بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو

چند شعرون مین اِس خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ بھی نہین ہو سکتا۔
مثلاً صحرائے طلسم کی داستان مین مندرجۂ ذیل دو شعر کتنے پُر معنی ہین اور کس قدر اختصار سے پُر ہین۔ ؎

طوطا بن کر شجر پہ جا کر　　　پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
تپتے پھل گوند چھال لکڑی　　　اِس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر تین چار داستانون کا خلاصہ کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ ؎

وہ جل وہ ہار وہ غلامی　　　وہ گھات وہ جیتنا تمامی
وہ دسترس اور وہ پاے مردی　　　وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر　　　وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی صحبت　　　تسودا کی وہ آدمیّت
تجویز کی وہ سُرنگ کی راہ　　　اور ہوش دوانیان وہ دلخواہ
وہ سیر چمن وہ پھول لینا　　　وہ عزم وطن وہ داغ دینا
وہ کور کے حق مین خضر ہونا　　　وہ غولون سے مل کے پھول کھونا
وہ بال کو آگ پر دکھانا　　　وہ صدمے پر دیونی کا آنا
وہ نزہتِ گلشنِ نگارین　　　وہ دعوتِ بادشاہ وہ تمکین
گذرا تھا جو کچھ بیان کیا سب　　　پنہان تھا جو کچھ عیان کیا سب

یا اکثر دو تین شعر کا مطلب ایک شعر مین ادا کر دیا ہے۔ ؎

تیورا کے وہین وہ یار بردوش　　　بیٹھا تو گرا گرا تو بیہوش

مفلس زردار امیر قلاش   تو کر تاجر فقیر خوش باش

افسردہ مین تھی جو بھی پائی   شرمائی لجائی مسکرائی

پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت   پوچھا کہ طلب، کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی مین معاملہ برعکس ہے - اُس مین ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے - اور یہی اس مثنوی کا بہت بڑا عیب ہے -

علاوہ برین نسیم کے کلام مین وہ پختگی اور ترکیب مین وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش نل دمن فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے - واقعی کیا پُرشوکت کلام ہے -

پرچمِ سخن سدا ہے باقی   دریا نہین کار بند ساقی

مرغانِ ہوا تھے ہوش راہی   نقشِ کفِ پا تھے ریگِ ماہی

سائے کو پتا نہ تھا شجر کا   عنقا تھا نام جانور کا

جاگی مرغِ سحر کے غل سے   اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

پانچوں سر پنجۂ وفا تھے — یا مطلع خمسۂ صفا تھے

اے آئینہ دار خود نمائی — وے سرمۂ چشم آشنائی

اک شب تھی کہ خال روی شامت — یا مردم دیدۂ قیامت

خورشید بصر گہن سے چھوٹا — خیرات کے در کا قفل ٹوٹا

انسان سے جھکی پری کی گردن — کانٹے سے رکا ہوا کا دامن

نسیم نے عموماً مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور نہایت لطافت کے ساتھ مثلاً ذیل کے دو اشعار تشبیہ کامل کا نمونہ ہیں۔

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوس میں خیال بن گیا گھر

محرم جو ہٹی تھی اس قمر کی — برجوں پہ سے چاندنی تھی سرکی

لیکن بعض مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اٹھا دیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے ایسے اشعار جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ مثلاً

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

غم راہ نہین کہ ساتھ دیجے　　دُکھ بوجھ نہین کہ بانٹ لیجے

سمجھانے سے تھا ہمین سروکار　　اب مان نہ مان تو ہے مختار

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے　　مختار ہے جس طرح نباہے

پانی تہ خاک کو رواں ہے　　کو شعلہ کی سوے آسمان ہے

انسان و پری کا سامنا کیا　　مٹھی مین ہوا کا تھامنا کیا

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے　　جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے

درویش رواں رہے تو بہتر　　آب دریا بہے تو بہتر

نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے۔ اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہئے۔
واقعی کیا خوب کہا ہے۔

لپٹی تھی جو زلف کروٹون مین　　بَل کھا گئی تھی کمر لٹون مین

نور آ گیا چشم آرزو مین　　　آیا پھر آب رفتہ جو مین

گل ہو ن تو کوئی چمن بتاؤن　　　غربت زدہ کیا وطن بتاؤن

بیچا تو ٹکے کا جانور ہون　　　گر ذبح کیا تو مشت پر ہون

اِس نام کے اس لقب کے صدقے　　　اِس نامہ کے اس طلب کے صدقے

کیون منہ پہ شفق خوشی سے پھولی　　　کیا شامِ وصال راہ بھولی

منہ پھیر کے ایک مسکرائی　　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　　ہونٹون کو ملا کے رہ گئی ایک

کیا رنگ زمانے نے دکھائے　　　گل لینے گئے تھے داغ لائے

راتوں کو جو گنتے تھے ستارے　　　دن گننے لگے خوشی کے مارے

گلزار نسیم کی زبان میں اور آج کل کی زبان میں کچھ فرق نہیں ہے صرف بعض محاورے جو نسیم کے وقت میں رائج تھے اب متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً نسیم کہتے ہیں ؎

پل مارنے کی ہوئی جو دیری　　　سبحان اللہ شان تیری

اب "دیری" متروک ہے۔ "دیر" جو زیادہ فصیح ہے رائج ہے۔

یا ایک شعر ہے ؎

ٹھہری یہ غرض کہ آج کی رات　　　فیروز شہ آگے چھیڑیے بات

اب یوں کہیں گے فیروز شہ کے آگے چھیڑیے بات۔

غرضکہ تناسب لفظی، اختصار، پختگی کلام، چستی بندش، شوکت الفاظ، پاکیزگی زبان اس مثنوی کے خاص جوہر ہیں۔ اور استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا کاری کی ہے اُس نے اور حسن دوبالا کر دیا ہے۔ اس مثنوی کے مقبول ہونے کا راز یہی ہے کہ باوجود اس اختصار کے یہ اتنے محاسن کا مجموعہ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ زمانہ نے جیسی اس کی قدر کی اس پر جو مصنف کو ناز ہو سکتا ہے۔ پسند عام کے ساتھ قبول خاص کا شرف گلزار نسیم کو حاصل ہے۔ نقادان سخن کا سرتاج اور اُردو زبان کا مستند مورخ محمد حسین آزاد لکھتا ہے "پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی۔ اس کی عام و خاص سب میں شہرت ہے۔ اس کے نکتے اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے اُس پر خوش ہوتے ہیں اور بوٹے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے ملک سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر ان میں

فقط دو نسخے ایسے نکلے جنہوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک سحرالبیان دوسری گلزار نسیم ؎ (آب حیات) مگر طبائع کا رنگ مختلف ہے۔ جہاں منصف مزاجوں نے گلزار نسیم کی قدردانی سے آبیاری کی وہاں اکثر نگاہوں میں اس باغ کی شادابی کانٹا بنکر کھٹکی ان حضرات نے اپنی اپنی ہمت کے موافق نسیم کی شہرت پر خاک ڈالنے کی فکر کی ہے۔ چنانچہ اب تک اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آتش نے یہ مثنوی کہکر نسیم کو دے دی تھی۔ لیکن میری رائے میں اس دعوے بے دلیل پر چیں بجبیں ہونا بیکار ہے۔ ایک معنی میں یہ بیان قدردانِ نسیم کے لئے باعث فخر ہے۔ اِس سے بڑھکر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اس کا کلام آتش ایسے زبردست اُستاد کی طرف منسوب کیا جائے۔ حالانکہ سخن شناس جانتے ہیں کہ جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے اس رنگ میں آتش نے اپنی زندگی میں ایک شعر نہیں کہا۔

ایک تذکرہ نویس صاحب فرماتے ہیں کہ نسیم مشرف باسلام تھے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا۔ خیر یہ تو پرانے زمانے کے لوگوں کی طباعی ہے۔ اِس زمانہ میں مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے۔ مصنف گلزار نسیم نے اِس کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ گلزار نسیم میں دو شعر اس صورت پر ہیں۔ ؎

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو

جو مطلب کہ مصنّف ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ تو اس طفل مہ جبین کو دیکھکر خوش ہوتے تھے مگر نجومیون نے بادشاہ سے یہ کہا کہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھکر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیے گا۔ (کیونکہ اس کو دیکھ کر بینائی جاتی رہیگی) ظاہر ہے کہ ان دونون بیتون مین جب تک کئی لفظ بڑھائے اور جب تک کئی لفظ بدلے نہ جائین تب تک یہ مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے ان بیتون سے سیدھی طرح نہین نکل سکتا اور مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپان نہین ہو سکتا (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۵ سطر ۱۴-۱۶) اس کے جواب مین صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اگر مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑتی۔ آج کل گلزار نسیم کے بیشمار نسخے شایع ہوتے ہین جن مین سیکڑون جگہ کاتب کی اصلاحین ہوتی ہین۔ اور تو اور اکثر اشعار ان نسخون سے غائب ہین۔ اور جو ہین ان کی ترتیب مین غلطی ہے۔ چنانچہ یہ دو شعر بھی جو مولانا حالی کی طبع گرامی کے بار خاطر ہوے صحیح نسخے[۱] مین اس صورت پر ہین۔

---

[۱] یہ نسخہ کمیاب ضرور ہے لیکن لکھنؤ مین پرانے بزرگون کے پاس ملیگا! اس نسخے کی شناخت یہ ہے کہ اس کے آخر مین ذیل کی عبارت درج ہے " پنڈت دیاشنکر متخلص بہ نسیم کہ در فن شاعری کمالے بہم رسانیدہ اند...... قصۂ تاج الملوک و بکاولی را از نثر بہ نظم آوردہ بہ گلزار نسیم موسوم ساختہ بودند...... در بیت السلطنت لکھنؤ بمحلہ محمود نگر متصل اکبری دروازہ در مطبع حسینی سیدی سندی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل مرحوم و مغفور بہ تصحیح و مقابلہ مصنف حلیہ طبع پوشید" اس نسخے مین مصنف کی طبعزاد تاریخ طبع مثنوی بھی درج ہے جو کہ آج کل کے نسخون مین نہین ملتی ہے

اے خالق کردگار شکرا ۰۰ شکرا شکرا ہزار شکرا ۰۰ کین جملہ ز ابتدا خبر داد ۰۰ شاخ قلم چنین ثمر داد
در عہد خلافت شہنشاہ ۰۰ امجد علی شاہ خلد اللہ ۰۰ سید حسن آنکہ طبع پاکش ۰۰ چون مطبع اوست خوب و دلکش
از سمع رضا شنید و بستود ۰۰ در مطبع خویش طبع فرمود ۰۰ چون زیور طبع نیک پوشید بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع ۰۰ گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع
۱۲۶۰

یہ نسخہ اسی پرانے نسخے کی نقل ہے۔ گو اس پرانے نسخے مین بھی چھاپے کی غلطیان موجود ہین مگر بہت کم۔

خوش ہوتی ہے طفل مہ جبین سے ثابت یہ ہوا ستارہ بین سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو

اب مطلب صاف ہے اور مصرعون مین کامل ربط ہے یعنی طفل مہ جبین سے خوش ہوتی ہو ستارہ بین سے یہ ثابت ہوا کہ یہ لڑکا پیارا تو ہے مگر اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔

دوسرا اعتراض ملاحظہ ہو۔ نسیم کا شعر ہے۔

نور آنکھ کا کہتے ہین پسر کو
چشمک تھی نصیب اس پدر کو

مولانا حالی فرماتے ہین کہ "بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے۔ مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھون کے لئے ظلمت تھا پس جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ نہ بدلے جائین کلام مربوط نہین ہو سکتا۔" (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۶) مین اس اعتراض کی تہ کو بالکل نہین پہونچا۔ مجھکو یہ شعر کسی صورت پر بے ربط نہین نظر آتا۔ جو مضمون مولانا حالی نے نثر مین بیان کیا ہے وہی نظم کے پیرائے مین ظاہر کیا گیا ہے۔ نسیم کے اس شعر پر اعتراض کرنا ہوا سے لڑنا ہے۔

تیسرا اعتراض مولانا حالی کا یہ ہے کہ نسیم کا ذیل کا شعر اصلاح طلب ہے۔

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

آپ فرماتے ہین کہ اس شعر کے دونون مصرع مربوط نہین ہین کیونکہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ "شاہ" اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی

شخص مُراد ہے۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۲ سطر ۴-۱)

اِس اعتراض کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اصل شعر اس صورت پر ہے

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ

نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

ابھی لکھنؤ مین ایسے بزرگ موجود ہین جن کو قریب قریب کل مثنوی حفظ ہے ان کی زبان سے یہ شعر اسی صورت پر سُنا گیا ہے۔

نسیم نے بکاؤلی کے اضطراب کے بیان مین چند شعر کہے ہین۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس مین	آنسو پیتی تھی کھا کے قسمین
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ	کپڑون کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب	زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت مین خیال رہ گئی وہ	ہیئت مین مثال رہ گئی وہ

مولانا حالی فرماتے ہین کہ ان اشعار مین تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعرون کا مطلب کچھ نہین معلوم ہوتا اور ظاہرا مصنف نے کوئی مطلب کہا بھی نہین ہے مصنف کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمین کھاتی تھی پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ اور کپڑون کے عوض رنگ بدلتی تھی۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۲۱۵ سطر ۲-۹)

مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا موصوف اصول شاعری سے بےخبر ہین۔ نازک خیالی اور بلند پروازی جو کہ اعلیٰ درجے کی شاعری کے جوہر ہین ان اشعار مین موجود ہین۔ پھر ان کو

بے معنی کہنا چہ معنی دارد۔ وجہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کے نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لے جاتے ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں کی پیچیدگیاں قائم نہیں رہتیں لہذا آپ خیال کرتے ہیں کہ مغربی شاعری کا اصول یہ ہے کہ عبارت سادہ نظم کر دی جائے اور اس خیال کے موافق اردو کے جن اشعار میں آپ نازک خیالی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی قسم کی پیچیدگی پاتے ہیں اس کو بے معنی اور مہمل قرار دیتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پرتاثیر ہو۔ نثر کا انداز یہ ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ ان سے ایک خاص معنی صاف طور پر پیدا ہوں۔ برخلاف اس کے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں۔ اگر اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اشعار مرقومہ بالا کی وقعت کا اندازہ کیا جائے تو وہ بے معنی نہ نظر آئیں گے بلکہ ایک کوزہ دریا نوش کی کیفیت نمایاں کریں گے۔ مثلاً پہلے شعر کے معنی یہ ہیں کہ "اس کے دل پر فراق یار کا صدمہ ایسا تھا کہ کھانے پینے کی اس کو مطلق تنفر تھی اگر کوئی شخص اس قسم کا ذکر بھی کرتا تھا تو ٹال دیتی تھی۔ بس دن رات ضبط گریہ کئے پڑی رہتی تھی اگر کوئی کھانے پینے پر اصرار کرتا تھا تو قسمیں کھاتی تھی کہ میں نہ کھاؤں گی" یہ ظاہر ہے کہ نثر میں یہ مضمون اس وضاحت کے ساتھ وہ لطف نہیں دیتا

جو لطف کہ نظم مین اختصار کے ساتھ پیدا کرتا ہے اسی طرح دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ "وہ اپنی زندگی سے تنگ تھی - اپنی آسایش کا اُس کو مطلق خیال نہین رہتا تھا - یہان تک کہ کپڑے بھی نہین بدلتی تھی - بیشک طرح طرح کے صدمے جو اُس کے دل پر گذرتے تھے تو اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا" جو تھا شعر سچی شاعری کی تصویر ہے - اس مین مصنف نے اپنی قوت خیال کا کمال دکھایا ہے اس کے معنی یہ ہین کہ "وہ ایسی نحیف و زار ہو گئی تھی کہ اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک تصویر خیالی روبرو ہے جس مین نہ دم ہے نہ تاب و توان - اس کی عجیب ہیئت ہو گئی تھی بس ایک سکتے کا عالم طاری تھا عالم اجسام کے بسنے والون کی اس مین کوئی بات باقی نہین رہی تھی وہ اپنی اگلی ہستی کا محض ایک شبہہ ہو کر رہ گئی تھی "۔

ان اعتراضات کو دیکھ کر انیس مرحوم کا ایک قطعہ یاد آتا ہے[۱] -

مزہ یہ طرفہ کہ مضمون تو دستیاب نہین — مقابلے پہ چڑھاتے ہین آستینون کو
غلط یہ لفظ وہ بندش بری وہ مضمون سست — ہنر عجیب ملا ہے یہ عیب بینون کو

لیکن ان نکتہ چینیون سے نسیم کی شہرت مین فرق نہین آ سکتا - جب تک اردو شاعری کا مذاق قائم ہے اور طبیعتون مین جوہر شناسی کی قابلیت باقی ہے گلزار نسیم کی تازگی قدردانان سخن کے

---

[۱] مولانا حالی کے اعتراضات کی نسبت صرف میری ہی یہ رائے نہین - میرے ایک دوست او مولانا شبلی سے گلزار نسیم کی نسبت کچھ خط و کتابت ہوئی تھی - مولانا شبلی نے اپنی ایک تحریر مین صاف لفظون مین لکھا ہے کہ گلزار نسیم کی تنقید مین مولانا حالی نے سخت بیرحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے ۱۲

دماغ کو فرحت بخشتی رہیگی - ہان جن لوگون کے دماغ مین تعصب کی ہوا بھری ہے وہ اس گلزار مین پھول ہٹا کر کانٹے چنا کرین گے -

صرف اکثر احباب کے اصرار نے مجبور کیا ورنہ مین ان اعتراضات کا ذکر بھی نہ کرتا - کیونکہ ایسے بے بنیاد اعتراضون کو زمانہ خود فنا کر دیتا ہے - ان کی تردید کرنا فعل عبث ہے علاوہ مثنوی کے نسیم کا غزلون کا چھوٹا سا دیوان بھی ہے لیکن ناتمام - بہت سی غزلین جو تلف ہو گئین ان کا نام و نشان بھی اس دیوان مین نہین ملتا - سن رسیدہ حضرات سے معلوم ہوا کہ چند غزلین اکثر احباب نے اپنی تصنیف کی اس دیوان مین رکھدی ہین - یہ مفت کرم داشتن کا نرالا مضمون ہے - مگر یہ غزلین صاف نسیم کے اصل کلام سے الگ معلوم ہوتی ہین - چونکہ نسیم کی وفات کے بہت روز بعد یہ دیوان شایع ہوا - لہذا لوگون کو اس دست اندازی کا موقع ملا - بہرحال جو ذخیرہ اشعار کا نسیم کے زور طبیعت کا یادگار ہے وہ واقعی قدر و منزلت کی نگاہون سے دیکھے جانے کے قابل ہے - اکثر مقامات پر طبیعت کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی قیامت کرتی ہے مثلاً ؎

بجز اک گور غریبان نقش پا تھے پھر نہین آگے — یہین تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا
نسیم اپنے ہی اعمالون سے گردش ہو زمانے کی — روان کشتی پہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا — حیف آشیان بلند ہے پرواز پست ہے
تھے محو زلف دیدۂ تر دل بھی آپھنسا — مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی مین شست ہے

گر یہی ہے اِس گلستان کی ہوا　　شاخِ گل اک روز جھونکا کھائیگی
جان نکل جائیگی تن سے اے نسیمؔ　　گل کو بوے گل ہوا بتلائیگی

طریق شعر و سخن مین اگر نہین اعجاز　　قلم کی طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

ذرّے کا بھی چمکے گا ستارہ　　قائم جو زمین و آسمان ہے

معنی روشن جو ہو تو سو سے بہتر ایک شعر　　مطلع خورشید کافی ہے پے دیوان صبح

اِس مین شک نہین کہ نسیمؔ کا کلام آتشؔ و ناسخؔ و ذوقؔ و غالبؔ کے کلام کا ہم پایہ نہین ہے - یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہین - اِن کے برابر کسی کو عروج نہین حاصل ہوا لیکن غزل گوئی کے میدان مین نسیمؔ رندؔ صباؔ وغیرہ سے پیچھے نہین ہین - تینون اُستادون کی ہم طرح غزلون کے انتخاب درج ذیل ہین - جن غزلون مین ایک ہی مضمون کے شعر ملے وہ بھی پہلو بہ پہلو لکھ دیے گئے ہین - سخن شناس نگاہ انصاف سے دیکھین -

نسیمؔ　　صہبا کشون کی خاک ہے ہر اک مقام پر　　ساقی ڈھونڈھا شراب کو مستون کے نام پر
صباؔ　　لائی ہے مجھ کو وحشتِ دل اس مقام پر　　ہنسنے کی جا ہے قیس کے سودائے خام پر
رندؔ　　پڑتی ہے آنکھ جب مری مینا و جام پر　　سو سو درود پڑھتا ہون ساقی کے نام پر
نسیمؔ　　دل سے ہر دم ہمین آواز بکا آتی ہے　　بند کانون کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

رند — تیرہ و تار دھوان دھار گھٹا آتی ہے — میکشو فصل مے ہوش ربا آتی ہے
نسیم — گل ہوا کوئی حیسراغ سحری و بلبل — ہاتھ ملتی ہوئی پتون سے صبا آتی ہے
رند — جانب خانۂ خمار سے کیا آتی ہے — لڑکھڑاتی ہوئی جو بادِ صبا آتی ہے
نسیم — چھو لیا دھوکے سے دامانِ صبا تونے تو کیا — غنچۂ گل کہین مٹھی مین ہوا آتی ہے
رند — یہ پتا کوچہ کا اُس حور کے سُن رکھ قاصد — لو نہین چلتی ہے جنت کی ہوا آتی ہے
نسیم — خم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے — مثل ساغر اورون کے کام آئیے
رند — دھوپ دن کی اوس شب کی کھائیے — آستانِ یار پر مر جائیے
نسیم — آپ آہو چشم ہین آہو نہین — ہم سے وحشت کی نہ لیجیے آئیے
رند — مجھ سے بیہودہ نہ گرمی کیجیے — ٹھنڈے ٹھنڈے آپ گھر کو جائیے
نسیم — ابرِ رحمت سنتے ہین نام آپ کا — خاکسارون پر کرم فرمائیے
رند — دن کو تو تشریف تم لاتے ہو روز — شب کو بھی اک دن کرم فرمائیے
نسیم — جوہرِ تیغِ نگہ کھل جائے گا — مُنہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے
رند — کچھ کرون گا مین بھی اب خدمت عرض — چُپکے رہیے مُنہ نہ اب کُھلوائیے
نسیم — لائے اُس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
رند — کیا ملا عرض مدعا کر کے — بات بھی کھوئی التجا کر کے
نسیم — جب ہو چکی شراب تو مین مست مر گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
صبا — واعظ کے مین ضرور ڈرانے سے ڈر گیا — جامِ شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

نسیم — روح روان جسم کی حالت مین کیا کہون — جھونکا ہوا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

صبا — مثل حباب بحر جہان مین نہ دم لیا — اک موج تھا کہ مین ادھر آیا اُدھر گیا

نسیم — گذرا جہان سے مین تو کہا ہنس کے یار نے — قصہ گیا فساد گیا دردسر گیا

صبا — اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم — فتنہ گیا فساد گیا شور و شر گیا

نسیم — ہے رنج عشق میرے لئے مین برائے رنج — خود بھی مٹے یقین ہے جو مجھکو مٹائے رنج

صبا — دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج — پیدا کیا ہے ہمکو خدا نے برائے رنج

نسیم — یا تنگیٔ کنار تھی یا اب فشار قبر — وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج

صبا — آدم سے باغ خلد چھٹا ہم سے کوے یار — وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج

نسیم — ہم شیشۂ شکستہ ہین تم کیف موج مے — بنیاد عیش تم سے ہے ہم سے بنائے رنج

صبا — اے صانع ازل مری مٹی خراب کی — کیا چاہیئے تھی خانۂ دل مین بنائے رنج

نسیم — زارون سے ڈریئے بھولیے زر پر نہ زور پر — کیجے نگاہ حال سلیمان و مور پر

اک عمر سے وظیفہ ہے صاحب کے نام کا — ناخن کے خط ہین اُنگلیون کی پور پور پر

صبا — اگلی برس جنون جو رہا زور و شور پر — زنجیر ہم چڑھائین گے مجنون کی گور پر

دنیا تمام بازی شطرنج باز ہے — مُہرون کی طرح ایک کے ہے ایک زور پر

نسیم — کسی کے دل سے نہ یارب کوئی خراب گرے — نہ شیشہ طاق سے نہ شیشے سے شراب گرے

تمہارے دور مین گر خاک پر شراب گرے — پڑے زمین پہ اُفتادہ آفتاب گرے

صبا — کہون مین اپنی جو اُفتاد بزم ساقی مین — سبو سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے

صبا — بغیر یار ہوئی بزم سے تہ و بالا — شراب خم سے بہی سیخ سے کباب گرے

نسیم — منت دلا کسی کی نہ اصلا اُٹھائیے — مرجائیے نہ ناز مسیحا اُٹھائیے

صبا — افتادگی سے خاک سر اپنا اُٹھائیے — ممکن نہین کہ نقش کف پا اُٹھائیے

نسیم — چاہ اپنی مانتا نہین وہ بے یقین اگر — قرآن کا جامہ پہنیے گنگا اُٹھائیے

صبا — اُس بُت کو اعتبار کسی بات کا نہین — قرآن سر پہ رکھیے کہ گنگا اُٹھائیے

نسیم — فراق دیدہ ہون مین وصل یار باقی ہے — خزان رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے

ہوا تو کہتی ہے صاف آمد بہار چمن — صدائے غنچہ، وحدت ہزار باقی ہے

جنون و عقل کے قصے سے چھوٹے بعد فنا — نہ پردہ در ہے نہ وہ پردہ دار باقی ہے

بتون کے قہر سے ہم کو مقام یاس نہین — اُمید رحمت پروردگار باقی ہے

صبا — نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے — جنون کا جوش ہے فصل بہار باقی ہے

خدا کے واسطے کلمہ بتون کا پڑھ واعظ — زبان تر ہے ابھی اختیار باقی ہے

ہزار حیف اسے بھی فلک مٹا دیگا — کہین کہین جو یہ نقش و نگار باقی ہے

پھنسائیگا مجھے دشت جنون کے کانٹون مین — یہ ایک آدھ جو دامن کا تار باقی ہے

نسیم — کیون خفا رشک حور ہوتا ہے — آدمی سے قصور ہوتا ہے

جس کو دیکھو وہ اِس زمانے مین — اپنے نزدیک دور ہوتا ہے

خاکساری وہ ہے کہ ذرّون پر — روز باران نور ہوتا ہے

صبا — بندہ اب نا صبور ہوتا ہے — عفو ہووے قصور ہوتا ہے

پرتوِ رخ سے ان کا جیب قبا دامن کوہ طور ہوتا ہے
اے صبا جب بہار آتی ہے ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

اِس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہین کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام مین نہین پائی جاتی۔ ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود اس تصنّع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہین ہے طبیعت مین ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو فریدار بنا دیتی ہے۔

شاعری کا رنگ تو دیکھ چکے اب طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو۔ سُنا جاتا ہے کہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب عالم تھا۔ حاضر جوابی تیغ زبان کا جوہر تھی۔ انہین صفات خاص نے ان کا وقار ہمعصر شعرا مین قائم کیا۔ اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا۔ اُس زمانے مین لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گو کہ اردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آ چکا تھا لیکن جیسے چراغ کی روشنی بجھنے کے پیشتر تیز ہو جاتی ہے اسی طرح اس زمانے نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید۔ آتش و ناسخ کی جادو نگار طبیعتین اپنا زور دکھا رہی تھین۔ انیس و دبیر فن مرثیہ گوئی کو عرش پر پہونچا رہے تھے۔ خواجہ وزیر صبا رند و خلیل وغیرہ کی نوجوان اور شوخ طبیعتین ایک طرف قیامت برپا کر رہی تھین۔ اِس زمانے مین ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ مین اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا لیکن نسیم نے اپنے گلہائے مضامین کا سب کو ہزار جان سے شیدا بنا لیا۔ ایسے ایسے معرکے جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی۔ ایک مشاعرے مین نسیم نے مطلع پڑھا۔ ؎

منّت دلا کسی کی نہ اصلا اُٹھائیے

مرجائیے نہ ناز مسیحا اُٹھائیے

آتش بھی اِس مشاعرے مین موجود تھے۔ انھون نے نسیم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میرا مطلع اِس کے آگے گرد ہے۔ مطلع آتش ؎

جان بخش اب کے عشق مین ایذا اُٹھائیے

بیمار ہو کے ناز مسیحا اُٹھائیے

خصوصًا نسیم کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہین مشاعرے کی صحبت تھی یہ بھی وہان موجود تھے۔ قبل مشاعرہ شروع ہونے کے شیخ ناسخ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہین سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انھون نے جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا۔ ع

"شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا"

ان کے مُنہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہان دوسرا مصرع تیار تھا۔ ع

"تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"

اِس مصرع کا سُننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اُٹھے اور ہر طرف سے نعرہائے تحسین بلند ہوئے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ مین مذہبی چوٹ کی تھی لیکن نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرے مین ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع یہ تھا۔ ع

"جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہین"

پہلا مصرع کچھ مہمل سا تھا نسیم کے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرع تو خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہین۔ وہ صاحب بھی جلے تن تھے ان کے کان تک یہ بات پہونچی تھی کہ جھنجھلا کر بولے کہ اچھا اِس سے بہتر مصرع کہ دیجیے۔ یہان تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے اُسی وقت مصرع موزون کر کے سُنا دیا

تیرہ دل کی بزم مین جام شراب آتا نہین
(جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہین)

نسیم کی شاعرے مین دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

ایک روز آتش کے یہان شاگردون کا جمگھٹا تھا۔ رند صبا خلیل وغیرہ بیٹھے ہوے تھے نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سُہانا وقت، برسات کا موسم مینہ برستا ہوا عجیب کیفیت تھی، موسم بہار سے کچھ ایسی طبیعتین مست ہوئین کہ شاگردون نے آتش سے فرمائش کی کہ اُستاد اس وقت ایک غزل کہ ڈالیے۔ گو کہ آتش کا بڑھاپا تھا لیکن طبیعت مین جوانی کا زور بھرا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزون کرنے شروع کر دیے اور کہا کہ لکھتے جاؤ۔ جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

دہن پر ہین اُن کے گمان کیسے کیسے
کلام آتے ہین درمیان کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی۔ اُنہون نے ان اشعار کی تخمیس کرنی شروع کر دی۔ جتنی دیر مین آتش دوسرا شعر سوچتے تھے یہ اس عرصے مین

ان کے پہلے شعر پر تین مصرعے لگا چکتے تھے۔ اور بعض بعض مصرعے تو واقعی اس انداز سے لگائے ہین کہ اگر کوئی برسون فکر مین سر بگریبان رہے تو اس سے بہتر مصرع نہین لگا سکتا آتش کے دو شعرون کی تخمیس مثالاً لکھی جاتی ہے۔ ؎

نہ خونی کفن ہین نہ گھائل ہوے ہین ۔۔۔ نہ زخمی بدن ہین نہ بسمل ہوے ہین
لہو مل کے کشتون مین داخل ہوے ہین ۔۔۔ تمہارے شہیدون مین شامل ہوے ہین
گل و لالہ و ارغوان کیسے کیسے

کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے ۔۔۔ کہ پردے مین کون اے صنم جلوہ گر ہے
کہین کچھ خیال اور کہین کچھ نظر ہے ۔۔۔ دل و دیدۂ اہلِ عالم مین گھر ہے
تمہارے لیے ہین مکان کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ شعر کی غزل پر مصرع لگائے ہین۔

آتش کے شاگردون مین صبا سے ان سے بہت یارانہ تھا۔ ان کے مرنے پر صبا نے ایک شعر کہا جو کہ واقعی درد دل کی تصویر ہے۔ ؎

اُٹھ گئے ہین نسیم جس دن سے
اے صبا وہ ہوا ے باغ نہین

لیکن رند سے چشمک تھی۔ چنانچہ ایک مشاعرے مین نسیم نے رند کی ایک مشہور غزل پر خمسہ پڑھا۔ جس کا مقطع یہ تھا۔ ؎

وصل انسان کا پریزادون کا ہو، ہے دشوار ۔۔۔ فائدہ کچھ نہین تم مفت مین کیون ہوتے ہو خوار

کہتے کہتے تو ہوے تم کو نسیم اب لاچار　　عشق کو ترک کرو یا نہ کرو ہو مختار

نیک و بد ہم ہین تمہین رند سمجھاتے جاتے

اِس مصرع کا زبان سے نکلنا تھا کہ - ع کہتے کہتے تو ہوے تم کو نسیم اب لاچار - کہ رند نے سر مشاعرہ تلوار کھینچ لی اور نسیم سے برسر پیکار ہونے کا ارادہ کیا- نسیم کے مزاج مین بھی بانکپن تھا یہ بھی اُٹھ کھڑے ہوے اور کہنے لگے کہ تلوار پر نہ بھولنا- یہان تھپڑون سے تلوار چھین لیتے ہین لیکن آفتاب الدولہ قلق وغیرہ اِس مشاعرے مین موجود تھے اُنھون نے بگڑی ہوئی طبیعتون کو سنبھالا اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا- اور رند سے کہا کہ بندہ نواز یہ تلوار کا مقام نہین- یہان زورِ قلم سے کام لیجیے- اس ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ تھی کہ رند جو کہ ایک رنگین مزاج اور عاشق تن آدمی تھے اِس زمانے مین ایک بارگاہ حُسن کے اُمیدوارون مین تھے لیکن قسمت کی نارسائی سے منزل مقصود تک رسائی نہین ہوئی تھی- تلوّن مزاجی نے اس مایوسی کی حالت کو غیظ و غضب سے بدل دیا تھا- نسیم نے اس خمسہ مین در پردہ اسی کیفیت کا اشارہ کیا تھا- رند کے چوٹ کھاے ہوے دل پر یہ طعن آمیز نصیحت گران گذری اور اس معرکے کا باعث ہوئی- علاوہ برین اسی غزل مین رند کا ایک شعر ہے- ؎

راستہ روک کے کہ لونگا جو کہنا ہے مجھے

کیا ملوگے نہ کبھی راہ مین آتے جاتے

نسیم نے ایک صحبت مین اِس شعر کا دوسرا مصرع پڑھا تو مذاقاً "ملوگے" تانیث کے ساتھ پڑھا یعنے

راستہ روک کے کہ لونگا جو کہنا ہے مجھے　　کیا ملوگی نہ کبھی راہ مین آتے جاتے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور اس شعر کو لوگ اسی صورت پر پڑھنے لگے۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر رند کے کانون تک بھی پہونچی۔ حریفون نے اصل واقعہ پر اپنی طرف سے اور حاشیے چڑھائے۔ غرض کہ رند کے دل مین اس واقعہ کی وجہ سے بھی ایک کاوش موجود تھی۔ یہ بھی ان کے لئے نسیم سے بگڑنے کی وجہ ہوئی۔ ایک موقع پر رند نے ایک شعر پڑھا۔ ؎

کیا ملا عرض مُدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

نسیم نے پہلا مصرع یون بدل کر پڑھا۔ ع

فائدہ عرض مُدعا کر کے

اور کہا اب شعر بہتر ہو گیا۔ اور لوگ بھی جو بیٹھے تھے اُنھون نے بھی نسیم کی اسی کہی۔ یہ امر بھی رند کو ناگوار گذرا۔

نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ مین تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے کہ شاعرانِ لکھنؤ ان پر مصرعے لگا کر بھیجین۔ تینون مصرعے ملاحظہ ہون۔

(۱) ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا
(۲) اِس لیے قبر مین رکھا اُنھین زنجیر سمیت
(۳) من می روم بہ کعبہ و دل سیر دیر یہ

اب اہل لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے کہہ کر بھیجے جائین کہ دہلی والون کو بھی یہان کی شاعری کا

قائل ہونا پڑے۔ اگر مصرع سست ہوے تو کرکری ہو جائیگی۔ غرضکہ تین شخصون کو جو ہر طرح اس کام کے لئے موزون خیال کئے گئے ایک ایک مصرع پر مصرع لگانے کا کام سپرد ہوا۔ پہلا مصرع ناسخ کو دیا گیا۔ دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو۔ گو کہ اُس وقت اور بڑے بڑے شاعر موجود تھے مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا۔ تینون اُستادون نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہین۔

ناسخ کا مصرع ہے

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا

(ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا)

آتش کا مصرع ہے۔

حشر مین حشر نہ برپا کرین یہ دیوانے

(اِس لئے قبر مین رکھا انھین زنجیر سمیت)

نسیم کا مصرع بھی لاجواب ہے۔

دارم زدین و کفر بہر یک قدم دو سیر

(من می روم بہ کعبہ و دل می رود بدیر)

نسیم کے مزاج مین آزادی اور ریا کی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی دُنیا کے مال و دولت کی تمنا نہ کی۔ گو کہ بہت اہل تکشمر اس زمانے مین عہدہاے جلیلہ پر ممتاز تھے اور دربار شاہی مین ان لوگون کی رسائی تھی۔ اِن حضرات نے کئی مرتبہ نسیم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو دربار شاہی

تک پہونچائین اور ان کے منصب و جاگیر کی فکر کرین مگر اس شہنشاہ سخن نے دوات وقلم کو طبل و علم پر ترجیح دی اور دُنیا کی شان و شوکت کی طرف رُخ نہ کیا۔ اور یہ کیا اکثر اہل کمال اسی کے رنگ کی طبیعت رکھتے ہین۔ انیس مرحوم فرماتے ہین۔ ؎

در پہ شاہون کے نہین جاتے فقیر اللہ کے
سر جہان رکھتے ہین سب ہم وان قدم رکھتے نہین

ایک مرتبہ امجد علی شاہ کے سامنے ایک طوائف نے نسیم کی وہ لاجواب غزل گائی جسکا مطلع ہے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی
کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائیگی

جب اس مرصع غزل کا مقطع گایا

جان نکل جائے گی تن سے اے نسیم
گُل کو بوے گُل ہوا بتلائیگی

تو سخن شناس بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ غزل اسی نسیم کی ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے۔ اُس نے کہا ہان۔ یہ سُننا تھا کہ ارشاد ہوا کہ اس سخنور باکمال کو دربار شاہی مین حاضر کرو۔ حریفون نے کہا کہ حضور نسیم کا تو انتقال ہوگیا۔ خدا جانے وہ کیسا وقت تھا اور یہ منحوس کلمہ کیسی زبانون سے نکلا تھا۔ ادھر یہ بات مُنہ سے نکلی اُدھر قدر انداز قضا کے ترکش سے تیر نکلا جس نے کہ تھوڑے ہی عرصے مین نسیم کا خاتمہ کر دیا۔ مرنے کے دو تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا۔ ؎

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوے
جان پڑی تب بار شکم تھے مر کے وبال دوش ہوے

گلزار نسیم

(ماخوذ از "اردوے معلےٰ" جولائی ۱۹۰۵ء)

الجھ پڑون کسی دامن سے مین وہ خار نہین — وہ پھول ہون جو کسی کے گلے کا ہار نہین

گذشتہ مارچ اور اپریل کے "دلگداز" مین میرے عنایت فرما عبد الحلیم صاحب شرر کے دو مضمون "گلزار نسیم" کے متعلق شایع ہوے ہین جو کہ قدردانان نسیم کے لیے کسی قدر دلخراش ثابت ہونگے۔ حال مین گلزار نسیم کا ایک نیا اڈیشن شایع ہوا ہے جس کی ترتیب دینے کی خدمت مین نے اپنے ذمے لی تھی۔ یہ اس نئے اڈیشن کی اشاعت ہے جس نے حضرت شرر کی روشنی طبع کو اشتعال دی ہے۔ حضرت موصوف نے جو کچھ "گلزار نسیم" کی نسبت تحریر فرمایا ہے اس کا مناسب جواب خاموشی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ذیل کی تحریر سے ثابت ہوگا آپ کے مضامین خود زبان حال سے آپ کے دلائل کی تردید کرتے ہین۔ لیکن ان مضامین سے ناواقفان سخن کے دل مین کثر غلط فہمیان پیدا ہو سکتی ہین۔ اس خیال نے ذیل کی چند سطرین لکھنے پر مجبور کیا ہے

منظور ہے گذارش احوال واقعی — اپنا بیان حسن طبیعت نہین مجھے

حضرت شرر نے اپنے پہلے مضمون کی تمہید مین تحریر فرمایا ہے کہ "اگر اس مثنوی گلزار نسیم کے

محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اُن نظمون مین ہے جیسی کہ اُردو شاعری کو اپنی اِس صدی کی عمر مین دو ہی چار نصیب ہوئی ہونگی لیکن اِس کے ساتھ ہی اِس کے معائب پر نظر ڈالی جاے تو اِس سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم مین نہین ہین"۔ یا اِسی سلسلہ مین آپ پھر تحریر فرماتے ہین۔ "کہ جس وقت اِس کے محاسن پر نظر ڈالی جائے تو اس قدر لطف آتا ہے کہ مجبور ہوکر تسلیم کرلینا پڑتا ہے کہ اِس سے اچھی نظم نہین ہوسکتی۔ اور جس وقت اس کی غلطیون کی طرف توجہ کیجیے تو خیال گذرتا ہے کہ شاید اور کسی شاعر کے کلام مین اتنی غلطیان نہ ہونگی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام مین ہین"۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ حضرت شرر نے ان الفاظ کے پردے مین کیا معنی پوشیدہ رکھے ہین۔ ظاہرا طور پر جو معنی ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہین وہ اصولاً قابل اعتراض نظر آتے ہین یعنی جس نظم کی نسبت یہ کہا جائے کہ "محاسن کے اعتبار سے اِس کا شمار ان نظمون مین ہے جیسی کہ اُردو شاعری کو دو ہی چار نصیب ہوئی ہونگی" اُسی نظم کی نسبت یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس مین اس قدر غلطیان ہین جن کا پتہ کسی اُردو شاعر کے کلام مین نہ ملتا ہو۔ مگر چونکہ اصل واقعات سے اس دعوی کی تردید ہوتی ہے۔ لہذا مین اس کے متعلق اصول کی بحث کو زیادہ طول دینا نہین چاہتا۔ حضرت شرر نے اپنے دوسرے مضمون مین گلزار نسیم کے جن اشعار پر اعتراض کیا ہے اُن کی تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہین ہے۔ گلزار نسیم مین تقریباً ڈیڑھ ہزار شعر ہین۔ اب اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے۔ کہ حضرت شرر کے سب اعتراض بجا ہین۔ اِس حالت مین بھی گلزار نسیم مین تین یا چار فی صدی اشعار قابل اعتراض ثابت ہونگے۔ چونکہ حضرت شرر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کہ آپ کو علاوہ اِن اعتراضات کے اس مثنوی مین اور

بھی بہت سے شبہات ہین اِس لیئے یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ جس قدر اعتراضات حضرت شرر نے تحریر فرمائے ہین۔ وہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہین اور اصل مین حضرت شرر ان اعتراضات کے چوگنے اعتراضات پیش کر سکتے ہین اِس حساب سے بھی گلزار نسیم مین بارہ یا تیرہ فی صدی سے زیادہ اشعار قابل اعتراض نہ نکلین گے لہذا جس وقت حضرت شرر یہ فرماتے ہین کہ گلزار نسیم سے سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم مین نہین ہین تو کیا حضرت موصوف کا یہ مطلب ہے کہ کسی اُردو شاعر کے کلام مین بارہ فی صدی یا تیرہ فی صدی شعر بھی قابل اعتراض نہ نکلین گے۔ مین اس کا انصاف سخن شناسون کی رائے پر چھوڑتا ہون۔ کیونکہ جس شخص کی نظر سے دس پانچ اُردو شعرا کا کلام بھی گذرا ہوگا وہ اِس امر کا فیصلہ نہایت آسانی سے کریگا کہ حضرت شرر کے اِس دعوی کی تائید واقعات سے کس حد تک ہوتی ہے۔ یون تو کہنے کو جس کا جی چاہے کہہ سکتا ہے۔ میر حسن ہی کی مثنوی کی نسبت ایک بزرگ کا قول ہے۔ بدر منیر کی مثنوی نہین کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین۔ بھلا اِس کو شعر کیونکر کہیئے۔ سارے لوگ دہلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہین۔

چلی وان سے دامن اُٹھاتی ہوئی

کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

(آب حیات مصنفہ محمد حسین صاحب آزاد) ظاہر ہے ان بزرگون نے کچھ سمجھ ہی کے یہ فرمایا ہوگا جس طرح اِن بزرگوار کو میر حسن کی مثنوی کے مقبول عام ہونے پر حیرت ہے اسی طرح حضرت شرر فرماتے ہین کہ " گلزار نسیم کو جو مقبولیت عام حاصل ہوئی ہے حیرت انگیز ہے"۔ اِن دونون بزرگون کا جواب فصیح شیراز کئی سو برس پیشتر دے گیا ہے کہ ع

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

ہان اس موقع پر مین اِس قدر ضرور عرض کرونگا کہ گلزار نسیم کی شہرت کا ایک بہت بڑا راز یہ بھی ہے کہ اس مین محاسن کے مقابلے مین معائب بہت ہی کم ہین یا برابر نہ ہونے کے ہین اور اُردو زبان مین بہت کم نظمین ہین جو اِس صورت مین اس کا مقابلہ کر سکتی ہین۔

حضرتِ شرر کے مضمون کے اِس تمہیدی حصّے کے انداز تحریر سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت موصوف پنڈت دیا شنکر نسیم ہی کو گلزار نسیم کا مصنّف تسلیم کر لیتے ہین اور جیسا کہ دکھلایا جائیگا اس مضمون کے آخری حصّے مین بھی حضرت شرر نے یہی عقیدہ ظاہر کیا ہے لیکن مضمون کے درمیانی حصّے مین آپنے اِس پُرانے قصّے کو کہ گلزار نسیم آتش کی کہی ہوئی ہے اِس پردے مین تازہ کیا ہے کہ گلزار نسیم کا بہترین حصّہ آتش کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہین کہ "معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب و اختصار کا (یہ) آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ منشی اشرف علی اشرف مرحوم جو نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اسی دَور کے یادگارون مین تھے۔ اس واقعے کو خود مجھ سے بیان کرتے تھے۔ بلکہ اُن کا بیان تھا کہ پنڈت دیا شنکر کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے بہت سے اوراق بھی مین نے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ جو بہت ہی عام مذاق کے تھے اور ایسے تھے کہ سوا ایک مبتدی شخص کے کسی کہنہ مشق شاعر کی جانب نہین منسوب کئے جا سکتے۔ اِس بیان کی تصدیق میر وزیر علی صبا نے بھی ہمارے بعض بزرگون کے سامنے کی تھی"

قبل اِس کے کہ حضرت شرر کے اِس بیان کی نسبت کچھ عرض کرون اتنا ضرور کہونگا کہ منشی اشرف علی مرحوم کی اِس زبانی شہادت سے مجھکو عبد الغفور خان نسّاخ کی شہادت زیادہ پرزور معلوم ہوتی ہے

جنھون نے صاف الفاظ مین لکھدیا ہے کہ نسیم لکھنوی مشرف باسلام تھے حضرت نساخ بھی آخری دور کے یادگارون مین تھے اور بقول غالب شیخ ناسخ تو محض طرز کے ناسخ تھے وہ بصیغۂ مبالغہ نساخ تھے - لہذا اگر ان کی شہادت پر اعتبار کیا جائے اور انہین کی تائید مین دلائل پیش کئے جائین تو گلزار نسیم کا نقاد اُن کاوشون سے نجات پا سکتا ہے جو حضرت اشرف کی زبانی شہادت کی پیروی کرنے مین پیدا ہو سکتی ہین - مثلاً مخالف کہہ سکتا ہے کہ یہ امر کہان تک قابل اعتبار ہے کہ حضرت اشرف نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا تھا کیونکہ مبتدی شعرا کا یہ عام دستور ہے کہ جب تک استاد سے اصلاح نہین لیتے وہ اپنی ایک معمولی غزل بھی کسی کو نہین دکھاتے - اس حالت مین نسیم مرحوم نے ایسی مثنوی کا مسودہ کسی شخص کو دکھانے کی جرأت کیونکر کی جس مین کہ باوجود آتش کی زبردست اصلاح کے اس قدر معائب موجود ہین کہ اس کے دیکھنے سے یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی اور شاعر کے کلام مین اتنی غلطیان نہ ہونگی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام مین ہین - علاوہ اس کے یہ تو سب جانتے ہین کہ نسیم دہلوی سے اور شعرائے لکھنؤ سے عموماً معرکہ آرائیان ہوا کرتی تھین - اور یہ بھی سنا ہے کہ نسیم لکھنوی اور نسیم دہلوی سے خصوصاً چوٹ چلا کرتی تھی - ان باتون کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کون اس امر کو قبول نہین کریگا کہ نسیم لکھنوی نے اپنی مثنوی کا مسودہ نسیم دہلوی کے ایک شاگرد کو دکھایا ہوگا - اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا تھا تب بھی یہ امر غور طلب ہے کہ ان کی رائے نسیم لکھنوی کے کلام کی نسبت کس قدر صحت پر مبنی ہو سکتی ہے - اردو شاعرون کا یہ عام دستور رہا ہے کہ وہ اپنے اُستاد کو سچا فرشتہ دنیا اپنا ایمان سمجھتے ہین - وہ اپنے استاد کے مقابل کے شعرا کو مٹانا اپنا ایمان نہین تو اپنا فرض ضرور سمجھتے ہین - آتش و ناسخ و انیس و دبیر کے شاگردون

کی معرکہ آرائیاں ضرب المثل ہوگئی ہین - اِس صورت مین اگر اشرف مرحوم نے گلزارِ نسیم کے مسودے کو عام مذاق کا بتلا کر حق شاگردی ادا کیا ہو تو اُس زمانے کی روش کے لحاظ سے بہت بجا کیا -
اِن باتون سے قطع نظر کرکے اشرف مرحوم کی تنقید کے نسبت یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا جانے حضرت اشرف نے "عام مذاق" سے کیا مراد لی ہے - ممکن ہے کہ حضرت اشرف کے "مذاق شاعری" کا معیار غیر معمولی طور سے بلند ہو اور گلزارِ نسیم کا مسودہ اِس خاص معیار کے لحاظ سے "عام مذاق" کا خیال کیا گیا ہو - اور کون جانتا ہے کہ اگر گلزارِ نسیم کی موجودہ حالت کی نسبت حضرت اشرف سے رائے پوچھی جاتی تو وہ اب بھی اُس کو "عام مذاق" کا نہ بتلاتے -
غرضکہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے حضرت اشرف مرحوم کی زبانی شہادت ایسی مجمل ہے کہ اِس مین سیکڑون شاخسانے پیدا ہو سکتے ہین - عبدالغفور خان نساخ کی تحریری شہادت اس سے زیادہ صاف اور زیادہ قابل اعتبار ہے - مجھ کو اِس سلسلے مین ایک اور روایت یاد آئی جو کہ اِن دونون روایتون سے زیادہ دلچسپ ہے - لکھنؤ کے ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جو کہ اس آخری دور کے یادگارون مین تھے اور اساتذہ مین شمار کیے جاتے تھے میرے عنایت فرما پنڈت بشن نراین صاحب در سے یہ روایت بیان کرتے تھے کہ گلزارِ نسیم اصل مین حضرت پروانہ کی تصنیف ہے - حضرت پروانہ آتش کے ہمعصر تھے - آتش کو پروانہ کی یہ تصنیف کسی طرح ہاتھ لگ گئی - اُنھون نے اصلاح وغیرہ دے کر نسیم سے ایک مشاعرے مین پڑھوا دی
اِن بزرگ نے بھی غالباً یہ روایت معتبر ذرائع سے سُنی تھی - یہ مختلف روایتین سُن کر میرے دل مین یہ خیال گذرتا ہے کہ گلزارِ نسیم مین باوجود اِس قدر عیوب کے جن سے "زیادہ عیوب

کسی اُردو نظم مین نہین ہین'' یہ عجب تاثیر ہے کہ اس کو کوئی آتش کی طرف صاف طور پر منسوب کرتا ہے۔ کوئی یہی روایت دبی زبان سے بیان کرتا ہے۔ کوئی اس کو حضرت پروانہ کے پروانۂ فکر کا نتیجہ بتاتا ہے۔ کوئی اِس مثنوی کی بدولت نسیم لکھنوی کو اسلام کی دولت سے مالامال کیے دیتا ہے۔ غرضکہ گلزار نسیم مین کتنے ہی عیب کیون نہ ہون مگر اس کے مصنف کے زورِ طبع کا یہ طرفہ اثر ہے کہ

ع ۔ بس ہُمایون مرغ عقل از آشیان انداختہ

پھر سوچتا ہون کہ ممکن ہے کہ ان روایتون کے گھروندے محبت کی بنا پر قائم ہون۔ ان روایتون کے لکھنے والون کا یا بیان کرنے والون کا یہ منشا ہو کہ پنڈت دیاشنکر نسیم کا نام ایسی مثنوی کے ساتھ نہ وابستہ رہے '' جس سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم مین نہین ہین'' اور جس سے لازمی طور پر نسیم مرحوم کی بدنامی متصوّر ہے۔ بیشک مجھکو تعجب ہے تو اس قدر کہ مجھکو جو کچھ اِس مثنوی کی تصنیف و تالیف کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ان روایتون کے خلاف معلوم ہوا۔ حکیم رضا حسین صاحب سہام مرحوم میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور شاگرد بھی تھے اُن کی خدمت مین مجھے برسون نیاز حاصل رہا۔ اور بہت مرتبہ گلزار نسیم کا ذکر بھی آیا۔ اُنھون نے مجھ سے کبھی یہ نہ کہا کہ گلزار نسیم مین آخری تصرف و اختصار کا عمل خواجہ آتش کے قلم سے ہوا تھا۔ یا آتش نے تفنن طبع کے طور پر یہ مثنوی کہکر نسیم کو دیدی تھی بلکہ وہ کہتے تھے کہ میر وزیر علی صبا ہمیشہ ایسی روایتون کی تردید فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گلزار نسیم خاص پنڈت دیاشنکر نسیم کی تصنیف ہے۔ بیشک حسب دستور اس مین کہین کہین آتش کی اصلاحین موجود ہین۔ اور میر وزیر علی صبا پر کیا منحصر ہے۔ تمام سخن شناس اور انصاف پسند اہل اسلام کو اِس سے انکار نہین کہ گلزار نسیم نسیم ہی کی تصنیف ہے۔ بقول اڈیٹر اودھ پنچ '' لکھنو کے

بھنگڑ خانون کے سوا اب یہ روایت کہین نہین سُنی جاتی کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف کی ہوئی مثنوی ہے چنانچہ یہ باتین ملحوظ خاطر رکھ کر مین نے اس روایت کی نسبت صرف اس قدر لکھ دینا کافی سمجھا تھا کہ "سخن شناش جانتے ہین کہ جس رنگ مین گلزار نسیم کہی گئی ہے آتش نے اپنی زندگی مین اس رنگ مین ایک شعر نہین کہا" اِس دلیل کی تردید مین حضرت شرر تحریر فرماتے ہین کہ "غزل اور چیز ہے اور مثنوی اور چیز۔ انسان کی طبیعت جو رنگ غزل مین دکھاتی ہے ضرور نہین کہ وہی رنگ مثنوی مین بھی دکھائے ...... دیوان (آتش کے دیوان) کے رنگ کو پیش کر کے مثنوی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ مسٹر چکبست کو اس کی خبر ہی نہین کہ شاعرانہ مذاق ہر صنعت سخن مین جُداگانہ رنگ دکھایا کرتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہین۔ اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انہین نوعمر شاگرد سے تھی۔ (اِس دلبستگی کی وجہ آپ نے نہ بتلائی) اس کی تحریک سے یا اس کی مشق اولین دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو۔ پھر اس مین متعدد لغزشین دیکھ کے اسے بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو"۔ مجھ کو افسوس ہے کہ حضرت شرر نے شاعرانہ مذاق کی رنگارنگی کی نسبت جو سبق مجھے دیا ہے مین اس کو قبول نہین کر سکتا اور مین کیا جو شخص اصول شاعری سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ میرے ہی خیال کی تائید کریگا۔ یہ یاد رہے کہ شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ ایک ہی ہوتا ہے یہی رنگ مختلف پیرایون مین اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ پیرایے بدلتے رہتے ہین۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہے جس مین اِس کی نورانی طبیعت کا عکس پڑتا ہے۔ آئینے کی ساخت مین تبدیلیان واقع ہو سکتی ہین مگر عکس کی ہیئت نہین بدلتی۔ غزل ہو یا مثنوی ہو یا مسدس ہو۔ ہر پیرائے مین شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً جس شاعر کی طبیعت مین روانی اور آمد ہے

وہ ہر صنفِ سخن مین بھی مذاق نباہیگا۔ اگر اس کے مزاج مین آورد کو دخل ہے تو اس کی غزل ہو یا مثنوی یا مسدس سب مین اسی مذاق کا پتا ملیگا۔ میر کی غزلون مین جو سوز و گداز ہے وہی انکی مثنویون موجود ہے۔ داغ کی غزلون مین جو شوخی اور بیباکی کا رنگ ہے وہی ان کی مثنوی فریادِ داغ کا رنگ خاص ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کی مثنوی اس پائے کی نہ ہو جیسی کہ اس کی غزلین ہین لیکن دونون مین "مذاقِ سخن" کا رنگ ایک ہی ہوگا۔ مثلاً فریادِ داغ کا پایہ داغ کی تصانیف مین ادنی ہے لیکن یہ کوئی نہین کہہ سکتا کہ فریادِ داغ کا مذاق شاعرانہ گلزارِ داغ سے جداگانہ ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص کیا ہے۔ مین جانتا ہون کہ حضرت شرر کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص آمد ہے۔ ان کی زبان سے شعر ایسا نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر۔ برعکس اس کے گلزارِ نسیم مین ہر شعر شروع سے آخر تک آورد کے رنگ مین ڈوبا ہوا ہے۔ جس طرح سنگتراش پتھرون کو تراش کر بت تیار کرتے ہین اسی طرح نسیم نے اپنے تیشۂ فکر کی مدد سے مضامین کے گل بوٹے تراشے ہین جن سے گلزارِ نسیم کی زینت ہے۔ چاہے یہ رنگ برا ہو یا اچھا مگر اس سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ یہی رنگ ان کی غزلون کی گلہائے مضامین سے بھی شبنم کی طرح ٹپکتا ہے۔ مجھ کو سخت حیرت ہے کہ حضرت شرر کے قلم سے ذیل کے الفاظ کس طرح نکلے کہ "مجھے تعجب ہے کہ مصنف (یعنی نسیم) کے دیوان کا انتخاب جو اس مثنوی (گلزارِ نسیم) کے آخر مین چھاپا ہے اس مین بھی اس رنگ (یعنی گلزارِ نسیم کے رنگ) کا کوئی شعر نہین ہے"۔ اس موقع پر مین چند شعر "انتخاب دیوان نسیم" سے تمثیلاً لکھے دیتا ہون۔ سخن شناس خود فیصلہ کرلین گے کہ حضرت شرر کا بیان مندرجہ بالا کس قدر درست ہے۔

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
شوریدگی سے میری یہاں تک وہ تنگ تھے — روٹھا جو میں تو خیر منائی کہ شر گیا

بوئے گل غنچے سے کہتی ہے نسیم — بات نکلی منہ سے افسانہ چلا

چمن میں ہر سے کے آکر میں کیا نہال ہوا — برنگ سبزۂ بیگانہ پائمال ہوا
کہانی کہہ کے سلاتے تھے یار کو سو اب — فسانہ عمر ہوئی خواب وہ خیال ہوا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ — بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

بلبل کے منہ پہ اڑنے لگی ہیں ہوائیاں — صیاد کو بتا کہیں او باغباں ہوا

جلد او ماہ تو گھر سے نکلا — شکر ہے چاند کدھر سے نکلا

مصرعے روشن جو ہوں تو سو سے بہتر ایک شعر — مطلع خورشید کافی ہے پئے دیوان صبح

جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے — بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائیگی

گر یہی ہے اِس گلستان کی ہوا — شاخِ گل اک روز جھونکا کھائیگی
داغ سودا ایک دن دے گا بہار — فصل اس گل کی شگوفہ لائیگی
کچھ تو ہوگا ہجر مین انجام کار — بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائیگی
صندلی رنگون سے مانا دل ملا — دردِ سر کس کے ماتھے جائیگی
خاکسارون سے جو رکھّے گا غبار — او فلک بدلی تری ہو جائیگی

صبر رخصت ہو تو جانے دیجیے — بیقراری آئے تو ٹھہرائیے
دل مین ہی دکھلائیے تاثیرِ عشق — ٹھنڈی سانسون سے انہین گرمائیے

گل ہوا کوئی چراغِ سحری اور بلبل — ہاتھ ملتی ہوئی پتّون سے صبا آتی ہے

جس کو دیکھو وہ اِس زمانے مین — اپنے نزدیک دُور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذرّون پر — روزِ باران نور ہوتا ہے

اس رنگ کے نوتے فی صدی اشعار نسیم کے دیوان مین مل سکتے ہین۔ اِن اشعار مین بھی وہی ترکیب کی چستی، وہی تناسبِ لفظی، وہی آورد کا رنگ چوکھا ہے جو کہ مثنوی کا رنگ خاص ہے۔ آتش کا مذاق شاعرانہ اس رنگ سے اعلیٰ تر ہے لیکن اس سے بالکل جدا گانہ ہے۔ اگر وہ "تفنن طبع" ہی کے طور پر کوئی مثنوی کہتے تو یہ ممکن تھا کہ وہ مثنوی اِس پایے کی نہ ہوتی جیسی کہ ان کی غزلین ہین۔

لیکن اُس مثنوی مین ان کی طبیعت کے رنگ کا ضرور پتا ملتا۔ علاوہ اِس کے یہ کہنا کہ شاعر نے گلزار نسیم کو محض تفنن طبع کے طور پر تصنیف کیا ہے کس قدر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے، جیسا کہ آج کل کوئی شخص کہے کہ جاپان روس سے "تفنن طبع" کے طور پر لڑ رہا ہے۔ قطع نظر ان سب باتون کے اِس مقام پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جو کہ کسی قدر غور طلب ہے یعنی حضرت شرر نے اس مضمون کے ایک حصے مین تو یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ گلزار نسیم مین محض انتخاب و اختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ لیکن آپ ہی صاف الفاظ مین یہ بھی تحریر فرماتے ہین کہ کوئی تعجب کی بات نہین اگر آتش نے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اِس مین متعدد لغزشین دیکھ کے اسے بجاے اپنے نسیم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ یہ دونون دعوے ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہین۔ چونکہ حضرت شرر کے اس مضمون کا رنگ خاص یہی ہے کہ ایک دعوے کی تردید دوسرے دعوے سے کی جائے۔ لہٰذا اس کی نسبت زیادہ لکھنا فضول ہے حضرت شرر کا یہ مقولہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ "شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن مین جداگانہ رنگ دکھاتا ہے" مگر اس قدر ضرور صحیح ہے کہ حضرت موصوف کا مذاق تنقید ہر صفحے پر نیا رنگ دکھاتا ہے۔

دیباچے مین تناسب لفظی کی بحث کے سلسلے مین مین نے اِس بات پر زور دیا تھا کہ صنعت مذکور کا لطافت کے ساتھ نباہنا ایک امر دشوار ہے۔ اور یہ دکھانے کے لیے کہ کس صورت پر تناسب لفظی بجاے حُسن کے عیب ہو جاتا ہے مین نے مثال کے طور پر امانت رند خلیل قلق وغیرہ کا ایک ایک شعر یا مصرع لکھ دیا تھا۔ اِس سلسلے مین گلزار نسیم کے بھی دو ایک شعر لکھ دیے تھے۔ اس بنا پر حضرت شرر تحریر فرماتے ہین کہ "مسٹر چکبست نے امانت رند قلق کا ایک ایک شعر یا مصرع نقل کر کے

سب کی شاعری مین دھبہ لگایا ہے"۔ مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مین ہرگز اس الزام بیجا کا مستحق نہ تھا۔ صرف و نحو کی کتابون مین یا کتب عروض مین اکثر غلطیون کی تشریح کے لئے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر لکھے ہوے ملین گے۔ ان اشعار کے پیش کرنے سے لکھنے والے پر یہ الزام نہین عائد کیا جا سکتا کہ اس کا منشا یہ تھا کہ ان اُستادون کی شاعری مین دھبہ لگایا جائے۔ آخر کسی کے کلام سے تو مثال دینا ہی پڑیگی۔ لہذا ایک صنعت خاص کا ذکر کرتے ہوے اگر مین نے رند، خلیل و قلق وغیرہ کے کلام سے ایک ایک مصرع یا شعر نقل کر دیا تو میری مُراد اس سے یہ نہ تھی کہ مین ان کی شاعری کو بہ حیثیت مجموعی قابل نفرین قرار دون۔ اگر ان مثالون کے پیش کرنے سے کوئی معنی پیدا ہو سکتے ہین تو وہ یہ تھے کہ جہان تک تناسب لفظی کی صنعت کا تعلق ہے رند، خلیل و قلق وغیرہ نسیم کا مقابلہ نہین کر سکتے۔ اگر حضرت شرر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے تو میرے سر منقصت کا الزام نہ دھرتے۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا ست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا ست

بیشک امانت کے لئے مین نے صاف الفاظ مین یہ لکھدیا تھا کہ ان حضرت کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔ حضرت شرر کا یہ خیال نہین ہے۔ آپ کے نزدیک گلزار نسیم کی طرح امانت کے کلام مین بھی ایسے معیوب اشعار جن مین تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن نہ قائم رہی ہو دو فی صدی سے زیادہ نہ نکلین گے۔ اور حضرت موصوف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تناسب لفظی کے نباہنے مین امانت ہی دوسرون سے زیادہ "کامیاب" کلی ہوے ہین۔ مین حضرت کی اس تنقید کی نسبت زیادہ عرض کرنا نہین چاہتا۔ جس شخص نے امانت کا کلام ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت شرر نے امانت کی مدحت سرائی مین جو کچھ تحریر فرمایا،

وہ ایک شاعرانہ مبالغے سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ چند اشعار آمانت کے درج ذیل ہین۔ سخن شناس "تفنن طبع" کے طور پر ملاحظہ فرمائین اور دیکھین کہ آمانت نے تناسب لفظی کی صنعت کو کیا معراج دی ہے۔ ؎

چھوڑون جو کانپور مین وہ زلف حلقہ دار
پھانسی کا حکم چھوٹتے ہی کوتوال دے

دُر دُر کرے صدف کو جو وہ گوہر مُراد
موتی ہر ایک مانت خوشی سے نکال دے

سوراخ در کے بند کرو چھوڑو جھانکنا
روزن تمہارے شرم مین خندق ڈال دے

کھلا تا ہی ہوا اس شعلہ رو کو برف کھانے کی
رقیب روسیہ کو فکر ہے نقشہ جمانے کی

ملائی اُسنے شہنا سے جو دُھن اپنے ترانے کی
ندامت سے بُری نوبت ہوئی نقارخانے کی

سیہ گیسو کو اسکے سانپ پھن کہتی ہے شانے کو
مری طبع رسا کرتی ہے باتین مار کھانے کی

خط بہت بڑھ گیا ہے بنواؤ
گلشن حُسن ہے کہ جنگل ہے

طائر دل کو میرے صدقے کر
بت بے پیر آج منگل ہے

عاشق زلف کیون نہ سر ٹکرائے
مانگ دار اُس پری کی تُکّل ہے

نظم کرتا ہون خط سبز کا وصف
مُرغ مضمون جو ہے وہ ہریل ہے

اسے کہتے ہین تکلف اسے نازک طبعی
گھاس کے تھان[1] پہ اس شوخ نے گھوڑا باندھا

---

[1] ایک قسم کا کپڑا۔

ہنس کے خیاط کو چڑیا کا بنایا اُس نے　　　بند انگیا کا کم و بیش جو پایا اُس نے

مین قدردانانِ امانت کا مشکور ہونگا اگر وہ امانت کے دیوان مین دو فی صدی شعر بھی ایسے نکال دین جن مین تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن بھی قائم رہی ہو۔ یون دعوائے بے دلیل کرنا تو بہت آسان ہے حضرت شرر نے مجھ کو اس بات کا بھی ملزم ٹھہرایا ہے کہ مین نے جو نسیم کے معرکے لکھے ہین اُن کے پردے مین "لکھنؤ کے بعض مشہور و معروف و مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش" کی ہے مین نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن بزرگون کی شہادت پر لکھا ہے جو نسیم کے ساتھ مشاعرون مین شریک تھے اور جن کے سامنے یہ معرکے پیش آئے۔ اگر حضرتِ شرر کو اس مین شک ہو تو یہ اُن کا حسن ظن ہے۔ اور چونکہ اس بحث سے اور نفس مضمون سے زیادہ تعلق نہین لہذا مین اس کی نسبت زیادہ عرض کرنا نہین چاہتا۔

حضرت شرر نے مجھ غریب پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ بجائے مولوی حالی کے اعتراضات کا جواب دینے کے میرا فرض یہ تھا کہ گلزار نسیم کے اُن عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتا جن پر عام اہلِ سخن معترض ہین اور جن کا اس وقت تک جواب نہین دیا گیا ہے"۔ اس اعتراض کی نسبت مین یہ عرض کرونگا کہ مولانا حالی کے اعتراضات چاہے واجب ہون یا غیر واجب اُنھون نے اُن کو نقادانِ سخن کے سامنے تحریری حیثیت مین پیش کیا ہے۔ لہذا اعتراضاتِ مذکور سے ہر شخص پورے طور سے واقف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اعتراضات میری نظر سے بھی گذرے اور جو کچھ میری سمجھ مین آیا مین نے اُن کی نسبت لکھا بھی۔ علاوہ ان اعتراضات کے اور ایسے اعتراضات گلزار نسیم پر میری نظر سے نہین گذرے جو کسی مستند شخص کی طرف سے پیش کئے گئے ہون جو اعتراضات حضرت شرر نے اساتذۂ لکھنؤ کا وکیل بن کر پیش کئے ہین اُن کی نسبت مین صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتا ہون کہ ان اعتراضات سے اساتذہ

لکھنؤ کا دامن آلودہ کرنا سخت بیرحمی ہے۔ میرے خیال مین کوئی لکھنؤ کا رہنے والا جس کو شعر وسخن کا مذاق ہے اور جس نے گلزارنسیم کے علاوہ اور شعرائے اُردو کا کلام بھی پڑھا ہے اس کے قلم سے ایسے اعتراضات نکل ہی نہین سکتے ہین۔ چنانچہ انہین اعتراضات کے متعلق ۱۱ رمئی کے "اودھ پنچ" مین لکھنؤ کے مستند اور مسلم الثبوت زبان دان منشی سجاد حسین صاحب تحریر فرماتے ہین کہ "ہمارے خیال مین اساتذہ لکھنؤ کی اس سے بڑھ کر ذلت نہین ہو سکتی کہ ان کی جانب یہ اعتراض (یعنی حضرت شرر کے اعتراض) منسوب کئے جائین۔ جن سے فارسی محاورون سے عموماً اور لکھنؤ کی زبان و شاعری سے خصوصاً عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔" اگر حضرت شرر خود غور سے کام لین تو وہ یہ دیکھ سکتے ہین کہ اساتذہ لکھنؤ کی جانب یہ اعتراض منسوب کرنا کہ نسیم نے "حیا اُٹھا کر" خلاف محاورہ نظم کیا ہے۔ "پردۂ حیا اُٹھا کر" چاہیئے ایسا فعل ہے کہ جس سے جرأت کا تو ضرور اظہار ہوتا ہے مگر دور اندیشی کا نہین۔ یا یہ کہنا کہ "وہ تجھ پاس" کہان کی زبان ہے اور پھر کہنا کہ یہ اعتراض اساتذہ لکھنؤ کی جانب سے ہے، لکھنؤ کو بدنام کرنا ہے۔ مجھکو خود اکثر اساتذہ لکھنؤ کی خدمت مین باریابی حاصل ہے مین نے ان کی زبان سے کبھی ایسے اعتراضات نہین سنے۔ اب رہے اُن حضرات کے اعتراضات جو گلزارنسیم پر اعتراض کرنا ثواب سمجھتے ہین۔ وہ اکثر میرے گوش گزار ہوتے رہے۔ مگر ان کے جواب مین کسی فارسی اُستاد کا یہ شعر دل ہی دل مین پڑھ لیا کرتا ہون۔ ؎

بسیار زخمہاست کہ خاک است مرہمش

نتوان بہ رشتہ دوخت دہانِ دریدہ را

ایسے اعتراضات کا کسی سنجیدہ تحریر مین ذکر کرنا حماقت ہے اور ایسی حماقت ہے کہ جس کی کبھی انتہا نہین

ہوسکتی۔ اسی خیال سے مین نے محض مولانا حالی کے اعتراضات کا ذکر کرنے پر قناعت کی۔ اَبْ چونکہ حضرت شرر نے اپنے رسالے مین چند اعتراضات پیش کئے ہین۔ ان کی نسبت آگے چل کر مین جو کچھ میری سمجھ مین آئے گا لکھونگا۔

اِس مضمون کے آخری حصّے مین حضرت شرر فرماتے ہین کہ " گلزار نسیم مین ایسے اشعار بہت ہین جن کی بنا پر صرف یہی نہین کہا جاتا کہ نسیم کی زبان مین غلطیان ہین بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم زبان پر آتنی حکومت نہین رکھتے کہ ہر ایسے مضمون کو جو خیال مین آئے ادا کر جاتے ہین"۔ اِس سلسلے مین حضرت موصوف فرماتے ہین کہ ان کا مقصد گلزار نسیم پر اعتراضات پیش کرنے سے یہ ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کردیا جائے کہ گلزار نسیم مین اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیان ہین اور اس مثنوی کی زبان اہل لکھنؤ کی زبان نہین ہے"۔ اِس اعلان کی نسبت دو امور دریافت طلب ہین۔ اوّلاً یہ کہ یہ اعلان حضرت شرر کے پہلے مضمون کے اس حصّے کی تردید کرتا ہے جس مین آپ نے اس امر کا اقرار کر لیا ہے کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان ہے۔ یعنی میرے دیباچے پر رائے زنی کرتے ہوئے حضرت شرر تحریر فرماتے ہین کہ " گلزار نسیم کے اختصار، اس کی ترکیبون کی پختگی، کلام کی روانی اور سادگی اور پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے بہت صحیح ہے بلکہ اس سے بڑھ سکے ہے۔ (دلگداز بابت مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۵) اِس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ مین نے لکھا ہے اِس سے حضرت شرر کو پورا اتفاق ہے۔ بلکہ آپ لکھتے تو اس سے کچھ زیادہ ہی لکھتے۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ " پاکیزگی زبان" کی نسبت مین نے کیا لکھا ہے۔ دیباچے کے بارہوین صفحے پر حاشیے پر " پاکیزگی زبان " کی سُرخی قائم کرکے گلزار نسیم کی زبان کے متعلق صاف الفاظ مین

ہیں نے یہ لکھا ہے کہ نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہیئے"۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شرر نے پیشتر نسیم کی زباندانی کو کیوں تسلیم کیا اور پھر اپنے ہی بیان کی تردید اس زور شور سے کیوں کی۔ دوسرا سوال اس اعلان کی نسبت یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیشتر حضرت شرر اپنا عقیدہ یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کے اصلی مسودے کے ورق نہایت ہی عام مذاق کے تھے اور جو کچھ محاسن اس مثنوی میں پیدا ہوئے وہ اس سبب سے ہوئے کہ انتخاب و اختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ یا یہ کہ حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کے مطابق آتش نے یہ مثنوی خود تفنن طبع کے طور پر کہی اور پھر اس کے اشعار میں متعدد لغزشیں دیکھ کر نسیم کو دیدی۔ گویا نسیم سے اور اس کی تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں عقل سلیم یہ کیونکر قبول کر سکتی ہے کہ گلزار نسیم کی زبان اہل لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ چاہے خواجہ آتش نے اس مثنوی کی اصلاح میں آخری انتخاب و تصرف کی زحمت اپنے سر لی یا حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کی رو سے آتش نے خود یہ مثنوی "تفنن طبع" کے طور پر کہی اور پھر نسیم کو دیدی۔ ان دونوں صورتوں میں اس مثنوی کی ترتیب دینے میں آتش نے اس قدر غور و فکر سے ضرور کام لیا کہ اس میں ایسے محاسن پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے حضرت شرر بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ باعتبار خوبیوں کے گلزار نسیم کے مقابل کے دو ہی چار نظمیں اردو میں نکلینگی۔ اس حالت میں گلزار نسیم میں ایسے شعر کہاں سے آ گئے جن کی نسبت آج حضرت شرر تک کو یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ ان کی زبان نہایت ہی مبتذل اور بازاری زبان ہے اور بازار بھی کہیں اور کا لکھنؤ کا نہیں۔ یہ ممکن تھا کہ آتش کے اور کلام کے مقابلے میں یہ مثنوی پھیکی ہوتی۔ مگر جہاں تک زبان کا تعلق ہے ضرور مستند

خیال کی جاتی - آتش کی بہت سی غزلین ہین جن مین ایک شعر بھی قابل تعریف نہین ہے یا بہت سے شعر مہمل ہین - ان غزلون کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے انہین محض "تفنن طبع" کے طور پر تصنیف کیا ہوگا یعنی زیادہ غور و فکر سے کام نہ لیا ہوگا - مگر با این ہمہ یہ مہمل شعر بھی زبان کی بحث مین اسی وثوق کے ساتھ سند کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہین جیسے کہ آتش کے اعلیٰ سے اعلیٰ شعر - ان اشعار مین شاعری کے اور جوہر نہون لیکن ان کی زبان کی نسبت یہ کوئی نہین کہہ سکتا ہے کہ "مبتذل بازاری زبان ہے اور بازاری زبان بھی کہین اور کی لکھنؤ کی نہین" - مثلاً اگر یہ بحث در پیش ہو کہ آیا "حلال کرنا" لکھنؤ کا محاورہ ہے کہ نہین - تو آتش کا ذیل کا شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے - ع

آتی جو عید قربان خنجر کو لال کرتے
دُنبے کے بدلے فربہ عاشق حلال کرتے

اس شعر مین چاہے اور صدہا عیوب ہون مگر اس کی زبان مستند ہے کیونکہ یہ شعر آتش کا ہے - افسوس ہے کہ حضرت شرر نے اس پہلو پر غور نہین کیا کہ کوشش تو یہ ثابت کرنے کی کر رہے ہین کہ گلزار نسیم مین نسیم کا کلام برائے نام ہے یا برابر نہ ہونے کے ہے اور جو کچھ اس کو فروغ حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یا تو اس پر آتش کی زبردست اصلاح ہے یا آتش نے خود اسے "تفنن طبع" کے طور پر تصنیف کیا ہو اور پھر یہ اعلان بھی شایع کرتے ہین کہ "گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہین ہے" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آتش نے نہ اس کی اصلاح مین غور و فکر سے کام لیا ہے نہ وہ اس کے مصنف ہو سکتے ہین - حضرت شرر کی اس تنقید پر "ما چہ می سرائیم و طنبورہ ما چہ می سراید" کی مثل صادق آتی ہے کیا حیرت کا مقام ہے کہ حضرت شرر کا طائر خیال ایک شاخ پر ٹھیرتا ہی نہین - شروع سے آخر تک کل مضمون

متضاد بیانات سے پُر ہے جن کی وجہ سے حضرت موصوف کے دلائل کا سلسلہ تارِ عنکبوت سے زیادہ مضبوط نہین نظر آتا جس وقت آپ کا خیال گلزارِ نسیم کے محاسن کی طرف جاتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہین کہ اس مثنوی کا بہترین حصہ آتش کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے اور اپنے دعوے کی تقویت کے لئے نقادانِ سخن کے دربار مین اُن بزرگون کی شہادت پیش کرتے ہین جو موت کی میٹھی نیند سو رہے ہین اور جن کو اس بات کی مطلق خبر نہین کہ آج اُن کے نسبت کیا کہا جا رہا ہے۔ جب حضرت شرر کو گلزارِ نسیم مین معائب تلاش کرنے کی فکر ہوتی ہے تو اُس وقت آپ یہ فرض کر لیتے ہین کہ یہ نسیم کی تصنیف ہے اور اس لئے اس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہین ہے، اس سے صرف ایک ہی منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ چالیس پچاس شعر جو حضرت شرر کے نزدیک قابل اعتراض ہین وہ تو نسیم کے ہین باقی ڈیڑھ ہزار شعر آتش کے ہین۔

اصل تو یہ ہے کہ اکثر حضرات کا خیال یہ ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم ہندو تھے۔ اِس لئے ان کی زبان مستند نہین ہے۔ گو کہ حضرت شرر نے کسی مصلحت سے اِس خیال کو جلبابِ خفا مین رکھا ہے مگر آپ کے ”اعلان“ کے پردے مین اِس کی جھلک صاف نظر آتی ہے مگر اس خیال کے لوگون کو اِس امر پر غور کر لینا چاہئے کہ نسیم کے وقت کا لکھنؤ وہ لکھنؤ تھا کہ جس کا ذرہ ذرہ تہذیب و تربیت کے نور سے معمور تھا۔ بقول امیر احمد صاحب بی اے کے اِس زمانے مین ”لکھنؤ مین شاعری اور سخن سنجی کا وہ دریائے مواج جوش زن تھا اور زباندانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اسکی دلکش سیرگاہون، اِس کے دلچسپ منظرون اور اس کے دل فریب میلون ٹھیلون کی بہار دیکھنا بھی انسان کو تہذیب سکھانے اور شاعر بنانے کے لئے کافی تھا“ اور پھر نسیم کی ایک خاص حالت

تھی۔ ایک تو وہ خود ہی قدرتی طور پر غیر معمولی طور سے ذہین اور طباع شخص تھے۔ دوسرے ان کا تمام وقت آتش و صبا وغیرہ ایسے زباں دانوں کی صحبت میں صرف ہوتا تھا جن کی زبان آج تک محاورۂ اردو کی دستاویز اول سمجھی جاتی ہے قطع نظر اس کے یہ سب جانتے ہیں کہ گلزار نسیم آتش کی اصلاح کے بعد ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ اس صورت میں یہ کہنا کہ چونکہ گلزار نسیم کا مصنف ہندو تھا اس لئے اس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہے جس مشاعرے میں یہ مثنوی رات بھر پڑھی گئی وہ مشاعرہ آتش ہی کے نام سے کیا گیا تھا لہذا اس میں شہر کے تمام سربرآوردہ شعراء جمع تھے۔ اکثر بزرگ ابھی زندہ ہیں جو اس مشاعرے میں شریک تھے۔ کیا ایسا مشاعرہ کرنے سے آتش کی مراد یہ تھی کہ سخن سنجان لکھنؤ کے سامنے اپنے شاگرد سے ایسی مثنوی پڑھوا کر اپنی ہنسی کرائیں جس میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ شاید کسی اردو نظم میں نہ ہونگی۔ اور جس میں اکثر ایسے شعر موجود ہیں" جن کی زبان لکھنؤ کی بازاری زبان بھی نہیں ہے" یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے راسخ الخیال از نصف مزاج اہل اسلام گلزار نسیم کی زبان کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھتے ہیں۔ حضرت شرر نے جو یہ اعلان شائع کیا ہے کہ "گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے" وہ کس قدر بے سود شائع ہوا ہے کیونکہ اس اعلان کی اشاعت کے قبل اساتذہ لکھنؤ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر منشی امیر صاحب مینائی نے امیر اللغات میں زبان و محاورے کی بحث میں گلزار نسیم کے سیکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اب اس سے بڑھ کر گلزار نسیم کی زبان کے مستند ہونے کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ لغت میں اسی شاعر کا کلام سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت شرر امیر مرحوم کو ان عام اساتذہ لکھنؤ کے زمرے سے خارج نہ سمجھتے ہونگے جن کا وکیل بن کر آپ نے

یہ اعلان شایع کیا ہے کہ "گلزارِ نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے" علاوہ امیر مرحوم کے
لکھنؤ کے سرمایۂ ناز انشا پرداز اور مسلم الثبوت زباندان منشی سجاد حسین صاحب نے حضرت شرر کے اعلان
مذکور کی نسبت جو کچھ ارشی سے اودھ پنچ میں لکھا ہے وہ شائقینِ سخن کی نظر سے گذرا ہی ہوگا۔ اصل
یہ ہے کہ گلزارِ نسیم کی زبان کو غیر مستند ثابت کرنے کا زمانہ گذر گیا۔ اب تو اس کے سیکڑوں شعر زبان
اردو کا حصہ ہو گئے ہیں اور زباندان اس کی زبان کو مستند تسلیم کر چکے ہیں۔ اب اگر کسی کا دل چاہے
تو وہ یہ خیال کر کے اپنا دل خوش کر لے کہ یہ مثنوی نسیم کی کہی ہوئی نہیں ہے اور اگر قلم میں زور ہو تو اس
دعوے کی تائید میں دلائل بھی پیش کرے۔ اور میرے خیال میں قدردانانِ نسیم کو ایسے مضامین سے ناخوش
نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو یہ مان لینے کو تیار ہوں کہ نسیم لکھنوی کا اس عالمِ ایجاد میں وجود ہی نہیں ہوا
تھا۔ "پنڈت دیا شنکر نسیم" محض ایک اسم فرضی ہے۔ یہ مثنوی کسی بندۂ خدا کی تصنیف ہے جس نے اسکو
اس فرضی نام سے شایع کر دیا۔ اب یہ بندۂ خدا چاہے آتش ہو یا پروانہ یا مصحفی۔ (اگر منشی سجاد حسین
اڈیٹر اودھ پنچ کے مستند راوی کی روایت صحیح ہے) یا کوئی اور شخص ہو جو مشرف بہ اسلام تھا۔ مجھ کو تو
مثنوی گلزارِ نسیم سے مطلب ہے نہ اس کے مصنف کے مذہب سے۔ ہاں اگر "گلزارِ نسیم" میں لفظ نسیم کھٹکتا
ہو تو اس کو "قصۂ گل بکاؤلی منظوم" کہو۔ مگر خدا کے لئے اس کے جوہروں پر تو خاک نہ ڈالو۔

خاص اعتراضات سے متعلق کچھ تحریر کرنے سے پیشتر یہ لکھ دینا مناسب ہے کہ اس مضمون میں
انھیں شعرا[1] کے کلام سے مثالیں دی گئی ہیں جن کے اشعار امیر اللغات اور بہار ہند[2] میں بھی زبان اور محاورے

---

[1] آتش، ناسخ، صبا، رند، واجد علی شاہ (اختر)، انیس، جان صاحب، نواب مرزا شوق، محمد حسین آزاد، (مصنف آب حیات) وغیرہ
[2] حضرت شرر کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ صاحب امیر اللغات کی طرح مولف بہار ہند نے بھی پنڈت دیا شنکر نسیم کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے ہیں۔

کی بحث میں سند کے طور پر پیش کیے گئے ہین۔

حضرت اثر نے گلزار نسیم کے اکثر اشعار کو بے معنی قرار دیا ہے۔ ایسے اشعار سلسلے وار لکھے جاتے ہین۔

ع صاد آنکھون کی دیکھ کر پسر کی — بینائی کے چہرے پہ نظر کی

اعتراض ہے کہ بینائی کے چہرے پر نظر کرنے سے کیا مراد ہے؟

"چہرے پر نظر کرنا" شاہی دفاتر کی اصطلاح ہے۔ "چہرہ" "نام" کے معنی مین استعمال ہوتا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ جس شخص کا نام دفتر مین لکھا جاتا تھا اسی کے ساتھ اس کا خط وخال بھی لکھ لیا جاتا تھا۔ "نظر کرنا" دوسری اصطلاح ہے۔ اگر کسی شخص کا نام دفتر سے کاٹ دیا جاتا تھا تو اصطلاحاً یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے چہرے پر نظر کر دی گئی۔ اب

"بینائی کے چہرے پر نظر کی"

کے معنی صاف ہین یعنی "بینائی کا چہرہ کاٹ دیا گیا" جس کا مطلب سادہ الفاظ مین یہ ہوا کہ بینائی کو کھو دیا

نسیم کے علاوہ مختلف شعرائے اردو نے اس اصطلاح کو نظم کیا ہے۔

خواجہ وزیر — نرگس پہ نظر کیجیے دوبارا کہ وہ کٹ جائے — ہو جائے نظر ثانی مین اس کی نظری آنکھ

آتش — قلم نے چہرے حسینون کے لوح پر لکھ کر — کچھ ادن کو کیا خط وخال سے واقف

پھر آئے رنگ رفتہ جو رخ پر عجب نہین — اکثر ہے چہرہ نظر سے بحال ہو گیا

صبا بر طرف غم کر دیا دکھلا کے اُس نے صاد چشم   چہرۂ عشاق کو حکم بحالی ہو گیا

غیاث اللغات صفحہ ۴۸۴ "نظری - آنچہ بدان نظر کنند و منظور نبود۔ لفظ نظر برائے ابطال باشد این اصطلاح اہل دفتر است"۔ مجھ کو حیرت ہے کہ حضرت شرر نے ایک عام اصطلاح سے کیوں ایسی بے خبری ظاہر کی اور گلزار نسیم کی ایک لاجواب فرد کو کیوں نظری بنا دیا۔

شعر اک بلی جو جھپٹی چوہے کو بھانپ
نیولے کو بھگا دیا دکھا سانپ

اعتراض ہے کہ "سانپ کو نیولا مار ڈالتا ہے مگر یہ "دکھا سانپ" کیا۔ آخر نیولے نے مداری کا تماشہ کیوں دکھایا۔" اگر بفرض محال یہ اعتراض تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی گلزار نسیم کا مصنف اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ نسیم نے محض "گل بکاؤلی" کا قصہ نظم کر دیا ہے جو کہ پیشتر نثر میں موجود تھا۔ اگر یہ اعتراض ہے تو اس غریب پر جس نے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نسیم نے تو شروع ہی میں کہہ دیا ہے۔

ہر چند سنا گیا ہے اس کو   اُردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر ہے داد نظم دوں میں   اس مے کو دو آتشہ کروں میں

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت شرر کا یہ اعتراض کسی حالت میں جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس شعر کے بعد دوسرے شعر کا پہلا مصرع۔ ع "دیکھا تو یہ ہے شگون نرالا" اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ مصنف قصہ نے اس واقعے کو خود "نرالا" یعنی حیرت انگیز مانا ہے یعنی وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ "نیولے کا سانپ دکھانا" خلاف واقعات ہے پس اس حالت میں سیاق کلا

نظر انداز کر کے درمیان سے ایک شعر چن لینا اور اس پر اعتراض کرنا آئین تنقید کے خلاف ہے اور لفظی شعبدہ پردازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

شعر — سن کے قیدی کے زار نالے
زنجیر کے پیچ سے نکالے

اعتراض ہے کہ رونا کہ زنجیر کے پیچ نکال ڈالے۔ مگر اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ بکاؤلی کے پاؤں میں سے زنجیر نکال لی؟ صحیح یہ ہے کہ شعر یوں ہے۔

سن کے قیدی کی زار نالی — زنجیر کے پیچ سے نکالی

"زار نالی" چاہے غلط ہو مگر مصنف نے اس سے رونے دھونے کے معنے لئے ہیں۔"

یائے معروف کے بدلے یائے مجہول یا اس کے برعکس لکھ دینا کاتبوں کی عام غلطی ہے

چنانچہ شعر بھی کاتب کی یہی اصلاح کا رہین ہے واقعی اصل شعر یوں ہے۔

سن کے قیدی کی زار نالی — زنجیر کے پیچ سے نکالی

چونکہ اس حالت میں حضرت شعر دلی زبان سے فرماتے ہیں کہ "زار نالی چاہے غلط ہو" اس لئے حضرت موصوف کے اطمینان کے لئے ذیل کی مثالیں غالباً کافی ہوں گی۔

میر۔ درد و الم ہی میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں — دل اک شکستہ سے یاں میں شب زار نالیاں ہیں

نثر۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی۔ افسردہ دلی ...... کے مضامین کو خوب ادا کیا

(آب حیات مصنفہ آزاد)

شعر — واں پھانس کھینچتی ہے اس کو قمری — یاں سانس [illegible] کی

اعتراض ہے کہ "ایک دم کی سانس تھمنا ایسا محاورہ ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔"
مجھ کو اس اعتراض کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس مصرع (یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی) کے معنی چشمۂ آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئیں تو نسیم کا گناہ نہیں۔ غالباً حضرت شرر نے اس مصرع میں "دم" سے بھی "سانس" مراد لی ہے۔ اس صورت میں واقعی "یاں سانس نہیں ہے ایک سانس کی" کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے لیکن "دم" یہاں لمحے یا لحظے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نسیم کا یہ مطلب ہے کہ "یاں ایک لمحے کی سانس نہیں باقی ہے یعنی موت کا وقت قریب ہے۔" ممکن ہے حضرت شرر کہیں کہ "دم" سے لمحے کے معنی لینا کہاں کی زبان ہے۔ اس لئے اشعار ذیل سنداً درج ہیں۔

آتش۔ سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں — غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا
ناسخ۔ ایک دم فرصت نہیں مجھ کو بتوں کی یاد سے — کہتے ہیں زاہد خدا کی یاد ہر دم چاہئے

شعر: چاہا انگلیوں کا امتحان لے
پوچھا کہ نگیں جو ہے کہاں سے

اعتراض ہے کہ "جب تک کسی خاص نگین کو دکھا کے پوچھا نہ جائے کہ اس نگین کو لے تو کہاں سے لے اس وقت تک اس عام سوال کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے" اس مقام پر بھی حضرت شرر نے سیاق کلام پر غور نہیں فرمایا ورنہ آپ کو اس اعتراض کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی۔ بکاولی نے (فرخ کے قصے میں) یہ سوال ایک مبہم طریقے پر پیش کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ان چاروں شہزادوں میں سے کوئی اس کا نگین ہوگا تو وہ اس کی انگوٹھی کو اپنے پاس رکھتا ہوگا لہذا

ممکن ہے کہ اس کی زبان سے نکل جائے کہ اگر نگین لینا ہو تو بکاؤلی کی انگوٹھی کا نگین لے۔ اگر ایسا نہ ہوا یعنی ان چاروں شہزادوں میں کوئی اس کا گلچین نہ ہوا تو اس عام سوال کا ایک عام جواب بھی مل جائے گا کہ نگین خریدے تو فلاں شہر میں خریدے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ؎

بتلانے لگے وہ چاروں ناداں
کوئی یمن اور کوئی بدخشاں

اس جواب سے بکاؤلی نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان میں سے اس کا گلچین کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ

جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے — خاتم کے نگیں بتائے ہوتے

؎ رکنا ہوا اس پری کا مشکل
یہ دل لگی اب لگانے کی دل

اعتراض ہے کہ "مصنف تو یہ مضمون ادا کرنا چاہتا ہے کہ اس پری (روح افزا) کے ٹھہر جانے سے دشواریاں پیش آئیں مگر زبان پر قدرت نہ ہونے سے مطلب یہ ہوگیا کہ اس کا ٹھہرنا مشکل ہوا یعنی ٹھہر نہ سکی۔"

حضرت شرر کا غالباً یہ خیال ہے کہ "مشکل" سے صرف کسی امر کا غیر ممکن ہونا مراد لیا جاتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ لفظ "مشکل" سے وہ حالت بھی مراد لی جاتی ہے جس سے بحیثیت مجموعی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے جیسا کہ خواجہ حافظ کے ذیل کے مصرع سے ثابت ہے۔ ع

مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینیم

ظاہر ہے کہ اس مصرع میں "ہر روز بتر دیدن" جس حالت کا اشارہ کرتا ہے وہ حالت

"مشکل" ہے یعنی باعث پیچیدگی ہے۔ اسی طرح نسیم کا مطلب ہے کہ اس پری کا رکنا باعث پیچیدگی ہوا۔ عام گفتگو میں بھی لفظ مشکل اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ "اگر وہ چلے جاتے تو سب بات بن گئی تھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ رک گئے"۔ چونکہ زبان کا رنگ بدل گیا ہے لہٰذا نسیم کے مصرع کی بندش اس زمانے میں کسی قدر الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن نسیم کے زمانے میں اس قسم کی ترکیب جائز سمجھی جاتی تھی۔ آتش کا شعر ہے ؎

عشق نے حال کیا مردہ بے وارث کا　　　میرے اوپر ہو یقین قبضہ سلطان ہونا

اس شعر میں "یقین" کا لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جیسے کہ نسیم کے شعر میں "مشکل" کا لفظ۔ اب اس ترکیب متروک سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آتش و نسیم کو زبان پر قدرت نہ تھی انصاف کا خون کرنا ہے۔ میر حسن کا شعر ہے ؎

جو اس کے طویلے کے ادنیٰ تھے خر　　　انھیں نعلبندی میں ملتا تھا زر

اس شعر کا مطلب تو یہ ہے کہ نعلبندوں کو اجرت میں زر ملتا تھا لیکن زبان کا رنگ بدل جانے سے اب یہ معنی نظر آتے ہیں کہ خروں کو زر ملتا تھا۔ اس بنا پر اگر کوئی کہے کہ میر حسن کو زبان پر قدرت نہیں تھی تو اس کا جواب سوائے خاموشی کے کیا ہے۔

شعر　　شہزادے نے ایک دن پکڑ کر
　　　شادی کو کہا حیا اٹھا کر

اعتراض ہے کہ "پردہ حیا اٹھا کر" کی جگہ "اٹھا کر" نظم تو کر دیا گیا ہے مگر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ اعتراض کسی قدر تشریح طلب ہے۔ لکھنؤ اور دہلی میں تو اس قسم کے فقرے زبان زد

عام ہیں کہ فلاں شخص نے حیا اُٹھا دی یا فلاں شخص کی حیا اُٹھ گئی - چنانچہ لکھنؤ کے مستند اہلِ زبان مرزا محمد مرتضیٰ عاشق (عرف مرزا مچھو بیگ) شاگرد جناب نسیم دہلوی نے اپنے مشہور لغت بہارِ ہند میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ "حیا اُٹھانا" بے حجابی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - (بہارِ ہند مطبوعہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۶۶)

"حیا اُٹھانا" پر کیا موقوف ہے "حیا اُڑا دینا" "حیا اُٹھ جانا" "آنکھوں سے حیا ٹپکنا" وغیرہ بولا بھی جاتا ہے اور نظم بھی ہوتا آیا ہے - اس موقع پر مجھے مومن خاں کا ایک شعر یاد آگیا۔

؎ آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

حضرتِ شرر کے خیال کے مطابق "شیرہ حیا ٹپکے" ہونا چاہیے - محض "حیا ٹپکنا" کوئی معنی نہیں رکھتا -

شعر ۔ وحشت چہ پسند مہ لقا ہے

اعتراض ہے کہ "حرف ترکیب کی خرابی نے مطلب خبط کر دیا - کہنا یہ تھا کہ مہ لقا کو وحشت چہ پسند ہے"

جس شخص کی نظر سے گلزارِ نسیم کے علاوہ کسی اور شاعر کا کلام بھی گذرا ہے وہ اس اعتراض کی وقعت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے - ہر زبان کی شاعری میں ترتیبِ الفاظ میں اس قسم کا الٹ پھیر جائز سمجھا گیا ہے - اردو شعرا کے کلام میں بھی اس طرز کی سیکڑوں بندشیں مل جائیں گی چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں - آتش -

[illegible] — یاد آتی رہے کو شبِ ہجر ادا آتی ہے

دم اخیر تصور بندھا ترے رخ کا — طرف کو کعبے کے کروٹ مجھے قضا نے دی

ناسخ

ہماری آنکھ سے دریائے اشک جاری ہے — خیال ہے تجھے بازو کی یار مچھلی کا

ذبح وہ کرتا ہے پر یہ چاہیے اے مرغ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر جلاد کا

ان اعتراضات کے بعد حضرت شرر نے گلزار نسیم کے دو اشعار لکھے ہیں جن میں آپ کے نزدیک لفظی غلطیاں ہیں۔

ہو لاکھ چکھوں گا میں انسان
پیڑے سے چکھے پان کے مزیدار

اعتراض یہ ہے کہ ناسخ و آتش کے زمانے سے لے کے اس وقت تک "چکھونگا" اور "چکھے" کی جگہ "چکھونگا" اور "چکھے" غیر فصیح ہی نہیں غلط ہے۔

میں حضرت شرر سے نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ اس موقع پر آپ نے لفظ "غلط" کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سودا وغیرہ نے "چکھنا" کی جگہ "چکھنا" برابر نظم کیا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نسیم کے طبقے کے شعرا نے "چکھنا" نہیں نظم کیا ہے۔ اس صورت میں نسیم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسا قدیم تھا وہ نظم کیا جو ان کے زمانے

سودا — چکھوا نہوں سے تجھ اسے یار دوستی کا شہد / جاتا ہے زہر کر ہوئی اک کم میں اس میں

وہ تلخ کام کبھی زہر دشمناں نہ کرے / نمک سے اشک کے جس چشم نے مزا نہ چکھا

مین غیر فصیح سمجھا جاتا تھا اور ایسا کرنا کوئی تعجب کی بات نہین ۔ مثلاً شیخ ناسخ نے سودا و میر کی طرح لفظ "زور" بہت کے معنی مین استعمال کیا ہےعـ۵ ۔ آتش نے اِس محاورۂ قدیم کو متروک قرار دیا ہے ۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ نے ایک غیر فصیح محاورہ نظم کیا ۔ لیکن یہ کہنا کہ لفظ "زور" کو بہت کے معنون مین استعمال کرنا غلط ہے کوئی معنی نہین رکھتا ۔

خیر اِس اعتراض سے زیادہ مزیدار اعتراض حضرت شرر کا پان کے "بیڑے" پر ہے آپ فرماتے ہین کہ "دوسرے مصرع (بیڑے چکھے پان کے مزیدار) مین صرف بیڑے کافی تھا "پان کے بیڑے" محاورے مین اچھا نہین" ۔ اِس اعتراض کا انصاف بھی مین سخن شناسون پر چھوڑتا ہون ۔ دو شعر درج ذیل ہین ۔ ناظرین "تفنن طبع" کے طور پر ملاحظہ فرمائین ۔

جان صاحب

چھنگلی مری کھائے گی ہے پان کا بیڑہ
منجھلی کا نہ سنجھلی کا نہ ہے بیاہ بڑی کا

امیر مینائی

بسملون کی دم رخصت کے مدارات ضرور
ہار بیڑا تری تلوار مین ہو پانون کا

علاوہ برین شرفائے لکھنؤ مین یہ فقرہ مثل کے طور پر بولا جاتا ہے کہ "ایسی شادی ہوئی کہ کسی کو پان کا بیڑا بھی نہ ملا" ۔ غالباً حضرت شرر کو آتش کی اصلاح دیکھ کر یہ اعتراض کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ مگر آپ کو اس امر پر بھی غور کر لینا تھا کہ نسیم نے جو یہ اصلاح نہ مانی تو کچھ سمجھ کر نہ مانی ہوگی اور آتش ایسے نازک مزاج شخص نے اپنے شاگرد کا یہ اختلاف گوارا کیا تو کوئی وجہ معقول ضرور رہی ہوگی ۔

عـ۵ ؎ اب تو ناسخ زور رندیلا او باش ہو گیا

کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا (۱)

وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی (۲)

اعتراض ہے کہ "ان مصرعوں میں "حَمْل" کی جگہ "حَمَل" نظم کر دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے"۔ یہ اعتراض اس اصول سے بے خبری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہل زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ محض لغت کے تلفظ کی پیروی شاعر کے لئے ضروری نہیں ہوتی۔ یہ مانا کہ لغت کی رو سے حَمْل درست ہے لیکن شرفائے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی تلفظ جاری ہے۔

واجد علی شاہ (آخری فرمانروائے اودھ) سے ایک مثنوی موسوم بہ "دریائے تعشق" یادگار ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ "گلزار نسیم" کے زمانے سے بہت قریب ہے "دریائے تعشق" میں بھی حَمَل ہی نظم ہے۔ ؎

گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار — آثار حمل کے ہیں نمودار

اس مثنوی میں چاہے اور شاعرانہ محاسن نہوں لیکن جہاں تک زبان اور محاورے کا تعلق ہے اس کا ہر شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں واجد علی شاہ سے بڑھکر کس کی زبان مستند ہو سکتی تھی۔ علاوہ بریں جان صاحب نے بھی "حَمَل" نظم کیا ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے۔ ؎

دائی یقین دل کو ہے گر جائے گا حَمَل — ننھا سا لڑکا خواب میں کل ہٹ پٹ گیا

متقدمین کے یہاں بھی "حَمَل" ہی نظم ہوا ہے۔ چنانچہ سودا کہتے ہیں ۔

استقاط حرکی ہو تو کہیں مرثیہ ایسا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہیں

لفظ "حمل" پر کچھ موقوف نہیں۔ متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کا تلفظ لغت کی رو سے کچھ اور ہے ورنظم عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصل لفظ کلمہ ہے یعنی لام بالکسر ہے لیکن محاورے میں چونکہ بسکون لام بولتے ہیں اس لئے شعرا نے اسی طرح نظم کیا ہے۔

سبا — بادل سا وہ بحر آسمان جوش

بجلی کی لہر سے تھا ہم آغوش

اعتراض ہے کہ "لہر" کی جگہ "لہر" یعنی ہائے متحرک کے ساتھ نظم کر دیا گیا ہے جو اردو میں غلط ہے۔" اس اعتراض کے لئے بھی ایک حد تک وہی جواب ہے جو اس سے پیشتر کے اعتراض کے بارے میں لکھا گیا ہے اور دو شعر نسیم کی تائید میں سنداً درج ذیل ہیں۔ میر

شب نہاتا تھا جو وہ رشک قمر پانی میں — گندھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں

نواب مرزا شوق

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی — بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

سالہ — جاگی تو سب اس کے چوڑی تھیں

اندر کے اکھاڑے کی پریاں تھیں

اعتراض ہے کہ "اس میں پری کی جگہ "پریاں" چاہیے۔ جو نہایت ہی ذلیل قسم کی غلطی

سے جرأت۔ کلمہ پڑھ کے تیرا تجھے دیکھے جو اک نظر — کافر ہے جو بہ تری کافر نگاہ میں
دبیر۔ اے خدا کا غضب تیری جان پر ٹوٹے — تو کلمہ پڑھ کے رسول خدا کا گھر لوٹے
صبا — خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھوا دو — زبان تو ہے ابھی اختیار باقی ہے

معلوم ہوتی ہے" بیشک اس زمانے میں یہ ترکیب کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لیکن تسنیم کے وقت میں اس کا رواج ضرور تھا۔

آتش

کیا کیا پری اُتاری ہیں شیشے میں آہ نے — جن کو نہ ہو جو نالے سے اپنے نہیں بھلا

کس کے چار ابرو کے نظارے نے غم پھر کا دیا — درمیاں پاتا ہوں دل کو چار سو تلوار کو

(یعنی تلواروں کو)

ناسخ

شراب کیوں نہ چلے فصل گل میں یارا ہے — کہ نہر جاری ہوئیں موسم بہار آیا

شاہ — خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی

گانی اور ناچنی بڑی تھی؎

پہلے مصرعہ پر یہ اعتراض ہے کہ "خوش گلو یا خوش آواز کی جگہ غلطی سے خوش لہجہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے"

"خوش لہجہ" خوش گلو اور خوش آواز کے معنوں میں برابر استعمال ہوتا ہے۔

حافظ

دلم از پردہ بشد حافظ خوش لہجہ کجاست — تا بقول و غزلش ساز و نوائے بہ کنیم

؎ یہ مصرعہ گلزار نسیم کے اس نئے ایڈیشن میں غلط چھپ گیا ہے یعنی کاتب نے "گانی" کے بدلے "گاتی" اور "ناچنی" کے بدلے "ناچتی" بنا دیا ہے۔ گو کہ ایک نقطہ کا بڑھا دینا یا گھٹا دینا کاتبوں کی معمولی سی غلطی ہے مگر حضرت شرر نے اس قرینہ قیاس بات کو نظر انداز کر کے مجھ کو تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے خیر اس کا جواب اس مضمون کے آخری حصہ میں دیا جائے گا

گل و گلچین کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر ۔۔۔۔۔ تو گرفتار ہوئی اپنی نوا کے باعث

دوسرے مصرع کی نسبت حضرت شرر کا اعتراض ہے کہ "گائن" کی جگہ "گانی" اور "ناچنے والی" کی جگہ "ناچنی" غلط ہے۔

اس موقع پر پھر حضرت شرر نے ایک قدیم محاورے کو "غلط" ٹھہرانے میں تکلف نہیں کیا ہے۔ گلزار نسیم کی زبان وہ زبان ہے جو کہ لکھنؤ میں چھیاسٹھ سال پیشتر مروج تھی۔ گانی اور ناچنی کی ترکیب اس زمانے میں ضرور غیر فصیح معلوم ہوتی ہے مگر نسیم کے زمانے کے شعرا کے کلام میں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً انیس فرماتے ہیں۔

دُنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی ۔۔۔۔۔ ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا ۔۔۔۔۔ جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اس رباعی کے دوسرے مصرع میں "آنے والی" کی جگہ "آنی" اور "جانے والی" کی جگہ "جانی" نظم کیا گیا ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ "گانے والی" اور "ناچنے والی" کے بدلے "گانی" اور "ناچنی" استعمال کرنا دونوں کی ترکیب میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔

حضرت شرر کا ایک اعتراض یہ ہے کہ گلزار نسیم میں چنگل اور چنگال کا لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے اور تینوں جگہ بے موقع اور غلط۔ اس اعتراض کی تشریح کے لئے ذیل کے تین مصرعے لکھے گئے ہیں

(۱) پہونچا لب حوض سے نہ چنگل

(۲) شہزادے پہ اس نے مار چنگال

(۳) پیاری یہ نہیں حنائی چنگال

پہلے مصرع کے معنی حضرت شرر نے لکھدیے ہیں یعنی "ہاتھ نہیں پہونچا"۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تحریر فرمایا ہے۔ دوسرے مصرع کی نسبت یہ لکھا گیا ہے کہ " یہاں اگر یہ کہا جائے کہ پروں کی طرح پری کے نیچے بھی تھے تو شاید صحیح ہوجائے "۔ تیسرے مصرع پر یہ اعتراض ہے کہ " مہندی لگے ہاتھوں کو حنائی چنگال کہنا لکھنؤ کی زبان نہیں ہے"۔ ان اعتراضات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شرر کا یہ خیال ہے کہ چنگل اور چنگال محض پنجہ جانور کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ جس شخص نے فارسی کی درسی کتابیں بھی پڑھی ہیں وہ جانتا ہے کہ فارسی شعرا نے "چنگال" ہاتھ کے معنوں میں برابر استعمال کیا ہے۔ شیخ سعدی بوستان میں لکھتے ہیں ۔

مرا در صفاہان یکے یار بود — کہ جنگ آور و شوخ و عیار بود
پلنگافگنش از زور و سرپنجہ زیر — فرو بردہ چنگال در مغز شیر

تیسرے مصرع پر جو اعتراض ہے وہ بالکل خارج از آہنگ ہے۔ "حنائی چنگال" فارسی کا محاورہ ہے۔ اس کی نسبت یہ کہنا کہ یہ لکھنؤ کی زبان نہیں ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر کہا جائے کہ "دست حنائی" کے بدلے "حنائی چنگال" کہنا درست نہیں، تو اعتراض کے کچھ معنی ہو بھی سکتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض بھی بیجا ہے۔ ملا شہیدی فرماتے ہیں ۔

بستہ نہ رنگ حنا بر چنگل خود اے نگار — یا بخون عاشقان ترکردہ چنگال را

غیاث اللغات صفحہ ۱۳۶ "چنگل و چنگال۔ پنجہ آدمی وغیرہ از موید و بہار عجم و جہانگیری وغیرہ"۔

ش ۱۵ — بیجا وہ ہوا کہا کہ جا جا
کیسی رانی کہاں کا راجا

اعتراض ہے کہ "برہم ہوا کی جگہ پر" بیجا ہوا" کہنا بہت ہی مبتذل بازاری زبان ہے۔ میں نے دیباچے میں خود تسلیم کرلیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر موقعوں پر تناسُب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبھ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھدیے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی اسی طرز کا ہے۔ اس میں "جا جا" کے لئے "بیجا" نظم کردیا ہے۔ حالانکہ برہم نہایت آسانی سے نظم ہوسکتا تھا۔ اب رہا یہ کہ "بیجا" بازاری زبان ہے۔ اس کی نسبت میں صرف اس قدر کہونگا کہ بیشک اس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا کہنا بیجا نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا نسیم کے زمانے میں بھی "بیجا" بازاری زبان میں داخل سمجھا جاتا تھا کہ نہیں۔

میر تقی میر کا شعر ہے

جنگ نے مانہ میں تو بحث ہے عشق ہی کا — بیجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

(کلیات میر صفحہ ۴۳۴۔ دیوان چہارم)

بیجا کے علاوہ اکثر الفاظ ایسے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں ضرور فصیح سمجھے جاتے ہونگے۔ مگر فی الحال وہ بازاری زبان میں داخل ہوگئے ہیں۔ مثلاً میر انیس نے "جگہ" کے بالعوض "جاگہ"[ع۵] نظم کیا ہے جس کی مثال ان کے معاصرین کے کلام میں مشکل سے ملیگی۔ اور اس زمانے میں تو "جاگہ" بالکل مبتذل بازاری زبان میں داخل ہے۔ جس کا استعمال قصباتی لوگ بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ اِس

ع۵ وسواس کا مقام ہے جاگہ قلق کی ہے — پہچانتی ہوں میں یہ صدا شیر حق کی ہے (جلد اول صفحہ ۹۸ بند ۱۱۲)

بنا برین یہ کہنا کہ میر انیس نے بازاری اور مبتذل زبان نظم کی ہی بالکل بیجا ہے۔

بھنبھلا کے ڈرا کے غل مچا کے ۸۱ے
سمجھا کے بجھا کے دست پا کے

اعتراض ہے کہ "اردو مین دسترس پانا کہہ سکتے ہین مگر "دست پانا" "قابو پانا" کی جگہ ہرگز جائز نہین ہے" حضرت معترض کو غالباً معلوم ہوگا کہ "دست یافتن" فارسی کا محاورہ عے ہے اور قابو پانے کے معنی مین استعمال ہوتا ہے نسیم نے اِس محاورے کا ترجمہ کر دیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہین ہے نسیم کے زمانے مین اس صورت پر فارسی محاورون کا ترجمہ کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً "دوش دادن" عے فارسی کا محاورہ ہے۔ رند نے اِس محاورے کا ترجمہ بالکل نسیم کی طرح کیا ہے۔

تیرے کوچے سے نہ بڑھیگا جنازہ میرا بعد مُردن نہ دیا تو نے اگر دوش مجھے

ظاہر ہے کہ جس طرح آج کل کوئی قابو پانے کے بدلے "دست پانا" نہین کہتا۔ اسی طرح "کاندھا دینے" کی جگہ "دوش دینا" نہین استعمال کرتا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالین مل سکتی ہین۔ اُردو مین "انعام دینا" محاورہ ہے۔ مگر چونکہ "انعام کردن" فارسی کا محاورہ ہے۔ لہٰذا آتش نے یہ کہنے مین تکلف نہ کیا کہ ؎

باغبان خیر چمن کا بھی کوئی کام کرین سرو قمری کو عنادل کو گل انعام کرین

عے ظہیر فاریابی۔ شبے کہ وسوسۂ عقل دست یافت ظہیر بنوش بادہ کہ این رفع آن ملال کند
سعدی چو اقبالش از دوستی سر بتافت بنا کام دشمن بر و دست یافت
عے ناصر علی وضع تمکین خرد محرم این راہ نبود لغزش پا مددے کرد کہ دوشم دادند

علاوہ بریں سودا وغیرہ نے تو "دست" قدرت کے معنی میں اکثر استعمال کیا ہے۔ سودا

کون ایسا ہی جسے دست ہو نسازی میں　　　شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیدا

تولا　　　تجھ پاس تو اک عصا ہی جانی

اس مصرع پر دو اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ "اردو میں "جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ کے اور کسی کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بدتمیزی ہی نہیں غلطی ہے مگر گلزار نسیم میں تاج الملوک اپنی معشوقہ نہیں بلکہ "روح افزا" سے پہلی ہی ملاقات میں کہتا ہے "جی بجھا نہ جانی" اور وہ جواب دیتی ہے کہ "تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی"۔

اس نیم اخلاقی اور نیم شاعرانہ اعتراض کے جواب میں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت شرر نے اس کلمہ شفقت (جانی) کے استعمال کے لئے جو حدود قائم کئے ہیں ممکن ہے کہ ان کی پیروی آیندہ نسلیں کریں لیکن نسیم کے زمانے میں شرفاء لکھنؤ "جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ کے دوسروں کی شان میں بھی استعمال کرتے تھے اور محض خلوت میں نہیں بلکہ دو چار کے سامنے۔ اور اب بھی جو بزرگ اس زمانے کے یادگار باقی ہیں ان کا یہی دستور ہے "جانی" کا لفظ بلا کسی رکیک خیال کے محض پیار اور محبت کے اظہار کے لیے بولا جاتا تھا ذیل کی مثالیں سنداً درج ہیں۔

"دریائے تعشق" میں ماں لڑکی سے کہتی ہے۔ ؎

یہ تم سے امید تھی نہ جانی　　　دے جاؤ گے داغ دل نشانی

طلسم الفت (قلق) میں جب شہزادہ سفر کو جاتا ہے تو ماں کہتی ہے۔ ؎

کیا یہی دل مین ٹھان لی جانی   مان کی ہوتی ہے خانہ ویرانی

پھر آخری رخصت کے وقت دعا دیتی ہے۔ ؎

جانی اللہ کی پناہ تہین   ہو نہ زنہار رنج راہ تہین

"زہر عشق" مین بھی مان لڑکے سے کہتی ہے۔ ؎

پالا کس کس طرح تہین جانی   کون منت تھی جو نہین مانی

علاوہ برین اگر اس زمانے مین "جانی" کا مفہوم کسی قدر بھی غیر مہذب سمجھا جاتا تو یہ لفظ مرثیون مین ہرگز استعمال نہ ہوتا۔ مگر ایسا نہین ہے۔ انیس

عباس نے رو کر کہا کیا چاہیئے جانی   شرما کے سکینہ نے یہ کی عرض کہ پانی

(جلد اول صفحہ ۲۱۳ بند ۵۳)

دبیر۔ اکبر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی   نرغے مین گھرا ہے وہ ید اللہ کا جانی

جلد دوم صفحہ ۱۹۷ بند ۵۷

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مندرجۂ بالا مثالین اُن موقعون کی ہین جہان ہجوم عام تھا اور خلوت کا ذکر نہ تھا۔ مجھکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت شرر نے اِس محاورے کے استعمال پر "بدتمیزی" کا الزام لگاکر کتنے بزرگون کی روح کو صدمہ پہونچایا۔

اِس مصرع (تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی) پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "تجھ پاس" کا لفظ بھی "تیرے پاس" کی جگہ کہان کی زبان ہے۔ "تیرے" کے بدلے "تجھ" اور "میرے" کے بدلے "مجھ" استعمال کرنا آج کل ضرور نا جائز سمجھا جاتا ہے لیکن سودا و میر کے زمانے تک

یہ محاورہ عام تھا۔

میر — آبِ اشک خانی ہے جو تر نکرے تکھین — وہ تجھ کف رنگین کا مارا نہ ہوا ہوگا

سودا — نگر آباد ہین بسے ہین گا ؤن — تجھ بن اُجڑی پڑی ہو اپنی ٹھاؤن

آتش — شام سے تا صبح نیند آئے نہ اک دم تجھ بغیر — آگ نالون نے لگائی اشک نے طوفان کیا

رند — آنکھ تجھ بن جو کسی پر بُتِ عیار پڑے — عوض سبحہ گلے مین مرے زنار پڑے

عاشق روئے حسینان ہون مین بیمار اجل — بن کے صورت حور کی مجھ پاس آیا چاہیے

پھر یہ مُنہ لے کے آئے ہو مجھ پاس — دُور رہو سامنے سے نفرت ہے

نواب مرزا شوق چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن — اب کے بچھڑے ملین گے حشر کے دن

کیا افسوس کا مقام ہے کہ "تجھ پاس" کی ایسی عام ترکیب پر حرف رکھا جاتا ہے اور ایسے اعتراض سے اساتذہ لکھنو کا دامن آلودہ کیا جاتا ہے۔

۵۲ — نکلا جبینے سے ہے مٹھ کے باہر
پتھرا گئی چشم حلقۂ در

اعتراض ہے کہ "فارسی مین "حلقہ در" کنڈی کو کہتے ہین۔ اور یہان جب ہی معنی صحیح ہو سکتے ہین کہ "حلقہ در" سے دروازے کا پورا چوکھٹا مراد لیا جائے" غالباً حضرت شرر نے ہندوؤن کا وہ قدیم ساخت کا شوالہ نہین دیکھا ہے جسے "مٹھ" کہتے ہین۔ ورنہ آپ ایسا اعتراض نہ کرتے۔ "مٹھ" کی ساخت گنبد نما ہوتی ہے۔ اِس مین دروازے کے چوکھٹے وغیرہ یا کنڈی کو مطلق دخل نہین ہوتا۔ اِس کے تین جانب ایک گول دیوار ہوتی ہے اور ایک جانب

ایک محراب دار در ہوتا ہے۔ نسیم نے حلقۂ در سے محراب در مراد لی ہے۔ فارسی شعرا نے بھی حلقہ در کو محراب در کے معنون مین استعمال کیا ہے۔ چنانچہ بدر چاچ نے قلعۂ دہلی کی تعریف مین جو قصیدہ لکھا ہے اس کا ایک شعر محراب در کی تعریف مین درج ذیل ہے ۔؎

چہ قلعہ ایست کہ قوسے ز حلقۂ در او   محیط نہ ربض ہفت طارم اعلیٰ ست

یہ بھی خیال رہے کہ فارسی شعرا نے "کنڈی" کے لئے "حلقہ بیرون در" زیادہ تر استعمال کیا ہے اور حلقۂ در سے عموماً محراب در مراد لی ہے۔

۱۲؎ اک دن پنجرا اُڑا کے لائی

حسن آرا کو وہ کل سجھائی

حضرت شرر نے پیشتر اِس شعر کی تشریح اس طرح کی ہے کہ "یہ تدبیر بتائی کہ آدمی کیونکر قمری بنایا گیا ہے" مگر باوجود اصلی مطلب سمجھ جانے کے آپ نے ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اِس شعر کا مفہوم نہین سمجھے ہین۔ آپ فرماتے ہین کہ "اُردو مین صرف مادّی مشینون کی نسبت کل کا لفظ مستعمل ہے۔ طلسم اور جادو اور عمل کی نسبت اس کا استعمال ہر گز جائز نہین ہے" گو کہ حضرت شرر نے یہ کلیہ قائم کر دیا ہے کہ اُردو مین کل کا لفظ صرف مادّی مشینون کی نسبت استعمال ہو سکتا ہے مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ کل کا لفظ اُردو مین مختلف معنون مین استعمال ہوتا ہے؎۔ چنانچہ "ترکیب" کے معنی مین بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نسیم نے اِس شعر مین "کل" سے "ترکیب" مراد لی ہے۔ یعنی حسن آرا کو وہ ترکیب بتائی۔" اور

؎ جیسا کہ ذیل کے فقرون سے ثابت ہے "مین کل جاؤنگا" "وہ او شکس کل ٹھیتا ہے" "وہ اُن کو کسی طرح کل نہین پڑتی" وغیرہ وغیرہ

چونکہ نیچرڑے مین بھی کل ہوتی ہے لہذا تناسب لفظی کا بھی لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سلسلے مین یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ حضرت شررؔ کا یہ دعوی کہ جادو اور عمل کی نسبت ”مشین“ کے معنی مین کل کا استعمال جائز نہین ہے۔ بالکل بے دلیل ہے۔ میر حسن کی ”پہلی اعلیٰ اور مقبول عام اُردو مثنوی مین بدر منیر جب بینظیر کو جادو کا گھوڑا پرستان مین دیتی ہے تو کہتی ہے۔

یہ گھوڑا مین دیتی ہون کل کا تجھے　　　ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے

یا دوسرے موقع پر کہتی ہے۔

جو اُترے تو کل اس کی یون جوڑیو　　　جو برعکس چاہے تو وون موڑیو

۲۲ھ　　دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی
شب کو اُسے آدمی بناتی

حضرت شررؔ کا طوطی فکر اس شعر کی نسبت یون نغمہ زن ہے ”طوطا پڑھایا جاتا ہے مینا پڑھائی جاتی ہے۔ فاختہ کا پڑھایا جانا ایک بالکل نئی بات ہے“ حضرت شررؔ کو معلوم ہوگا کہ یہ ”طلسمی فاختہ“ تھی اور اس کو پڑھانے والی ایک پری تھی جو کہ جادو کے زور سے بہت سی ایسی ”نئی باتین“ کر سکتی تھی جو حضرت شررؔ کے خیال کے مطابق قابل اعتراض تصور کی جا سکتی ہین۔ علاوہ برین فقیر اکثر فاختہ پالتے ہین اور اُسے پڑھاتے بھی ہین۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت شررؔ کا اعتراض صحیح ہے تب بھی اس کا الزام اُس شخص کے سر ہے جس نے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نہ کہ نسیم کے سر۔ آخر مین مین یہ عرض کرون گا کہ کسی ”نئی بات“ کو قابل اعتراض قرار دینا واجب نہین ہے۔ عام طور سے کبوتر اُڑائے جاتے ہین مگر خلیل خان فاختہ اُڑا گئے

یہ" بالکل نئی بات ہے" خدا جانے یہ اعتراض" اساتذہ لکھنؤ" میں سے کن صاحب کی پروانہ فکر کا نتیجہ ہے۔ مجھ کو تعجب ہے تو اس قدر کہ اس زمرے میں حضرت شرر نے گلزار نسیم کی اس حکایت پر کیوں نہ اعتراض کیا جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک طائر نے اپنے صیاد سے جواب و سوال کئے۔ یہ" بالکل نئی بات ہے"۔

۲۳ سوچا جو نہ تھا صلاحِ الجھنا
دانائی تھی بات کا سمجھنا

اس شعر پر ایک بہت مختصر سا اعتراض ہے کہ" دانائی تھی" کتنا برا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے چونکہ اس اعتراض کی زیادہ تشریح نہیں کی گئی ہے۔ لہذا چند اشعار" اساتذہ لکھنؤ" کے کلام سے لکھے جاتے ہیں جن کی بندش اس مصرع (دانائی تھی بات کا سمجھنا) کی بندش کے مطابق ہے۔

طلسمِ الفت (قلق) شب نہ تھی دودِ آہ عاشق تھا
جلوۂ نورِ صبح صادق تھا

آتش

عمر بھر مضمون طلائی رنگ کے بندھتے رہے	سرنوشت اپنی بھی نسخہ تھا کوئی اکسیر کا
مسجد سے میکدے میں مجھے نشہ لے گیا	موجِ شراب جادہ تھی راہِ صواب کا

امیر مینائی

وادیٔ ایمن میں تھی برقِ تجلی بے حجاب	حیرتِ موسیٰ تھی پردہ جلوۂ دیدار کا

اب اس عام بندش کو کس طرح بھونڈا کہئے۔

مین نے گلزار نسیم کے دیباچے مین یہ خود تسلیم کرلیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہین نبھ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھ دیے ہین لیکن حضرت شرر نے غالباً اعتراضات کی تعداد بڑھانے کے لئے اِس قسم کے شعر بھی اپنے مضمون مین لکھے ہین جن مین آپ کے نزدیک نسیم سے تناسب لفظی اچھی طرح نہین نبھ سکا ہے۔ مگر جن اشعار پر آپ نے اس پہلو سے اعتراضات کئے ہین۔ وہ ایسے اعتراضات سے بری ہین۔ اب اس رنگ کے اعتراضات ملاحظہ ہون۔

۲۴ ص

دا غا تو چلے تفنگ سے وہ

چھوٹے قیدِ فرنگ سے وہ

اعتراض ہے کہ "تفنگ کی چال سے انسان کی چال کو کیا علاقہ؟" اوّل تو مین عرض کرونگا کہ "تفنگ چلنے" سے "گولی کا چلنا" مراد لیا جاتا ہے۔ لہذا انسان کی چال کو تیزی کے لحاظ سے گولی کی "چال" سے تشبیہ دی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "تفنگ چلنا" گولی کے چلنے کے معنون مین نہین استعمال کیا جاتا۔ تب بھی حضرتِ شرر کے اعتراض کا جادو چلتا نہین نظر آتا۔ ذو معنی الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا جس طرح نسیم نے اِس شعر مین "چلے" کو نظم کیا ہے نزاکت شاعرانہ مین داخل ہے۔ اور شعرائے لکھنؤ نے اس قسم کے تکلفات کو بہت رواج دیا ہے۔ چند مثالین درج ہین۔ آتش۔

ایسی وحشت نہین دل کو کہ سنبھل جاؤنگا　　　صورتِ پیرہنِ تنگ نکل جاؤنگا

ظاہر ہے کہ پیرہن کے نکل جانے سے آدمی کے نکل جانے کو منطقی طور پر کوئی علاقہ نہین ہے مگر شاعری مین ایسا کرنا جائز ہے - اِس رنگ کی اور مثالین بھی ہدیۂ ناظرین ہین - وزیر

ضعف سے جائینگی کیا خون کی چھینٹین اُڑکر آستین کا ہو ترے کوس نہین منزل قاتل

ساقی ہوا ہے عشق کسی خانہ جنگ کا مانگو نگا میکشی کو پیالہ تفنگ کا

(حضرت شرر کہین گے کہ میکشی کے پیالے سے اور تفنگ کے پیالے سے کیا علاقہ)

قلق - اس کی تلوار کے رومال کا پھاہا تو نہین آب شمشیر کی تاثیر جو تیزاب مین ہے

ایسا کانٹا ہے خار مژگان کا وزن کر لیتا ہے زر جان کا (طلسم الفت)

رند - دور ہوتا روح طائر سے کثافت جسم کی گھاٹ پر اس کی سروہی کے نہانا چاہیے

۲۵ وہ پوربی کر کے جوگیا بھیس
جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اعتراض ہے کہ "سب راستے چھوڑ کر تاج الملوک جنگلے کی راہ محض اس لئے بھیجا گیا کہ مصنّف گلزار نسیم کو اس لفظ کی ضرورت تھی" حضرت شرر نے اِس مقام پر بھی سیاق کلام سے چشم پوشی کی ہے - یہ شعر اُس موقع کا ہے کہ جب کہ تاج الملوک گل لیکر وطن کی طرف کشتی پر چلا ہے اور جب وطن کے متصل آ گیا ہے تو اِس مقام پر یہ صورت درپیش آئی ہے -

سوچا کہ مین خود ہون خانہ برباد کیا جانیے کیا پڑے گی اُفتاد
لازم ہے گل اپنا ہاتھ رکھیے موقع نہین بھیڑ ساتھ رکھیے
لنگر کا انھین کیا اشارہ خود کشتی سے کر گیا کنارا

وہ پوربی کرکے جوگ گیا بھیس جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اِس سلسلے مین آخری شعر کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ تاج الملوک کو بھیڑ ساتھ رکھنا منظور نہ تھی اِس لئے وہ دریا کی راہ چھوڑ کر فقیرون کے لباس مین جنگل کے راستے سے وطن کی طرف چلا۔ نیز چونکہ وہ بھیس بدل کر چلا تھا اور نہین چاہتا تھا کہ اسے کوئی پہچانے۔ اِس لیئے وہ بھی شاہراہ سے کنارہ کشی کرکے جنگلون مین ہوتا ہوا وطن کی طرف سدھارا۔

نقش اس کو ہوا کہ بس وہی ہے ؎
ان سادون سے کندہ کب ہوئی ہے

اس شعر پر دو اعتراض ہین اولاً یہ کہ "اُس کے دل پر نقش ہوا" کے بدلے "نقش اس کو ہوا" کہنا کوئی معنی نہین رکھتا" اِس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا اعتراض بہت بجا ہے لیکن نسیم کے وقت مین ایسا اختصار جائز سمجھا جاتا تھا۔ شیخ ناسخ فرماتے ہین ۔

سارے نقشے سامنے آنکھون کے ہین نقش ہین نقش و نگارِ لکھنؤ

(یعنی دل پر نقش ہین ہمارے)

دوسرا اعتراض حضرت شرر نے "سادون" پر جڑا ہے ۔ آپ فرماتے ہین " اصل تو سادہ مزاج "، " سادہ لوح " ہے ۔ "سادے آدمی" اور سادے لوگ بھی سہی ، مگر محض "سادون کا" لفظ تو ٹھیک نہین معلوم ہوتا" اِس اعتراض کے لئے وہی جواب ہے جو اِس کے پیشتر کے اعتراض کے لئے لکھا گیا ہے اور دو شعر سنداً پیش ہین ۔ ناسخ

ترک کردتا ہے عشقِ سادہ رو زاہدِ بے دین بھی کتنا سادہ ہے
(یعنی " سادہ لوح " ہو ۔ یا سادہ آدمی ہو)

کتنی سادہ ہو کہ جٹی مانگتی مینا سے ہو

جان صاحب

میں بھبو کا لعل منگوا دوں تمہیں دو چار رُخ

جس زمانے میں محض "سادہ" "سادہ لوح" کے بدلے بولا جاتا تھا تو اُس کی جمع "سادوں" بھی ضرور فصیح سمجھی جاتی ہوگی۔ ؎

؎۲۷ دیووں نے ادھر محل بنایا

کشتی سے وہ دخت رز کو لایا

اعتراض ہے کہ "نسیم نے محمودہ کو بغیر خیال کئے دختِ رز کہدیا اور یہ یاد نہیں رہا کہ دختِ رز شراب کو کہتے ہیں"۔ حضرت شرر کا غالباً یہ خیال ہے کہ "دختِ رز" سے کوئی معشوقہ عورت مراد لینا جائز نہیں ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آتش کا شعر ہے۔

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے میں جہانگیر ہوں یہ نور جہاں بیگم ہے

یا قلق کہتے ہیں۔ ؎

لبالب بادۂ گلرنگ سے دل کا پیالا ہے وہ میکش ہوں کہ میں نے دختِ رز کو گھر میں ڈالا ہے

ظاہر ہے کہ نہ آتش محض "شراب" کو نور جہاں بیگم کہ سکتے تھے۔ نہ قلق یہ کہ سکتے تھے کہ "میں نے شراب کو گھر میں ڈالا ہے لیکن "دختِ رز" میں لفظ "دخت" کی وجہ سے شاعر کو "شراب" عیش و عشرت کی ایک "مجسم تصویر" نظر آتی ہے اس لئے وہ اِس کو کسی معشوقہ عورت سے تشبیہ دینے میں تکلف نہیں کرتا۔ اِس صورت میں اگر "دختِ رز" نور جہاں بیگم بن سکتی ہے تو محمودہ کیوں نہیں بن سکتی۔ اور چونکہ محمودہ کشتی پر تھی اور کشتی دختِ رز سے بھی خاص تعلق رکھتی ہے اس لئے تشبیہ اور بھی

ہوگئی جس شخص کو شعر وسخن کا کچھ بھی مذاق ہے وہ اِس قسم کی شاعرانہ نزاکتین بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

۲۸ـہ وہ گندم لجونما تھی بالی

حضرت شرر اِس مصرع کی نسبت فرماتے ہین کہ " رعایت لفظی نے مضمون کی کیا مٹی خراب کی ہے "۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ اس مصرع مین کیا عیب ہے۔ بہتر ہوگا اگر حضرت موصوف کسی آیندہ موقع پر اپنے اِس مختصر مگر ناموزون اعتراض کی تشریح فرمائین۔

۲۹ـہ فوّارہ تو گم خزانہ باقی

اِس شعر کی نسبت حضرت شرر نہایت حیرت سے فرماتے ہین کہ " بھلا فحش وابتذال کی کوئی حد ہے "۔ جس طرح حضرت شرر نے گلزار نسیم کی زبان پر بحث کرتے ہوے تمام قدیم محاورون کو جو کہ اب متروک ہوگئے غلط کہنے مین تکلف نہین کیا ہے اسی طرح اِس موقع پر بھی تنقید سخن کے اِس اصول اولین سے بے خبری ظاہر کی ہے کہ کسی شاعر کے کلام کے اخلاقی پہلو پر اِس زمانے کی تہذیب کا معیار پیش نظر رکھ کر بحث کرنی چاہیے جس زمانے مین کہ وہ شاعر پیدا ہوا تھا۔ نسیم کے زمانے مین اِن فحش محاورون کا نظم کرنا ناروا نہین سمجھا جاتا تھا جن کا زبان پر لانا اب خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ شاعر کا کلام اِس کے زمانے کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے گلزار نسیم بھی فحش کے کانٹون سے پاک نہین ہے۔ نسیم اِس حالت مین ضرور قصوروار تھے جب کہ ان کے کلام مین فحش محاورے ملتے اور ان کے معاصرین کا کلام ایسے محاورون سے پاک ہوتا مگر ایسا نہین۔ اس زمانے کے اکثر شعرا کے کلام مین فحش محاورے موجود ہین۔

۳۰ـہ باہم زن و مرد نے کیا میل دریا سے ملا وہ قطرہ زن میل

اعتراض ہے کہ ”یہان سیل کے معنی ہی کچھ نہین باقی رہے“ غالباً حضرت شررؔ ”قطرہ زن“ کے معنی ”قطرہ بار“ سمجھے ہین جبھی آپ فرماتے ہین کہ ”یہان سیل کے کچھ معنی باقی نہین رہے“۔ مگر ایسا نہین ہے۔ ”قطرہ زن“ فارسی کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی ”شتابندہ“ کے ہین۔ یہان قطرہ زن سیل سے ”شتابندہ سیل“ مراد ہے جو کسی صورت مین بے معنی نہین ہے ”قطرہ زن“ کے معنون کی نسبت حضرت شررؔ کوئی لغت دیکھکر اپنا اطمینان کر سکتے ہین۔

۵۳۱ غربت مین وطن کی دھن سمائی

اِس فیل کو یادِ ہند آئی

اعتراض ہے کہ ”فیل سے تشبیہ صرف ہند کی ضرورت سے دی گئی ہے۔ مگر کس قدر بُرا معلوم ہوتا ہے“ حضرت شررؔ کا اِس مصرع کی نسبت کچھ ہی خیال کیون نہ ہو مگر اس کو قبول عام کی سند مدت ہوئی مل چکی ہے۔ یہ مصرع ضرب المثل ہوگیا ہے۔ کہ ع اِس فیل کو یادِ ہند آئی ؎

۵۳۲ خواہش جو بلائے جان ہوئی وہ

ہلکا ہوا وہ گران ہوئی وہ

اعتراض ہے کہ ”خیر بکاؤلی تو چونکہ آدھی پتھر کی ہوگئی تھی اس لئے گران ہوئی مگر ایسی حالت مین تاج الملوک صاحب کیونکر ہلکے ہوے“ تعجب ہے کہ حضرت شررؔ لکھنؤ کے اِس معمولی محاورہ سے واقفیت نہین رکھتے کہ ”ہلکا ہونا“ ذلیل ہونے کے معنون مین بولا جاتا ہے۔ نسیمؔ نے ”ہلکا ہوا“ سے یہ مراد لی ہے کہ وہ بھری محفل مین ذلیل ہوا اور شعرائے اُردو نے بھی یہ محاورہ نظم کیا ہے۔ قلق

بیتابیٔ اُلفت نے کیا ہے سُبک ایسا خاطر پہ گران یار کی نظرون مین ہون ہلکا

جان صاحب

جان صاحب کی دوگانا بیجپائی کیا کہوں
کر دیا ہلکا مجھے منجھلی بُوا کے سامنے

حضرت شرر اس شعر میں "گران ہوئی" کے معنی بھی غلط سمجھے ہیں۔ "گران ہوئی" کے معنی اس مقام پر یہ ہیں کہ "بکاؤلی اہل محفل کی طبیعت پر گران ہوئی"۔

حضرت شرر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "گلزار نسیم کے بہت سے اشعار میں افعال کا استعمال ایسی بُری طرح سے ہُوا ہے کہ جو نہ لکھنؤ والوں کے نزدیک جائز ہے۔ نہ دہلی والوں کے نزدیک"۔ اس اعتراض کی تائید میں حضرت موصوف اس قسم کے مصرعے پیش کرتے ہیں۔

ع۔ خاتم کے نگین بتائے ہوتے۔ ("خاتم کے نگین اُنہوں نے بتائے ہوتے" یا خاتم کے نگین کو بتایا ہوتا۔)

ع۔ حیلہ کر کے چھپائی ایک چند (بجائے "اس کو چھپایا")

ع۔ اِس شب کو بغل میں آ کے جاگا (یعنی "اس رات جب وہ آئی تب جاگا")

ع۔ بائیں دیکھا کہیں نہ پائی (یعنی "کہیں نہ پایا")

ع۔ بیدار کیا وہ ماہ پیکر (یعنی اس ماہ پیکر کو بیدار کیا)

وغیرہ وغیرہ

بیشک آج کل جو زبان کا رنگ ہے اس کے لحاظ سے افعال کا استعمال اس صورت پر غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نسیم کے معاصرین کے کلام میں اِس قسم کی ترکیبیں عام نظر آتی ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ناسخ کیا اتحاد ہے کہ وہ پیٹا جو گاڑ کر — مدفن میں ہو گیا ہے ہمارا بدن سفید

(یعنی اُس نے اپنے تئیں "پیٹا" کے بدلے "وہ پیٹا" استعمال ہوا ہے)

" کیوں نہ ہو وہ نوجوان برسات میں رنگین لباس — پیر گردوں تک شفق کا لال جوڑا چاہیئے

(یعنی پیر گردوں تک کو شفق کا الخ)

" گھر میں تیرے پاس سے جاتا نہیں — اب تو سیکھا ہے مرے ڈھنگ آئینہ

(یعنی اب تو آئینے نے میرے ڈھنگ سیکھے ہیں)

" بوسہ مانگا میں نے وہ کہنے لگے گھر سے نکل — جو کہ سائل ہو وہ دروازے کے باہر چاہیئے

(یعنی اس کو دروازے کے باہر ہونا چاہیے)

آتش۔ جوش وحشت میں جو لی زنداں سے میں نے راہ دشت — کو دکان مجھ کو خدا حافظ پکارے شہر سے

(یعنی کو دکان نے مجھ کو خدا حافظ پکار کر کہا)

" باغِ عالم میں یہی میری دعا ہے روز و شب — خار خارِ عشقِ گل رخسار تو ڑا چاہیئے

(خار خارِ عشقِ گل رخسار کو توڑا چاہیے)

" ہو گیا ہے ایک مدت سے دلِ نالاں خموش — باغ میں جا کر اسے بلبل سنانا چاہیئے

(اسے نغمۂ بلبل سنوانا چاہیئے)

رند۔ حاضر اگر ہے دن کو تو غائب ہے رات کو — غمزہ یہ کس حسین سے سیکھا ہے آفتاب

(یعنی آفتاب نے یہ غمزہ کس حسین سے سیکھا ہے)

" ہجر بت میں بھی جب ہوئے ہیں تنگ — اپنے اللہ کو پکارے ہیں

(یعنی ہم نے اپنے اللہ کو پکارا ہے)

(دریائے تعشق (واجد علی شاہ) پایا نہ مگر وہ ماہ طلعت
پوشیدہ رہا برنگ نکہت

یعنی "اُس ماہ طلعت کو نہ پایا" یہ بعینہ ویسی ہی ہے جیسے کہ "وہ بیدار کیا وہ ماہ پیکر"

قلق خواہشِ جستجوئے یار جسے بھی کچھ ہے بیشمار بعدِ فنا مرا غبار ڈھونڈھ پھرا گلی گلی

(یعنی "اسے ڈھونڈھتا پھرا گلی گلی)

اُس زمانے میں نظم کے علاوہ نثر میں بھی افعال کا استعمال اس صورت پر جائز سمجھا جاتا تھا۔ فسانہ عجائب سے ذیل کا اقتباس تمثیلاً درج ہے۔" دولھا نے سہرا سر سے لپیٹ دُلہن کو دمین اُٹھائی الخ" (یعنی دلہن کو گود مین اُٹھایا)

حضرت شررنے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ" شتر گربہ کے عیب سے بھی یہ مثنوی خالی نہین"

اور اس اعتراض کی تائید مین ایک شعر پیش کیا ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

ہے یا کہ نہین خطا تمہاری ص ۳۳
فرمائیے کیا سزا تمہاری

افسوس ہے کہ حضرت شرر اس شعر کی نزاکت کو نہین سمجھے۔ ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔ یہ شعر اس موقع کا ہے جب کہ بکاؤلی تاج الملوک پر اپنے غصّے کا اظہار کررہی ہے۔ اور یہ سب پر روشن ہے کہ جس وقت کوئی شخص عالم غیض مین کسی کو خطاب کرتا ہے تو وہ یہ نہین سوچتا کہ میری تقریر اِس وقت "شتر گربہ" کے عیب سے پاک رہے۔ وہ کبھی "تم" کہتا ہے کبھی طنزاً "آپ" کہتا ہے۔ چنانچہ اس شعر مین نسیم نے بکاؤلی کے غصّے کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ کبھی "تم" کہتی ہے

کبھی طنزاً "فرمائیے" کہتی ہے۔ الفاظ سے اس قسم کی مصوری کرنا کمال شاعری مین داخل ہے اگر اس شاعرانہ نزاکت کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر اس شعر کو محض ایک مُلّا کے مکتبی کی نگاہ سے دیکھیے تب بھی حضرت شرر کا اعتراض بیجا نظر آتا ہے۔ کیونکہ نہ تو فارسی شعرا نے "شتر گربہ" سے پرہیز کیا ہے نہ قدیم اساتذہ اُردو نے۔ محض طبقۂ حال کے شعرا نے "شتر گربہ" کو ناجائز قرار دیا ہے۔ نسیم کے معاصرین کے کلام مین "شتر گربہ" کی پچاسون مثالین مل سکتی ہین۔ طوالت مضمون کے خیال سے ہر شاعر کے کلام سے دو ایک مثالین دینے پر اکتفا کیا ہے۔

حافظ۔ اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را   بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

"   بسرت گر ہمہ عالم بسرم جمع شوند   نتوان برد ہوائے تو برون از سر ما

آتش۔ ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ   جامہ زیبی کے بادشاہ ہو تم

"   تم تو غریب خانے مین آئے نہ ایک روز   فرمائیے تو شب کو کسی وقت آؤن مین

ناسخ۔ مین جان بلب ہون گلا کاٹو یا گلے سے ملو   جو اس مین آپ کو منظور ہو سو جھٹ پٹ ہو

رند۔ ہاتھ سے رند کو کھوتے ہو عبث   کہین ایسا نہ ہو پچھتائیے آپ

قلق   تیز دستی کی پائیے گا سزا   شامت آ جائیگی تمھاری بچا

ع ؎ گو کہ فصحائے دہلی و لکھنؤ نے "شتر گربہ" کو اب ترک کر دیا ہے۔ مگر اکثر زمانۂ حال کے مصنفین کے یہان بھی اس طرز قدیم کی پیروی کا پتا ملتا ہے۔ نظم تو درکنار، نثر مین ایک ناول کے مکالمے مین "شتر گربہ" کی مثال درج ذیل ہے۔

مریم۔ آخر بیان تو کرو کیا ہوا۔

طلیح۔ غلام آج دوپہر کو ذرا سو گیا تھا۔ ناگہان کیا دیکھتا ہون کہ ایک نورانی صورت سامنے ہے۔

(ایام عرب حصۂ دوم مصنفہ جناب عبد الحلیم صاحب شرر صفحہ ١٣٠)

قلق - آپ کو کچھ نہین خیال اپنا دیکھو آئینے مین تو حال اپنا (طلسم الفت)

نواب مرزا شوق شکل دکھلاؤ کبریا کے لئے بام پر آ ذرا خدا کے لئے (زہر عشق)

جان صاحب
پڑی ہین سر مین جوئین اب ایسی کہ زچ ہی جینے سے دل ہمارا
مامانی آمان ہین سر مین ڈالون منگاؤ تھوڑا سا مجھ کو پارا

اِس اعتراض کے بعد حضرت شررؔ فرماتے ہین کہ " دو ایک جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے چھپنے مین غلطی ہوگئی اور وہ اب تک چلی آتی ہے۔ مسٹر چکبست نے ان غلطیون کی طرف بھی توجہ نہین کی۔ اِس دعوے کی تائید مین آپ ذیل کے دو شعر پیش کرتے ہین۔

۳۵ (۱) رہرو کو دیا بہ لطف و اکرام آتے آرام جاتے پیغام

۳۶ (۲) دیکھا تو تمام دشت گلزار دائین بائین دو رستہ بازار

پہلے شعر کی نسبت آپ فرماتے ہین کہ " صاف ظاہر ہے کہ "پیغام" کی جگہ اصل مین "انعام" کا لفظ ہوگا " میری سمجھ مین نہین آتا کہ " پیغام " کی جگہ " انعام " کا لفظ کیون ہوگا۔ سرا مین جو مسافر ٹھہرتے ہین اُن کو سرا کا مالک کسی قسم کا پیغام تو دے سکتا ہے مگر وہ انعام کیون دینے لگا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اِس اعتراض کی تشریح کردی جاتی۔

دوسرے شعر کی نسبت تحریر ہے کہ " دو رستہ کی جگہ " دو دستہ " ہوگا " ممکن ہے کہ اہل عرفان اِس اصلاح کا اصل منشا سمجھ لین۔ میرا فہم تو اس تصرف کا مطلب سمجھنے مین قاصر ہے۔ شاید حضرت شررؔ کا یہ خیال ہو کہ " دو رستہ " لکھنؤ یا دہلی کا محاورہ نہین۔ اِس شبہے کے مٹانے کے لئے دو شعر تمثیلاً درج ذیل ہین۔

سب دوکانین دورستہ ہون رنگین
حد سے افزون ہو شہر کی تزئین

طلسم الفت (قلق)

گھر سے نوشہ کے تا مکان عروس
یون دو رستہ تھے جھاڑ اور فانوس

دو رستہ جو روشن چراغان ہوے
تپنگے خوشی سے غزلخوان ہوے

(میر حسن)

مضمون کے آخری حصّے مین حضرت شرر کا اشہب قلم بالکل بے قابو ہو گیا ہے چنانچہ بلا وجہ آپ نے اکثر ذاتی حملے مجھ پر کیے ہین ۔ مثلاً متعدد جگہ آپ نے مجھے تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے اور اس رنگ کے فقرے لکھے ہین ۔

"ہمارے دوست نے بہت سی اور نئی غلطیان پیدا کر دین"

"اہل زبان سے پوچھیے کہ اس اصلاح سے شعر بنا، یا بگڑا"

"اس اصلاح نے شعر کی مٹی خراب کر دی ۔

"غرض اس اصلاح مین بھی ناسمجھی نے مثنوی پر ظلم ہوا ہے"

"بے تکلفی کو خاک مین ملانے کے بعد شعر کو کیا غارت کر دیا"

"افسوس ان اصلاحون سے مثنوی کو کیسے گہرے اور بُرے زخم لگے ہین"

اور جس بنیاد پر آپ نے ان ہوائی تیرون کا مجھے نشانہ بنانا چاہا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ۔ آپ فرماتے ہین کہ "مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے ایڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی ایڈیشن (یعنی وہ ایڈیشن جو نسیم کی زندگی مین مطبع حسینی مین ۱۲۹۳ھ ۱۸۴۳ء شایع ہوا تھا) کے مطابق درست کر کے شایع کیا ہے

مین نے اس کا اندازہ کرنے کے لئے مطبع نامی کی آخر ۱۹۳۳ء کی چھپی ہوئی گلزار نسیم منگوائی اور اُس سے مقابلہ کرکے دیکھا" واقعی تحقیق و تنقید کے معنی یہی ہین مین کہتا ہون کہ اگر حضرت شرر منشی نولکشور کے مطبع کی چھپی ہوئی مثنوی سے اس نئے ایڈیشن کا مقابلہ کرتے تو آپ کو بہت سے اور "اصلاحین" اور تصرفات مل جاتے۔ خیر جو کچھ حضرت شرر نے میری نسبت تحریر فرمایا ہے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا مین تہذیب مضمون نگاری کے خلاف سمجھتا ہون۔ میرا جواب صرف اس قدر ہے۔ ع

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جن اشعار مین حضرت شرر کو تصرف بیجا کا شک پیدا ہے۔ اُن مین سے اکثر مین واقعی کتابت کی غلطیان موجود ہین۔

غلط	صحیح
بولی وہ جمیلہ کہہ کرون کیا	بولی وہ جمیلہ پھر کرون کیا
پو پھٹتی ہے چُگ اُٹھون کا ٹوٹا	پَو پھٹتے ہی جُگ اُن کا ٹوٹا

ع۱ جس حالت مین کہ حضرت شرر نے ایک نقطے یا شوشے کے گھٹ جانے یا بڑھ جانے کو تصرف بیجا قرار دیا ہو اس حالت مین آپ سے یہ امید نہین ہوسکتی کہ آپ کسی لفظی تغیر کو کتابت کی غلطی تسلیم کرین لیکن کاتبون کے لئے ایسی غلطی کرنا کوئی نئی بات نہین ہے۔ حضرت شرر کے اسی اعتراضات والے مضمون مین گلزار نسیم کا ایک مصرع اس طرح چھپا ہے۔ ع واعظ تو چلے تو تفنگ سے وہ پو جہل و تعصب کا اشارہ تو یہی ہے کہ مین یہی کہون کہ حضرت شرر نے "تو" بڑھا کر اچھے مصرع کی بے تکلفی اور سادگی کو خاک مین ملا دیا ہے۔ یا ناموزون کر دیا لیکن عقل سلیم کہتی ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے نہ کہ مضمون نگار کی۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ایسی کتابت کی غلطی ہو جانا "فاختہ کے پڑھنے" کی طرح ناممکن نہین ہے۔

صحیح	غلط
جلتی تھی ہمیشہ دختر اس کو	جلتی تھی ہمیشہ دختر اسکو
قاصد نے جو رُخ پری دکھایا	قاصد نے رُخ پری دکھایا
قسمت سے مقر ہے اب نہ نامن	قسمت سے مقر ہے اب[ہ] یہ نامن
صیادنی لائے پھانس کر صید	صیاد تھی لائی پھانس کر صید
چلیے گا تو ساتھ ہین بلا عذر	چلیے گا تو ساتھ مین بلا عذر

اِن مصرعون کے علاوہ اور جن اشعار پر حضرت شرر کو "اصلاح" یا "تصرف" کا شک ہوا ہوا ہے وہ اسی حالت پر ہین جس حالت مین کہ وہ اصلی اڈیشن مین پایے گئے تھے۔ اِن مین اصلی اڈیشن پر اگر کہین تصرف کیا ہے تو وہ صرف اِس قدر کہ یاے معروف کے بدلے یاے مجہول، یا اکثر یاے مجہول کے بدلے یاے معروف بنادی ہے۔ کیونکہ پُرانے زمانے کے کاتب یاے معروف اور یاے مجہول کا فرق نہین مانتے تھے۔ "نامی پریس" کی مثنوی کو جس شخص نے ترتیب دیا ہے اُس نے اکثر قدیم محاورون کے بدلے اس زمانے کے محاورے لکھدیے ہین۔ غالبًا اسی بنا پر حضرت شرر فرماتے ہین کہ "بازاری پریس نے مثنوی کو بگاڑا نہین بلکہ بنا دیا" میری راے مین اِس قسم کا تصرف کرنا طالبانِ فن زبان کے حق مین ظلم کرنا ہے۔ چاہیے عامیانہ مذاق کے لوگ ایسے تصرفات کو پسند کرین۔ کیونکہ ان کی نظر وسیع نہین ہوتی ہے۔ مگر نقادانِ سخن جانتے ہین کہ مرتب کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی گنجینہ دار معانی کی چھوڑی ہوئی امانت مین کسی طرح کی خیانت کرین

ہ اِس مصرع مین "نہ" کے بدلے "یہ" چھپ گیا ہے۔ حضرت شرر نے "مقر" پر بدگمانی ظاہر کی ہے لیکن خدا جانے کس مصلحت سے "یہ" کو چھوڑ دیا۔

آخر مین حضرت شررؔ اپنے مضمون کی نسبت فرماتے ہین کہ "بعض حضرات کو یقیناً یہ تحریر ناگوار گذرے گی اور مین بھی خدا سے چاہتا ہون کہ انہین سخت ناگوار گزرے۔ کیونکہ ایسی صورت مین وہ شاید زیادہ جوش سے جواب لکھین گے"۔ مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علمی مباحثون مین اس جوش بیجا کا اظہار جس کے حضرت شررؔ طالب ہین اصل مطلب کو خبط کر دیتا ہے اور صرف سخن پروری پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اگر حضرت شررؔ کے مضمون کے جواب لکھنے مین کوئی صاحب اس قسم کا جوش صرف کرین گے جس سے کہ مضمون مذکور کا ایک ایک حرف معمور رہے تو سوائے اس کے کہ انصاف کا خون ہوا اور کچھ نہ حاصل ہوگا۔ نقاد سخن کا فرض یہ ہے کہ وہ اس بات کے لئے دست بدعا نہ رہے کہ دوسرے ن کو اس کی تحریر ناگوار گزرے بلکہ اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے مخالف اس کے دلائل پوری طور سے سمجھ جائین۔

ایک یادگار مشاعرہ

(ماخوذ از "ادیب" اپریل ۱۹۱۰ء)

تیرہ چودہ سال کا عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں پنڈت للتا پرشاد صاحب وثیقہ دار کے یہاں ایک معرکہ آرا مشاعرہ ہوا تھا۔ مصرع طرح یہ تھا۔

" اُگتی ہے جائے سبزہ کنگھی مرے چمن میں "

لکھنؤ کے قریب قریب تمام اساتذہ جمع تھے لیکن جلال مرحوم نہیں تشریف لائے تھے قریب ۴ بجے شام کے مشاعرہ شروع ہوا اور تقریباً دو بجے شب کو ختم ہوا تمام اساتذہ نے اپنے اپنے رنگ میں پُر زور غزلیں کہی تھیں اور پر زور غزلیں کس طرح نہوں۔ اِس زمین میں آتش کی یادگار غزل کا نغمہ سب کے کانوں میں سمایا ہوا تھا۔ سبحان اللہ کیا کیا شعر فرمائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بزم خیال میں نور خداداد کی شمعیں روشن ہیں۔ میرے دوستو ذیل کے اشعار پر نظر ڈالو اور فصیح لکھنؤ کی روح پر دُرود پڑھو۔ ے

شیریں زباں ہوئی ہی فرہاد کے دہن میں ... لیلی پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں
دو روز ہی یہ لطف عیش و نشاط دُنیا ... بوئے شب عروسی مہمان ہی پیرہن میں

بازار مصر مین چل یوسف کا سامنا کر — کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائیگا چلن مین

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہماری — تو آسمان ہین اپنے اکبر کے نورتن مین

آیا تھا بلبلون کی تدبیر مین گلون نے — ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن مین

یادِ فقیر آگئے اُس بُت کے بھولتا ہے — ایکی گرہ مین دونگا زُنّار برہمن مین

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی — کیا کیا جلا ہو ساکھو پھولا جو ڈھاک بن مین

آخری شعر تو ایسا ہے کہ اِس کا جواب اُردو شاعری مین ملنا مشکل ہے۔ آتش کے بعد اساتذۂ قدیم مین اسیر مرحوم نے دو ایک شعر اس زمین مین خوب کہے ہین۔ فرماتے ہین۔

تم رنگ ہو سخن مین تم پھول ہو چمن مین — تم روح ہو بدن مین تم شمع انجمن مین

گھر کر سحاب آیا نہرون مین آب آیا — دورِ شراب آیا مستو چلو چمن مین

آفت مین جان خستہ پاے امید بستہ — دل کشتیِ شکستہ دریاے حزن مین

امیر و داغ کی بھی غزلین اسی طرح مین موجود ہین اور دونون نے ایک ایک شعر خوب کہا ہے

داغ۔ کیا کیا کدورتین ہین اس وعدۂ ازل کی — آتی ہے خاک لینے آندھی اسی چمن مین

امیر۔ کیا جانیے کہ چھوڑا پھولون نے کیا شگوفہ — بلبل پکارتا ہے صیاد کو چمن مین

قدر بلگرامی کا بھی ایک شعر یاد آگیا۔

لب پر ہنسی جو آئی دندان کھلے دہن مین — چمکی یمن مین بجلی جاکر گری عدن مین

خیر کجا بود مرکب کجا تاختم۔ کہان حال کا مشاعرہ کہان آتش و اسیر لیکن زمین ایک ہی ہے گو کہ گلکاریان مختلف ہین۔ پس نگاہِ شوق کا ایک تختے کی سیر کرتے ہوے دوسرے تختے کی

جانب بھٹکت جانا قابل معافی ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اِس وقت مشاعرہ مذکور کی تمام غزلین موجود نہین جو کچھ قلیل سرمایہ اشعار کا حافظہ کی امانت مین موجود ہے۔ اُسے قلم کاغذ کے سپرد کرتا ہون۔ آرزومند دل لطف اُٹھائین اور داد دین۔ میر رضا حسین تنہا لکھنؤ کے ایک پُرانے شاعر تھے۔ میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور شاگرد بھی۔ اُن کو فخر تھا کہ آتش کے رنگ مین کہنے والا اُن کے سوا کوئی نہ تھا۔ آدمی کم استعداد تھے مگر قدیم اساتذہ کے فیضانِ صحبت نے زبان کو صاف اور طبیعت کو برق کر دیا تھا۔ اُنھون نے اِس مشاعرے مین جو غزل پڑھی تھی اُس کے چند شعر لکھتا ہون۔ ؎

فصلِ خزان کے آتے کیسی ہوا چلی یہ — شمع مزارِ بلبل گُل ہو گئی چمن مین
پہونچی یہان تلک ہے اب لاغری ہماری — بنتی ہین دو قبائین مجنون کے پیرہن مین
آتش کی یہ زمین ہے جل جائینگی زبانین — آہوستہ چر سکین گے اس شیر کے بن مین

آغا مظہر صاحب مظہر ایک آزاد اور رنگین مزاج بزرگ تھے ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی اور زبان ظرافت کے چٹخارے سے کامیاب تھی۔ ان کی استعداد علمی معقول تھی اور مضمون آفرینی کی طرف طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ غالب کے بڑے مداح تھے اور جدت کے عاشق تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو شعر کہتا ہون اُسے اپنا کر لیتا ہون۔ اِس زمین مین بھی اچھے اچھے شعر کہے تھے۔ دو تین شعر یاد رہ گئے۔

کیون حُسن بے ادب ہے یون عشق سے چمن مین — منقار بلبلون کی غنچون کے ہے دہن مین
اشکون نے عطر کھینچا گلہائے داغ دل کا — تسخیر شمس شبنم کرتی ہے اِس چمن مین

ناز و نیاز دیکھیں بلبل کے اور گل کے ہم بھی چلیں چمن میں تم بھی چلو چمن میں

سید غضنفر علی خان صاحب حکیم منشی آسیر کے بڑے صاحبزادے لکھنؤ کے گرانمایہ شاعرون مین تصور کیے جاتے تھے۔ عربی و فارسی کی استعداد کمال تک پہونچی ہوئی تھی اور علم عروض کے زبردست ماہر تھے۔ مضمون آفرینی اور جدت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنے نامور باپ آسیر مرحوم کی مشکل پسندی کے رنگ کو بھی دو آتشہ کر دیا تھا۔ غزل مین بھرتی کا ایک شعر پڑھنا اُن کے لئے کسر شان تھا۔ اپنے نزدیک وہ ہر ایک شعر مین کوئی نہ کوئی جدت اور اُستادی کا پہلو رکھتے تھے۔ اب یہ کہ اس کوشش مین کامیابی کہان تک ہوتی تھی اس کا انصاف قدردانون پر تھا۔ عموماً اُن کے اشعار سادگی کے جوہر سے معرا ہوتے تھے اور اکثر مغلق ہوتے تھے لیکن ان کا کلام دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک اُستاد جید کا کلام ہے جو شعر صاف نکل جاتا تھا وہ قیامت کرتا تھا۔ مشاعرون کی طرح پر وہ غزل بہت کم کہتے تھے۔ کیونکہ شاعری کا منصب مقدمہ بازی نے چھین لیا تھا لیکن اِس مشاعرہ کے لئے اُنہون نے بھی غزل کہی تھی اور خوب کہی تھی۔ چند اشعار جو اس وقت یاد ہین ہدیۂ ناظرین ہین۔

پھر غیر غیر ہی ہے گو ہے اُس انجمن مین بیگانگی سبزہ جاتی نہین چمن مین

چھڑ کا نمک اُسی جا موے سفید نے بھی زخم غم جوانی جس جس جگہ تھے تن مین

تنہا گئے لحد کو کب صاحبانِ دولت دزدِ کفن کی نیت لپٹی رہی کفن مین

فصلِ بہار کتنی باتین کریگی تم سے ہے یاد کی گرہ وہ غنچہ ہے جو چمن مین

بلبل نے سر جو کچلا گل نے دکھائی آنکھین کس سرکشی پہ سبزہ دب کر رہا چمن مین

نالون سے بلبلون کے گل تنگ آکے بولے   یا یہ رہین چمن مین یا ہم رہین چمن مین

نواب یوسف حسین خان صاحب یوسف شرفاء لکھنؤ مین سے تھے اور قدیم تہذیب کے جو جواہر اور اوصاف ہونا چاہئیں وہ اُن مین سب موجود تھے۔ اُن کی زیارت کرنے سے روح کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔ شاعری مین منشی اسیر کے شاگرد تھے اور اپنے اُستاد کو ہمیشہ محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے لیکن اُن کی شاعری کے رنگ اور اسیر کے رنگ سخن مین اندھیرے اُجالے کا فرق نظر آتا تھا۔ زبان آب کوثر مین دھوئی ہوئی۔ بندشین نورانی اور پاکیزہ۔ شعر کیا ہوتا تھا گویا نور کا دریا بہتا نظر آتا تھا۔ پڑھنے کا یہ عالم تھا کہ جس مضمون کا شعر پڑھتے تھے اُس کی تصویر محض آواز کے اُتار چڑھاؤ اور آنکھ کی گردش سے کھینچ دیتے تھے۔ معمولی سا شعر بھی اُن کی زبان سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال مین ان کی زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی اور شاعری کے رنگ مین ڈوبی ہوئی تھی۔ فصاحت اُن کے لئے پیدا ہوئی تھی اور وہ فصاحت کے لئے۔ ؎

اللہ رے صفائے بیان حدیث دوست   دم بند ہے فصاحتِ اہلِ حجاز کا

اُنھون نے جو غزل مشاعرے کے لئے فرمائی تھی اُس کا رنگ تمام غزلون سے جُداگانہ تھا اور خاص اُن کے مذاق سخن کا نشان دیتی تھی۔ چند اشعار لکھتا ہون۔ ؎

بوتل کے کاگ اُڑ اکر نکلی ہے مے چمن مین   ٹوپی اُچھل رہی ہے مستون کی انجمن مین
ساغر بھرے دھرے ہین ساقی کی انجمن مین   لہرا رہا ہے کوثر فردوس کے چمن مین
صیاد کا ہے دھڑکا پھولون کی انجمن مین   ہاتھون اُچھل رہا ہے بلبل کا دل چمن مین
کس نے کہا کہ بیٹھو پھولون کی انجمن مین   حسرت بھری نگاہین نرگس کی ہین چمن مین

پتّون سے نخلِ گلشن دستک جو دے رہے ہین ۔۔۔ پُوری گیا ہی شاید بلبل کا دل چمن مین
وہ کون سا حسین ہی تم پر نہین جو مرتا ۔۔۔ بھرتا ہی حُسن یوسف پانی چہ ذقن مین
مرنے کے بعد ایسے ہم کچھ ہُوئے تبرّک ۔۔۔ بوسیدگی نے چوما ہر استخوان کفن مین
ہر رنگ کے گلون نے ڈالا جو عکس یوسف ۔۔۔ طاؤس بن گئی ہے بادِ صبا چمن مین

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یوسف حسین خان صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ ؎

مرنے کے بعد ایسے الخ

تو حکیم صاحب نے بہت تعریف کی ۔ وجہ یہ تھی کہ یہ شعر خاص اُن کے رنگ کا تھا مگر باوجود اس کے حضرت یوسف کی زبان کی جلا اس مین بھی موجود ہے ۔

پنڈت بشن نراین صاحب دَر کی ابتدائی شاعری کا یہ زمانہ تھا ۔ ان کا بھی ایک شعر یاد رہ گیا ۔

گل کے جو کان اُڑ لئے بات بات کے بلبلون نے ۔۔۔ بولی کلی چٹاک کر کیا شور ہے چمن مین

ایک پُرانی وضع کے بزرگ موجود تھے اور غالبًا منشی آسیر مرحوم کے شاگرد تھے اُنھون نے ایک رنگ قدیم کا شعر کہا تھا ۔ ؎

دریاے خونِ عاشق لہرین جو رہا ہے ۔۔۔ بیتاب مچھلیان ہین بانڑوے تیغ زن مین

مگر جو شعر حاصل مشاعرہ ثابت ہوا اور جس کی دھوم دوسرے روز تمام شہر مین ہوگئی وہ شعر حضرت بدر کا تھا ۔ حضرت بدر کا نام مجھے اس وقت یاد نہین ۔ اتنا ضرور جانتا ہون کہ جناب حکیم کے شاگرد تھے اور لکھنؤ کے پُرانے نوابزادون مین تھے اور دولت کثیر رکھتے تھے ۔ شعر بھی تفنن طبع کے طور پر کہہ لیا کرتے تھے ۔ اِس مشاعرہ مین اُنھون نے یہ شعر پڑھ کر قیامت کر دی ۔ ؎

دامن کو چاک کر کے رُسوا ہوئی ہے کیا کیا — تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

اِس شعر کے علاوہ تمام غزل پھیکی ہے - اور اس شعر کا مضمون بھی آتش کے ایک شعر سے لڑتا نظر آتا ہے۔ ؎

نہ پھاڑنا تھا زلیخا کو دامنِ یوسف — یہ اس کا پردۂ عصمت دریدہ ہونا تھا

لیکن حق یہ ہے کہ بدر کا شعر صفائی بندش کے لحاظ سے آتش کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے اور یہی اس کے مقبول ہونے کا باعث ہوا۔

نواب ہادی علی خان یکتا ایک آزاد منش بزرگ ہین۔ غزل کم کہتے ہین لیکن تخمیس کے بادشاہ ہین - اور اس رنگ مین ان کا جواب لکھنؤ مین نہین ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے تخلص یکتا رکھا ہے۔ اِس مشاعرے مین آتش کی غزل پر اُنھون نے مصرع لگائے تھے۔ جو کچھ یاد ہے لکھتا ہون۔ ؎

"تومن شُدی" کا غل ہے ہر سُو ہر ایک بن مین — "من تو شدم" رچا ہے فرہاد کوہکن مین

یہ اتفاق باہم کمتر ہے مرد و زن مین — شیرین زبان ہوئی ہے فرہاد کے دہن مین

لیلیٰ پکارتی ہے مجنون کے پیرہن مین

سامانِ ظاہری ہے یہ اختلاطِ دُنیا — کس پھیر مین پڑا ہے چھوڑ ارتباطِ دُنیا

جب ایک شان فنا ہے پھر کیا بساطِ دُنیا — دو روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دُنیا

بوے شبِ عروسی مہمان ہے پیرہن مین

مشاعرے کے بعد حضرت یکتا ایک روز ملے اور حضرت بدر کے شعر پر جو مصرع لگائے تھے وہ سنائے۔ وہ بھی لکھتا ہون۔

عاشق ہوئی ہے کیا کیا شیدا ہوئی ہے کیا کیا | بیدل ہوئی ہے کیا کیا جویا ہوئی ہے کیا کیا
در پردہ یہ قیامت برپا ہوئی ہے کیا کیا | دامن کو چاک کر کے رُسوا ہوئی ہے کیا کیا

تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

علاوہ اِن حضرات کے جن کے اشعار میں نے لکھے ہیں بہت سے شعرا جمع تھے اور غزلیں بھی پڑھی تھیں مگر مجھے اسی قدر اشعار یاد رہ گئے۔ اب تک میری نگاہوں کے سامنے اِس مشاعرے کی تصویر ہے۔ کم سے کم ڈیڑھ سو حضرات نے غزلیں پڑھی تھیں جس میں اساتذہ بھی تھے، شاعر بھی تھے، خوشگو بھی تھے اور محض تخلص کے گنہگار بھی تھے۔ اور سامعین کی تعداد دو سو تین سو سے کم نہ تھی۔ جب اچھا شعر پڑھا جاتا تھا تو قدردانوں کی تعریف اور واہ واہ کے نعروں سے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ چھت اُڑ جائے گی۔ ایک طرف مظہر مرحوم کے چٹکلے روتے کو ہنساتے تھے۔ دوسری جانب جناب حکیم مرحوم کی مولویانہ اور ادب آمیز ظرافت اپنے رنگ میں مزہ دے جاتی تھی۔ نواب یوسف حسین خان کی نورانی صورت سے تمام محفل نورانی ہو رہی تھی۔ ہادی علی خان صاحب یکتا کا اندازِ تعریف قیامت تک نہ بھولیگا۔ افسوس ہے تو یہ ہے کہ اب یہ رنگ دیکھنا نہ نصیب ہوگا۔ پانچ چھ سال کا عرصہ ہوا جناب حکیم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مظہر کے مرنے سے بزم احباب سونی ہو گئی۔ نواب بنّے صاحب مشّاق بھی اس مشاعرے میں موجود تھے مگر غزل طرح پر نہیں پڑھی تھی۔ موت نے جوانی ہی کے عالم میں ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ایک نواب یوسف حسین خان باقی رہے تھے افسوس ہے کہ پار سال طاعون کی ہوا سے وہ چراغ بھی گل ہو گیا۔ جناب جلال کا زخم ابھی تازہ ہے۔ ع

اُٹھ گئی ہین سامنے سے کیسی کیسی صورتین
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

اب مشاعرے ہون تو کیونکر ہون - خیر خدا عزیز و محشر کو سلامت رکھے کہ اُنھون نے مشاعرون سے علمی مذاق کا سلسلہ قائم کیا ہے ورنہ زمانۂ حال کے نوجوانون کی طبیعتین تمام سنجیدہ مشاغل سے پھری ہوئی ہین اسی مین شعر و سخن کے مذاق کا خون بھی شامل ہے - رسّا کھینچنا - ہاکی یعنی ولایتی گلی ڈنڈا کھیلنا - ٹینس کے دام مین اسیر رہنا اب تہذیب و شائستگی کا معراج خیال کیا جاتا ہے لیکن عقیدتمند دل مشاعرے کے بدلے مشاعرے کی یاد ہی سے طبیعت کو تازہ کر لیتے ہین ورنہ یہ چمن اب کہان -

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

نوٹ :- چونکہ تمام اشعار محض حافظے کی مدد سے لکھے گئے ہین اس لئے اگر کسی مصرع یا شعر مین تغیر و تبدل ہو گیا ہو تو اہل تنقید معاف فرمائین - (چکبست)

اَوَدھ پنچ

(ماخوذ از "گلدستۂ پنچ" ۱۹۱۵ء)

ہندوستان کے جس جس گوشہ مین اُردو زبان کا نغمہ سنائی دیتا ہے وہان شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان "اودھ پنچ" مرحوم کے ذکر خیر سے آشنا نہ ہون۔ "اودھ پنچ" نے تین پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردے مین اخبارون کی دُنیا مین سلطنت کی ہے اور اس کی پُرانی جلدون کے گور غریبان مین اکثر ایسے اہل کمال دفن ہین جن کے قلم کی دھاگ دلون مین لرزہ پیدا کرنے کے لیئے کافی تھی۔

جس وقت "اودھ پنچ" نے دُنیا مین جنم لیا اُس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان مین تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۶ء مین پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور ۱۸۷۷ء مین "اودھ پنچ" نے زبان اور ظرافت کے چہرے سے نقاب اُٹھائی۔ اِس چالیس[1] سال کے عرصے مین اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے۔ مثلاً لاہور مین "اخبار عام" اور "کوہ نور" کا دور تھا

---

[1] ان اخبارون کے اکثر حالات منشی بالمکند گپتا مرحوم کے اُردو اخبارون کے تذکرہ سے اخذ کئے گئے ہین۔ جو "بھارت متر" اور "زمانہ" مین شایع ہوا تھا۔

یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے۔ دہلی مین "اشرف الاخبار" کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "وکٹوریہ پیپر" سیالکوٹ سے جاری تھا۔ "کشف الاخبار" بمبئی مین اور "جریدۂ روزگار" مدراس مین اُردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ "کارنامہ" اور "اودھ اخبار" لکھنو سے شایع ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ "کارنامہ" کا کام تمام ہو گیا۔ "اودھ اخبار" ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی جب تھا۔ اِن کے علاوہ "اودھ پنچ" کی اشاعت کے قبل بہت سے اُردو اخبار اپنی پیدایش اور موت کی منزلین طے کر چکے تھے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ اخبار محض خبرون کی تجارت کرتے تھے۔ بجز "لارنس گزٹ" کے جو کہ میرٹھ سے شایع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی۔ عام طور سے ان اخبارون کا نہ کوئی خاص پولیٹکل یا سوشل مسلک تھا نہ یہ کسی دستور العمل کے پابند تھے۔ اُردو اخبار نویسی کی تاریخ مین "اودھ پنچ" اور "ہندوستانی" پہلے دو اخبار ہین جنھون نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولون پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ "ہندوستانی" کا دور "اودھ پنچ" کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولیٹکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا اس نے اسے بھی اپنی ذات کی طرح پولیٹکل خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹکل اور سوشل معرکہ آرائیون سے بے خبر نہ تھا۔ اِس کا مستقل سوشل اور پولیٹکل مسلک تھا۔ اِس صوبے مین "ہندوستانی" کانگرس کا چراغ سمجھا جاتا تھا مگر جن گوشون مین اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہان "اودھ پنچ" کی بجلی چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ مین اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستون کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ

اِس کی ذات سے اِس تحریک کو کوئی نفع نہین پہونچا ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً "انڈین پنچ" "بمبئی پنچ" "بانکی پور پنچ" وغیرہ اس کی تقلید مین نکلے مگر وہ دُنیا کی ٹھوکرین کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہین ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اُردو زبان پر عرصے تک چلتا رہا اور اس طولانی زمانہ مین جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور مین آئین اُن پر نظر ڈالنے سے اُردو نویسی کے دربار مین ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہین۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقرون اور لطیفون پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اِس مین نکل جاتی تھی وہ مہینون زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی مگر قومون کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلی درجے کی ظرافت نہین کہہ سکتے لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر مین بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطون پر نظر ڈالنا چاہیئے۔ اُردو نثر کے ان جواہرات مین جہان اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہین وہان ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہین ہے۔ نہ پھبتیان ہین نہ طعن و تشنیع کے جگرخراش فقرے ہین محض روزمرہ کی باتین ہین۔ مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔ باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفون کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے ان کے قلم سے پھبتیان اس طرح نکلتی ہین جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیرون کا نشانہ بنتا

ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اُس کی بیکسی پر ہنستے ہین۔ اِن کے فقرے دل مین ہلکی سی چٹکی نہین لیتے ہین بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہین۔ اِن کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہین اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہین۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجۂ اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہین جن کو دیکھکر مذاق سلیم کو آنکھین بند کر لینا پڑتی ہین۔ ایسا ہنو معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابل معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اُس زمانہ کی ہوا کھائے ہوے تھے جب مذاق و بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیان ہماری نظر سے نہین دیکھی جاتی تھین۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے اور یہی دُنیا کا دستور ہے۔ ممکن ہے کہ جن باتون کو ہم آج پھول سمجھتے ہین وہ آیندہ نسلون کی آنکھون مین کانٹے کی طرح کھٹکین۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اُس نے اُردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اُتار کر جس مین سوائے کاغذی پھولون کے کچھ نہ تھا۔ ایسے پھولون سے آراستہ کیا جن مین قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا اودھ پنچ کے پہلے رجب علی سرور کے طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع و بناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اُس زمانے مین جو اُردو اخبار جاری تھے اُن کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اُردو کہہ سکتے ہین۔ آج نثر اُردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد مین اودھ پنچ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والون مین مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف۔ حضرت احمد علی صاحب شوق۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر

نواب سید محمد آزاد۔ بابو جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی۔ حضرت اکبر حسین صاحب اکبر یادگار نام ہین۔ ان لوگون کے نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرز نو کے موجد ہی نہین ہین بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہین۔ ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خدا داد بے تکلفی سے معمور ہے اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نثر کے نامہ نگارون مین طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور نیز زبان کی پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورے کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اورون کے مقابلے مین چوکھا ہے۔ احمد علی صاحب شوق کے مضامین مین ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و محاورے کی تحقیقات کا خاص لطف ہے۔ حضرت کسمنڈوی مرحوم کی عبارت خاص طور سے دلکش ہے مگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے۔ ہجر کا رنگ خاص یہ ہے کہ ان کی ظرافت بمقابلہ اورون کے بد مذاقی اور طعن و تشنیع کے کانٹون سے پاک ہے۔ برق کی عبارت مین ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے۔ مگر زبان نہایت صاف اور ستھری ہے۔ آزاد کا قلم نواب زادون کی بفکری و عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے مین مشاق ہے۔ منشی سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے۔ مضمون کیا ہین چھوٹے چھوٹے چٹکلون اور لطیفون کے ذخیرے ہین۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے گفتگو کر رہا ہے۔ عبارت کہین کہین مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعارون سے گرانبار نظر آتی ہے مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کا جی نہین گھبراتا۔ ظریفانہ نظم کے میدان مین حضرت اکبر سب سے دس قدم آگے ہین۔ طبیعت کی خدا داد شوخی اکثر زبان کی صفائی سے بازی لے جاتی ہے۔ مگر عموماً سوشل پولیٹیکل اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبر نے نظم کئے ہین وہ کسی

دوسرے کو نصیب نہیں۔ ان کا معیار ظرافت بھی اوروں کے مقابلے میں لطیف تر ہے اودھ پنچ کی محفل انھیں پرمذاق اور نورانی طبیعتوں سے آراستہ تھی اور اب بھی اگر کوئی شخص اُردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے کھنڈروں کی زیارت اُس کے لئے ضروری ہے۔ اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا دُنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پرمذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم، چہلم، عید، شب برات، ہولی دوالی، بسنت کے جلسے، عیش باغ کے میلے، رقص و سرود کی محفلیں، مشاعرے، عدالت کی روبکاریاں، مرغ بازی، بٹیر بازی کے ہنگامے۔ الکشن کے معرکے ایسے مشغلے تھے جو ہمیشہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے اور اُن کی طبیعتوں کے لئے تازیانہ کا کام دیتے تھے ساقی نامے برسے، بارہ ماسے، دوہے، ٹھمریاں، غزلیں، رباعیاں وغیرہ نظم کرتے میں اس کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون لوکل علیہ الرحمہ کے عنوان سے لکھتے تھے جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔

زندہ دلی کی یہ تمام تصویریں اودھ پنچ کے بوسیدہ مرقع میں موجود ہیں۔ گلدستہ پنچ کی دو جلدوں میں اُن کا پورا نقشہ اُتارنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مگر زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے جو کچھ ہو سکا اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے علاوہ اودھ پنچ میں شاعری اور

صحت زبان کے متعلق اکثر ایسے زبردست مباحثے چھڑے جو مہینوں اور برسوں تک قائم رہے اور جن کی وجہ سے اُردو دان سوسائٹی میں عرصے تک چہل پہل رہی۔

پہلے معرکہ کا تعلق "فسانہ آزاد" سے ہے۔ سرشار مرحوم ابتدا میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے اور اس کے گہوارے کے گرد بیٹھنے والوں میں تھے۔ جس رنگ کا اودھ پنچ عاشق تھا اُسی رنگ میں وہ بھی ڈوبے ہوے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمانہ کے جس انقلاب نے دُنیا کو اودھ پنچ کی صورت دکھائی اسی نے سرشار کی طبیعت کو بھی پیدا کیا۔ اودھ پنچ کے ایک سال بعد فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اودھ اخبار کے اڈیٹر ہونے کی وجہ سے سرشار نے یہ سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا ورنہ فسانہ آزاد کا دریا بھی اودھ پنچ ہی کے چشمہ سے جاری ہوتا کیوں کہ دونوں کا مذاق تحریر یکساں ہے اور دونوں ایک ہی باغ کے دو پھول معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اودھ پنچ نے اودھ اخبار کو بنیا اخبار خطاب دے رکھا تھا اور اس کے حال پر اودھ پنچ کے ظریفوں کی خاص عنایت تھی۔ جب سرشار اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوے تو کچھ روز تک تو ذاتی مراسم کا پردہ قائم رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ طرفین سے طبیعتیں بے قابو ہوتی گئیں اور آخر کار فسانہ آزاد پر اعتراضات شایع ہونے لگے۔ اودھ پنچ کا فسانہ آزاد پر خاص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگمات کی زبان اس میں لکھی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں ہے بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے۔ اس قسم کے اعتراضات کے دونگڑے عرصے تک اودھ پنچ کے بادلوں سے برساکئے اور ظرافت کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ ان اعتراضات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ضرور

درست ہیں مگر زیادہ تر طبّاعی پر مبنی ہیں۔

اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمہ میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ جب یہ مقدمہ شایع ہوا تو اس بحث نے آودھ پنچ کی بارود کے لئے چنگاری کا کام کیا۔ آودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے۔ جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطرتی شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔ خلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی تھیں اُن کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعرا کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی منشا آودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعرا کی توہین ہو۔ اِن خیالات کا دلوں میں اُمنڈنا تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ بھی مُدت تک جاری رہا جس عنوان سے آودھ پنچ کے شہسواروں نے پانی پت[1] کے میدان میں طرارے بھرے ہیں وہ بعض صورتوں میں قابل اعتراض ضرور ہے۔ مگر نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑیگا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہ تھی۔

تیسرے ہنگامہ کی رونق داغ کی شاعری سے ہے۔ آودھ پنچ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی۔ اس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آودھ پنچ کے

---

[1] اودھ پنچ میں کلام حالی پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اِس کے عنوان میں یہ شعر مولانا حالی کے وطن کی مناسبت سے لکھا جاتا تھا۔ ؎ ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے ؛ میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے ؛

ظریفوں کے دل میں لکھنؤ اور دہلی کی رقابت کا زخم ہرا تھا۔ اور دوسرے جانب داغ کے شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بدمذاقی کا خمیازہ غریب استاد کو اٹھانا پڑا اور اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصے تک اڑا کیں جن کا رخ داغ کی شاعری کے علاوہ اس کے حسب و نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنستے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنؤ کے مشہور فسانہ نویس مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شایع کیے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے نسیم کا نام محض فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان و محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارے کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آگئیں اور اودھ پنچ کی بجھتی ہوئی آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہونچی۔ گلزار نسیم کا قصہ تو درکنار رہا۔ مولانا شرر کی زباندانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شایع ہونے لگے اور عرصے تک نظم و نثر کی پھلجھڑیاں چھوٹا کیں۔ یہ سلسلہ بھی سال بھر بعد ختم ہوا۔ اس بحث کے غیر لطیف حصے کے علاوہ نفس مضمون کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں اکثر زبان و محاورے کی تحقیقات کا خاص لطف

موجود ہے۔ اِن مباحثون کے علاوہ اکثر دوسرے اخبارون سے بھی اودھ پنچ سے نوک جھونک ہوتی رہی۔ اِن مین اودھ اخبار اور طوطی ہند پر اس کی خاص توجہ رہی۔ زبان شاعری کی اصلاح کے علاوہ اودھ پنچ کی پولیٹکل خدمات بھی قابل ذکر ہین۔ اودھ پنچ ابتدا سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگرس کے پہلے جو پولیٹکل معرکہ آرائیان پیش آئین۔ ان مین اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ الحاق اودھ انکم ٹیکس۔ البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر ایسے مضامین لکھے جن کا آج شایع کرنا موجودہ قوانین کے جکڑبند کو دیکھتے ہوئے مصلحت اور دوراندیشی کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس نے والیان ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ اُن کی غفلت وعیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی قومی محبت کے وسیع دائرے مین ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ ہندوون کے تہوارون کی آمد کی خوشی مین اودھ پنچ عید اور شب برات کے استقبال سے کم سرگرمی نہین ظاہر کرتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانے مین اِس کا پرچہ سُرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شایع ہوتا تھا اور رنگین مزاج نامہ نگارون کے ساقی نامے اور ترانے وغیرہ ہفتون تک چھپا کرتے تھے۔ اودھ پنچ ہندو مسلمانون کے قومی اتفاق کا ہمیشہ سے معین تھا اور اگر دونون قومون مین کوئی نزاعی امر پیش ہوتا تھا تو اُسے ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس چونکہ قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا یہ بھی اس پولیٹکل تحریک کا دل وجان سے مددگار تھا۔ اِس صوبے مین منشی سجاد حسین مرحوم کانگرس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دھکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے۔ منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قایم رہے۔ ابتدا مین جب سر سید مرحوم نے

اپنی زبان وقلم کے جادو سے اہل اسلام کا دل کانگرس کی طرف سے پھیر دیا تھا اُس وقت سوائے اودھ پنچ کے کوئی اسلامی اخبار ایسا نہ تھا جو علی گڈھ کے پولیٹکل پیپر کا کلمہ پڑھتا ہو۔ ۱۸۸۸ء مین جب سر آکلنڈ کالون سر سید مرحوم اور مفت کے گنہگار راجہ شیو پرشاد کانگرس کا طبقہ اُلٹنے کی فکر مین تھے اُس وقت "ہندوستانی" کے مضامین اور پنڈت اجودھیا ناتھ مرحوم کی دھوان دھار تقریرون کے علاوہ اودھ پنچ کی شمشیر برہنہ اس قومی تحریک کی تائید مین اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ۱۸۹۹ء مین جب کانگرس کا اجلاس لکھنؤ مین ہونے والا تھا تو شہر کے چند سن رسیدہ بزرگون نے اِس کی مخالفت کا غلغلہ بلند کیا۔ اس مخالفت کی تردید مین ہندوستانی اور ایڈوکیٹ مین پند ونصائح کے دفتر کھل گئے لیکن ان واعظانہ فہمائشون کے مقابلے مین وہ مضمون زیادہ کارگر ہوا جو اودھ پنچ مین "اُنٹے بچے والی چیل چلہار" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ اکثر مزاج ایسے ہوتے ہین جو بحث ومنطق کے کڑوے گھونٹ نہین قبول کرتے ہین مگر ظرافت کی چاشنی سے راہ راست پر آجاتے ہین۔ اس صوبے کے پولیٹکل بحث وتحریک مین اس خدمت کا انجام دینے والا اودھ پنچ تھا۔ مذہبی اور قومی رسم ورواج کی اصلاح کے بارے مین اودھ پنچ کا وطیرہ زمانہ شناسی کی رفتار سے الگ تھا۔ اس نے محض علیگڈھ کے پولیٹکل مسلک کی مخالفت نہین کی بلکہ سر سید مرحوم کے نورانی دماغ سے جو مذہبی اصلاح کی شعاعین نکلین اُن پر خاک ڈالنے کی کوشش کی۔ علی گڈھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دیکر اس کے بانی کو "پیر نیچر" کا خطاب دیا۔ اور "نیچریہ مذہب" کا مضحکہ اُڑانے مین کوئی دقیقہ باقی نہین رکھا۔ اسی طرح پردے کی اصلاح اور تعلیم نسوان وغیرہ کے متعلق جو تحریک اہل اسلام مین مغربی تہذیب کے اثر سے

پیدا ہو گئی تھی اس کی بھی سخت مخالفت کی - پردہ کی رسم کی تائید مین حضرت اکبر کے ذیل کا قطعہ زبان زد عام ہے - ؎

بے پردہ کل جو آئین نظر چند بیبیان | اکبر زمین مین غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہُوا | کہنے لگین کہ عقل پر مردون کے پڑ گیا

اسے پڑھ کر اصلاح پسند لوگ اپنے دانت پیسا کرین مگر یہ ماننا پڑیگا کہ اس سے زیادہ لطیف ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ مین مشکل سے ملیگا - کاشکے یہ خداداد جوہر اصلاح و رفاہ کی کوشش مین صرف ہوتا -

اودھ پنچ کی ترقی و وقعت کا راز بہت کچھ اس کے اڈیٹر کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے - منشی سجاد حسین کا مزاج عجب صفات کا مجموعہ تھا - خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی اُن کی گھٹی مین پڑی تھی - مصیبت و تکلیف کے زمانے مین بھی کبھی کسی نے اُن کے چہرے پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی - بیماری کے زمانے مین اگر کوئی مزاج پوچھتا تھا تو کہتے تھے زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفون کا حال اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی - دوا علاج سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض اس لئے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو - بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ مرنا کہتے تھے - اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسون دور رہتے تھے - دنیا کے ناہموار و کاواک پہلو اُن کی نگاہون مین خود بخود کھٹکنے لگتے تھے اور اُن کی پُر مذاق طبیعت کو بلا لحاظ قوم و ملت بیتاب کر دیتے تھے - غیر کا ذکر نہین ان کے دلی دوستون اور عزیزون کو اکثر ان کی بذلہ سنجی کا مزہ

چکھنا پڑا ہے۔ دوستون کی محبت اور قدرشناسی کی بدولت اُنھین ابتدا ہی مین اتنے ذہین اور طباع نامہ نگار مل گئے جو ایک وقت مین شاید کسی دوسرے اخبار کو کم نصیب ہوے ہونگے یہ لوگ غرض اودھ پنچ کے نامہ نگار نہ تھے بلکہ اس کے جان نثارون مین تھے۔ اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے اور کسی دوسرے اخبار مین لکھنا کسر شان سمجھتے تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد یہ رنگ قائم نہ رہا۔ بقول شاعر؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس　　　　عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگارون کا شیرازہ درہم و برہم ہونے لگا۔ ستم ظریف اور ہجر نے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا۔ جوانی کی بےفکری دوسرے نامہ نگارون کا ساتھ عرصے تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے۔ جو کچھ رہی سہی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اُس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس مین کلام نہین کہ اس مٹی ہوئی حالت مین بھی اودھ پنچ کا نام بکتا تھا اور جب کبھی کوئی مضمون اس کے اڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا تو اُس کی دُھوم ہو جاتی تھی۔ علاوہ اِس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوق، نواب سید محمد آزاد اور حضرت اکبر کے نظم و نثر کے مضامین شایع ہوتے رہتے تھے۔ مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی حمیت و غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جب تک اُن کے دَم مین دَم ہے وہ اسے اپنی آنکھون کے سامنے بند ہوتا ہوا دیکھین۔ مگر واقفکار جانتے ہین کہ آخر دس بارہ سال مین اودھ پنچ مین سوائے خسارے کے کوئی نفع کی مد نہ تھی۔ منشی صاحب موصوف نے ایک خط منشی بالمکند گپتا مرحوم کو لکھا تھا جو "زمانہ" مین شائع ہوا تھا۔ اِس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ لکھتے ہین۔

"مکرمی۔ تسلیم۔

خط پہونچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھون سے اِس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اُٹھانے والا نہین۔ وو ایک سطرون کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہون نہ مُنہ سے بول سکتا ہون۔ کچھ نوکر ہمت کرکے نکال دیتے ہین۔ دس سال سے فالج مین گرفتار لبِ گور ہون۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہین تو کیا انتظام ہوسکے۔ اخبار صرف اِس لئے نکالتا ہون کہ جیتے جی مر نہین سکتا۔ ورنہ اس عارضے کے ہاتھون۔ ع

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخبارون مین نہین کہ اس کا ذکر ہو۔ ہان گذشتہ زمانہ مین کچھ تھا۔"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل اڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھون سے اُٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ضعیف جسم مین خون کے دس بیس قطرے ضرور باقی تھے مگر گرہ مین ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ باوضع اڈیٹر کی باوجود لب گور ہونے کے یہ تمنا ضرور رہتی کہ۔ ؎

گو ہاتھ مین جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار۔ یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس

جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور دو ایک پرانے دوستون کی محبت شریک حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا اڈیٹر نان شبینہ کا محتاج رہ کر دنیا سے سدھارتا۔

غرضکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کرکے اودھ پنچ نے دنیا کو خیرباد کہا اِس وقت اُردو زبان مین بہت سے قابل قدر اخبار موجود ہین مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصے تک یہ جگہ خالی رہیگی۔ مگر اُردو زبان کی تاریخ مین یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدردانون کے دلون سے آسانی سے فراموش نہین ہوسکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہون کے سامنے نہین۔ مگر اس کے تذکرے سے سخن سنجون کی محفل خالی نہین۔ ؎

پھر گئے آنکھون مین مشتاقِ گذشتہ نشہ مین
دورِ جامِ مے مین اکثر ذکر خیر جم ہوا

۲۴۱

منشی سید محمد سجاد حسین

(ماخوذ از "گلدستۂ پنچ" ۱۹۱۵ء)

ایک خوشحال و عالی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد منشی منصور علی صاحب عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر معمور تھے اور بعد پنشن کے ایک عرصے تک حیدر آباد میں سول جج رہے۔ آپ کے مامون نواب فدا حسین خان صاحب جو لکھنؤ کے ایک معزز وکیل تھے حیدر آباد میں بعہدۂ چیف جسٹس ممتاز تھے اور ریاست میں آپ کا بہت اچھا رسوخ تھا۔ منشی سجّاد حسین کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں زیر نگرانی نواب فدا حسین صاحب لکھنؤ میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنوں تک کیننگ کالج میں ایف اے۔ کی تعلیم بھی پائی لیکن طبیعت انگریزی سے اُچاٹ ہوگئی اور ایف، اے، کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ کالج چھوڑ کر تلاش معاش میں فیض آباد پہونچے اور وہان فوج میں اُردو پڑھانے پر منشی مقرر ہوئے لیکن طبیعت کو اِس شغل سے کیا مناسبت ہوسکتی تھی سال بھر کے اندر ہی اس کو خیر باد کہہ کر اودھ پنچ کے شایع کرنے کا ارادہ کیا۔ منشی محفوظ علی صاحب جو بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور جن کی عنایت اور توجہ سے ہم کو یہ حالات معلوم ہوئے ہیں اِس کام میں آپ کے شریک تھے اور

انھین کے مشورے و شرکت سے ۱۸۷۷ء مین اودھ پنچ کی بنا پڑی۔ منشی صاحب نے پنچ کے لئے پہلے ہی سال مین ایسے ایسے سحر البیان وجادو قلم نامہ نگار ڈھونڈھ نکالے کہ جو اردو علم ادب کے آسمان پر چاند و سورج ہو کر چمکے۔ ان مین سے پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد خان صاحب آزاد، سید اکبر حسین صاحب اکبر، منشی احمد علی صاحب شوق، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہین۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اول دو سال تک اپنے قلم جادو رقم سے اودھ پنچ کو سرفراز کرتے رہے لیکن بعد مین آپس مین کچھ الجھن پیدا ہو گئی اور وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ منشی صاحب علی گڑھ کی تحریک و سرسید کی پالیسی کے اوّل روز سے مخالف تھے۔ نظام معاشرت مین قدامت پرستی کے قائل اور مغربی تہذیب کے دشمن تھے۔ ۱۸۸۵ء مین نیشنل کانگرس مین شریک ہوئے اور مرتے دم تک اُس کے حامی رہے۔ ۱۹۰۱ء مین پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن چند ماہ بیمار رہ کر اچھے ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء مین فالج کا دوسرا دورہ ہوا کہ جس نے تندرستی ہمیشہ کے لئے تباہ کر دی۔ اُس وقت سے بولنے کی قوت قریب قریب بالکل جاتی رہی تھی۔ گو گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بات سمجھ مین نہین آتی تھی۔ مگر چل پھر سکتے تھے اور دماغ اپنا کام برابر کرتا تھا۔ متواتر علالت، ضعف و دیگر مکروہات زندگی کی وجہ سے آخری زمانہ نہایت مصیبت و پریشانی کا گذرا۔ بالآخر ۱۹۱۲ء مین اودھ پنچ بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد حالت روز بروز بُری ہوتی گئی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو اس دار المحن سے کوچ کیا۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

منشی محمد سجاد حسین صاحب اُردو اخبار نویسی مین طرز مذاق و ظرافت کے موجد، لکھنؤ کی

زبان کے ماہر اور اپنے رنگ کے اُستاد تھے۔ اودھ پنچ کے ذریعے سے جو خدمات اُردو لٹریچر کی آپ نے کین اور جو قابل قدر اضافہ اِس زبان مین آپ کی کوششون کی بدولت ہوا اِس قابل نہین کہ آسانی سے بھُلا دیا جائے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن شہرت مذہبی تعصب سے خواہ پولیٹکس ہو یا لٹریچر ہمیشہ صاف و پاک رکھا اور آزادی و ایمانداری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جو وضع اختیار کی اس کو مرتے دم تک نبھایا کسی حالت مین اصول سے مُنہ نہ موڑا۔ بلا کی شوخ طبیعت پائی تھی۔ بذلہ سنجی و ظرافت تو گویا مزاج کا خمیر تھی۔ نہایت پریشانی و تنگی کی حالت مین بھی حتی المقدور خندہ پیشانی رہتے اور مذاق سے باز نہ آتے تھے۔ منشی جوالا پرشاد برق مرحوم سے نہایت درجے کی خصوصیت تھی۔ آپ کے قدردانون مین پنڈت بشن نراین در۔ آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خان صاحب بہادر والی ریاست محمود آباد۔ اور بابو گنگا پرشاد ورما مرحوم کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہین

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

(ماخوذ از "گلدستہ پنچ" سنہ ۱۹۱۵ء)

مرزا محمد مرتضیٰ نام عاشق تخلص عرف مچھو بیگ پنچ کے نامہ نگاروں میں ستم ظریف کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ مرزا عطاء اللہ بیگ معروف بہ نواب حسین علیخان بہادر اٹک سے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ آپ کے نانا مرزا اسد علی بیگ پادشاہ اودھ کی فوج میں کمیدان تھے۔ مرزا صاحب بچپن سے بائیس سال کی عمر تک نانا کے ہمراہ رہے اور اس وقت تک بجز سپہ گری اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد بطور خود کافی علمی لیاقت پیدا کر کے مشغلۂ شعر و سخن کی جانب بھی توجہ شروع کی اور رفتہ رفتہ اس فن شریف میں بھی اس قدر قدرت بہم پہونچائی کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کا نام اردو زبان کے اساتذہ اور محققین کی فہرست میں داخل ہو گیا تھا۔ آپ مرزا نسیم کے شاگردوں میں تھے۔

دراز قامت فربہ اندام صحیح و شدید القویٰ جسم و قوت کے اعتبار سے (بقول حضرت حسرت موہانی) شاعروں میں ناسخ ثانی کے نام کے مستحق بنے۔ رنگ البتہ ناسخ کے خلاف گندمی کھلتا ہوا تھا۔ دوپلّی ٹوپی انگرکھا گھٹنا لکھنؤ کی معمولی وضع آپ کو بھی مرغوب تھی۔ لیکن آخر عمر میں کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ لطیف و ظریف خوش بیان

خوش گفتار اپنے چھوٹون سے بھی ظرافت کو دریغ نہ کرتے تھے۔ آپ کے ملنے والون مین پُرانی وضع کے لوگون مین اشرف علی صاحب اشرف مرحوم۔ منشی امیراللہ تسلیم وغیرہ اور نئی تہذیب کے لوگون مین منشی جوالا پرشاد برق۔ مسٹر حامد علی خان بیرسٹر اور منشی محمد سجاد حسین صاحب تھے صلح کل و مرنجان مرنج کی یہ کیفیت تھی کہ مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی لوگون کو آپ کے اصلی مذہب کی کیفیت نہ معلوم ہوئی کہ سُنّی تھے کہ شیعہ۔ آپ کے شاگردون مین منشی بالمکند گپتا مرحوم اڈیٹر اخبار "بھارت متر کلکتہ" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہین کہ جس سے آپ کی ہر دلعزیزی و بے تعصبی کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت حسرت موہانی کہ جن کے لطف و کرم سے یہ حالات زندگی مرزا صاحب کے ہم تک پہونچے ہین فرماتے ہین۔

"آپ کے نظم و نثر کے تمام کارنامے ہنگامہ ۵۷ء کے بعد کے ہین۔ مرزا نسیم مرحوم بھی اسی زمانے مین دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے ان کی صحبت اور شاگردی نے سمند ناز پر تازیانے کا کام کیا۔ اور آپ کے ادبی مذاق کی خوبیون نے روزافزون ترقی کے ساتھ پایان کار وہ مرتبہ حاصل کیا کہ آپ نثر نگاری مین یکتائے روزگار اور سخن سنجی مین اُستاد قرار پائے۔ لکھنؤ کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ مین اس کی ابتدا سے لیکر اپنی آخر عمر تک ۳۳ سال برابر "ستم ظریف" کے فرضی نام سے ایسے دلچسپ مضامین لکھتے رہے جن کا ادبی اور تنقیدی حیثیت سے بے مثل نظیر ہونا آج تک اہل قلم کے حلقے مین مسلم سمجھا جاتا ہے۔ تذکرہ شعرا کے مانند جب کبھی اُردو زبان کے نثر نگارون کے حالات بھی مرتب کئے جائین گے اُس وقت حضرت عاشق کا نام یقیناً طبقہ اول کے انشا پردازون کی فہرست مین ممتاز نظر آئے گا۔ لکھنؤ کی زبان اور محاورون کی جتنی تحقیق مرزائے مرحوم کو تھی اس کا

اندازہ اُن کی مشہور تالیف "بہار ہند" کے دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اِس لغت کی کافی قدر نہ کی ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اُردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا مولوی حکیم الدین وکیل اکولائے علم ادب کے متعلق آودھ پنج سے آپ کے بعض مضامین کو نقل کر کے "چشمۂ بصیرت" نام ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دیا تھا مگر اب وہ کمیاب ہے۔ گلزار نجات میلاد شریف نظم اور مثنوی نیرنگ خیال معروف کے علاوہ آپ کا ایک ضخیم دیوان مشتمل بہ جملہ اصناف سخن آپ کے خلف رشید مرزا محمد صدیق صاحب صادق کے پاس موجود ہے۔"

نواب سیّد محمد آزاد

ماخوذ از "گلدستۂ پنج" ۱۹۱۵ء

مشرقی بنگال کے ایک سربرآوردہ اور دولتمند خاندان سے ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوے اور اوائل عمر میں تعلیم بھی وہیں پائی۔ فارسی و اُردو کی تعلیم ایک نامی اُستاد یعنی آغا احمد علی[۵] اصفہانی مصنّف "مویدبرہان" کے زیرنگرانی پائی۔ آپ اُستاد کے نہایت رشید شاگردوں میں سے تھے۔ اُس زمانہ میں اوّل تو انگریزی تعلیم کا چرچہ ویسے ہی بہت کم تھا۔ پھر بنگالے کے مسلمانوں میں تو صرف شاذ و نادر اصحاب اِس طرف توجہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خط میں فرماتے ہیں۔

"انگریزی میں مجھے انٹرنس فیل ہونے کی عزّت بھی حاصل نہیں ہے۔ ہمارے وقت میں ہمارے شہر کے مسلمانوں کو انگریزی خوانی سے مطلق رغبت نہ تھی۔ میں نے تفنّناً چند روز انگریزی پڑھی تھی اور ۳ سال کالج بھی گیا تھا۔ اُس کے بعد پھر اپنے خسر معظّم نواب عبداللطیف صاحب بہادر مرحوم کی صحبت بابرکت میں کلکتہ میں رہ کر کتب بینی سے کسی قدر انگریزی حاصل کی اور پھر نوکری اختیار کرنے کے بعد بشرط ضرورت

---

[۵] غالب مرحوم نے برہان قاطع لغت کی رد میں ایک کتاب موسوم بہ قاطع برہان لکھی تھی۔ اس کے جواب میں آغا احمد علی صاحب نے "موید برہان" لکھی تھی جس کا جواب مرزا صاحب نے تیغ تیز سے دیا تھا اور پھر اس کا جواب بجواب آغا صاحب نے شمشیر تیزتر سے دیا تھا۔ اِس علمی معرکے کا پورا قصّہ مولانا حالی نے یادگار غالب میں بیان کیا ہے۔

اپنی انگریزی کی تکمیل کرتا رہا۔"

سرکار انگریزی کی ملازمت عہدہ سب رجسٹراری سے شروع کی لیکن رفتہ رفتہ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے کلکتہ کے پریسیڈنسی مجسٹریٹ اور آخر مین انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن ہوے۔ دو دفعہ بنگال کونسل کے ممبر منجانب گورنمنٹ نامزد ہوے۔ اور آئی، ایس، او، کا خطاب پایا ۱۲ ۱۹ء مین اپنے فرائض سرکاری سے سبکدوش ہو کر پنشن لی اور اب کلکتہ مین تشریف فرما ہین۔

اخبار بینی و مضامین نگاری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ سب سے پہلے فارسی اخبار دوربین مین کہ جو "مسلم لٹریری سوسائٹی" کا پرچہ تھا مضمون لکھنے شروع کئے۔ یہ نہایت نوشقی کا زمانہ تھا رفتہ رفتہ اُردو مین مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ سب سے پہلے اودھ اخبار مین لکھنا شروع کیا اور ۱۸۷۴ء سے یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔ اکثر مضامین آپ کے "اکمل اخبار دہلی" "آگرہ اخبار" سفیر لودھیانہ، اخبار الاخبار مین بھی نکلے مگر آپ کی شہرت بھی اودھ پنچ کی شہرت کے ساتھ ہی ہوئی خاص کر آپ کا نوابی دربار کہ جو ۱۸۸۳ء مین بطور ناول کے پنچ مین شایع ہوا تھا نہایت ہی مقبول ہوا۔ علاوہ برین آپکی ڈکشنری مہذب نامہ و پیام اور سوانح عمری مولانا آزاد ایسے مضامین تھے کہ جنھون نے کافی شہرت حاصل کی۔ اکثر مضامین آپکے ایک جگہ ترتیب دیکر ایک جلد مین کہ جس کا نام "خیالات آزاد" ہے شایع ہوے ہین جن کی قدر بڑے بڑے لوگون نے کی اور دور دور سے آپکے پاس مبارکباد کے خط آئے۔ انگریزی زبان مین بھی آپنے مضامین نگاری کی اچھی خاصی مشق حاصل کی اور بابو بھوچندر ڈے کی صحبت سے اس بارے مین بہت ہی نفع اُٹھایا۔ آپ اخبار رئیس و رعیت مین اکثر ایڈیٹوریل مضامین لکھا کرتے تھے کہ جو سرکار اور رعایا دونون کی نگاہ مین قابل قدر سمجھے گئے۔ غالباً پنچ کے نامہ نگارون مین یہ فخر صرف آپ ہی کو حاصل ہو کہ تادم آخر اپنے حق دوستی نبھایا اور برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔

منشی جوالا پرشاد برق

(ماخوذ از "گلدستۂ پنج" ۱۹۱۵ء)

منشی جوالا پرشاد صاحب برق ضلع سیتا پور قصبہ محمدی مین پیدا ہوے۔ ۱۲ راکتوبر ۱۸۶۳ء تاریخ ولادت ہے۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ محمدی مین گذرا۔ ۱۸۷۸ء مین ضلع کھیری سے انٹرنس کا امتحان درجۂ اوّل مین پاس کیا اور وظیفہ پایا۔ ۱۸۷۹ء سے کیننگ کالج مین تعلیم پاکر ۱۸۸۲ء مین بی، اے، کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۳ء مین وکالت کی ڈگری حاصل کی اور فدائے قوم منشی کالی پرشاد مرحوم کے دامن عاطفت کے سائے مین کچھ عرصے تک وکالت کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۸۵ء کے آخری حصّے مین وکالت کا سلسلہ ترک کر کے منصفی کا عہدہ قبول کرلیا اور اِس صیغے مین خاطر خواہ نام آوری اور ترقی حاصل کی۔ اکثر اڈیشنل سشن جج اور سشن جج کے عہدے پر بھی قائم مقامی کی حیثیت سے ممتاز رہے۔ اور ۱۹۰۹ء مین گورنمنٹ کی جانب سے گریوین کمیٹی کے ممبر بھی مقرر ہوے مگر جب ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ مین بعارضۂ طاعون انتقال کیا تو اس وقت ان کا مستقل عہدہ جج خفیفہ کا تھا۔ ان کے انتقال پر شمیر صاحب جوڈیشل کمشنر نے کرسی عدالت سے

فرمایا کہ قابلیت کے اعتبار سے اودھ کے سب ججون مین بابو جوالا پرشاد اپنا ثانی نہین رکھتے تھے۔

بابو جوالا پرشاد مرحوم خلقی طور سے نہایت ذہین اور طبّاع شخص تھے اور واقعی اسم بامسمّی برق تھے۔ اُردو زبان اور شاعری کا شوق زمانہ طالبعلمی سے تھا۔ پہلا اُردو کا مضمون تیرہ برس کے سن مین "کایستھ سماچار" مین لکھا تھا۔ مرحوم کے بھتیجے بابو کرشن کمار صاحب فرماتے تھے کہ جس زمانے مین فسانہ آزاد نکلتا تھا بابو جوالا پرشاد لکھنؤ کی زبان حاصل کرنے کی غرض سے اِس کا مطالعہ اِس طرح کرتے تھے جس طرح کوئی طالبعلم اسکول کالج کی کتاب پڑھتا ہے۔ لکھنؤ مین آکر منشی جوالا پرشاد سے منشی سجاد حسین پنڈت تربھون ناتھ ہجر منشی احمد علی شوق سے ملاقات ہوئی اور اودھ پنچ مین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ منشی صاحب موصوف ان معدودے چند لوگون مین تھے جنھون نے ابتدا سے اودھ پنچ کے پودھے کو سینچا۔ ان کی ذہانت اور طباعی ضرب المثل تھی اور زبان دانی اور شاعری کے اعتبار سے لکھنؤ کے سخن سنجون مین ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ علاوہ چھوٹی چھوٹی نظمون کے جو اودھ پنچ مین اکثر شایع ہوئین مثنوی بہار اور معشوقہ فرنگ جو کہ رومیو جولیٹ کا ترجمہ ہے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہین۔ مثنوی بہار کی دلچسپی اور اختصار کو دیکھ کر سرسید احمد خان مرحوم نے یہ فرمایا تھا کہ

"روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد"

یہ ایسی سند تھی جس پر ہر شخص کو ناز ہو سکتا تھا۔

بابو جوالا پرشاد نے بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناولون کا ترجمہ اِس صفائی سے اور ایسی سلیس عبارت مین کیا ہے کہ اکثر بنگالی حضرات کو یہ کہتے سنا کہ ترجمے مین اصل قصے کی تازگی

موجود ہے ۔ بنگالی دُلھن، پرتاب، مارآستین، روہنی ۔ اصل مین بنگالی زبان کے قصّے ہین ۔ جن کی تصویر اُردو زبان مین اُتاری گئی ۔ علاوہ ان ترجمون کے منشی صاحب مرحوم نے انگریزی زبان کے خداے سخن شیکسپیر کے نو یا دس ناٹکون کا ہوبہو لفظی ترجمہ نہایت سلیس نثر مین کیا ہے اور اگر زندگی وفا کرتی تو ان کا یہ ارادہ تھا کہ اسی عنوان سے شیکسپیر کے تمام ناٹکون کا ترجمہ کر ڈالتے مگر ۱۹۰۵ء مین اِس کام کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۱۱ء مین ان کی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا ۔

علاوہ منشی سجاد حسین اور منشی احمد علی شوق کے پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم، بابو جوالا پرشاد کے بڑے گہرے دوستون مین تھے ۔ اودھ پنچ مین دونون کے مضامین کا کثیر حصّہ اُس وقت کا لکھا ہوا ہے جب کہ قیصر گنج مین پنڈت تربھون ناتھ وکالت کرتے تھے اور بابو جوالا پرشاد منصف تھے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دونون رنگین مزاج دوستون کے لیے ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی ۔

بھارت درپن[۵]

(ماخوذ از "کشمیر درپن" مارچ سنہ ۱۹۰۶ء)

حضرت کیفی کے نام سے کشمیر درپن کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہین۔ حال مین آپنے ایک مسدس تحریر فرمایا ہے جس کا نام "بھارت درپن" رکھا ہے۔ اِس طولانی مسدس مین آپنے پیشتر ہندوستان کی قدیم عظمت وشوکت کی داستان بیان فرمائی ہے پھر موجودہ حالت کی ابتری کی طرف ناظرین کی توجہ دلائی ہے اور آخر مین وہ تدبیرین بتلائی ہین جن پر عمل کرنے سے اہل ہند اپنی بداعمالیون سے نجات پاکر پھر ترقی وتہذیب کی شاہراہ پر قدم رکھ سکتے ہین۔ چنانچہ مسدس کا ایک تمہیدی بند انھین مضامین کا اشارہ کرتا ہے۔

دکھاؤن گا پہلے بزرگون کی عظمت — وہ بھارت کا اوج آریون کی وہ شوکت
تمھاری دکھاؤن گا پستی کی حالت — بتاؤن گا پھر تم کو تدبیر وحکمت
کروگے عمل تم جو ذیہوش ہوگے
نہین تو فنا کے ہم آغوش ہوگے

جو لوگ تاریخ ماضیہ سے واقف ہین وہ جانتے ہین کہ جب تقریباً تمام عالم مین جہل کی

---

[۵] یعنی مسدس کیفی مصنفہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی مقیم جالندھر۔ مطبوعہ مفید عام پریس لاہور۔

تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس وقت وادی انڈس مین تہذیب و ترقی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جس کی شعاعین چین و عرب وغیرہ تک پہونچین۔ یہ وہ مبارک زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کی سرزمین سے علم و حکمت کے وہ سرچشمے جاری ہوے جن سے اب تک ہزارون پیاسے سیراب ہوتے چلے آتے ہین۔ اُسی زمانے مین سنسکرت کی تکمیل ہوئی جس کی نسبت انگریزی مورخون نے یہ لکھا ہے کہ یہ متبرک زبان یونانی زبان سے زیادہ "مکمل" لاطینی سے زیادہ وسیع، اور دونون سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اسی عہد مین وہ نیک نفس بزرگ پیدا ہوے جنھون نے مسائل حیات و ممات کی گتھیان سلجھانے کے لیے محض تحریر و تقریر تک اپنی تحقیقات محدود نہ رکھی بلکہ اپنا تمام وقت اسی علمی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور دُنیا کے مصنوعی اعزاز و وقار کو خیرباد کہہ کر اپنی زندگی فلسفہ و حکمت کے سانچے مین ڈھال دی۔ اِسی قابل فخر عہد مین ایسے ایسے منطقی ریاضی دان، شاعر اور علم ہیئت کے ماہر پیدا ہوے جن کی توصیف مین علماے یورپ تک تر زبان ہین۔ قصہ مختصر یہ وہ پاک اور متبرک زمانہ تھا جس پر اب تک ہم محبت و اعزاز کی نگاہون سے دیکھتے ہین اور جس کی یاد ہماری آنکھون مین اشک محبت بھر لاتی ہے کیفی صاحب نے تفصیل کے ساتھ انھین واقعات کا ذکر کیا ہے۔ چند بند تمثیلاً درج ذیل ہین۔

زمانے مین جب جہل چھایا تھا یکسر — تمدن تھا جب فہم عالم سے باہر
بنا تھا نہ جب غرب تہذیب کا گھر — اودیا کا تھا جب زمانے مین چکر

یہان علم کی گرم بازاریان تھین
پھلی پھولی تہذیب کی کیاریان تھین

زباں سنسکرت ایسی اعلیٰ نکالی زبانوں سے ہو جو جہان کے نرالی
اسی روکھ کی کل زبانیں ہیں ڈالی ہے لٹریچر اس کی بلیغ اور عالی

زبان اہل یونان و اٹلنیٹس کی
بتاتی ہے تاریخ بچہ ہے اس کی

وہ حکمت چکت جس سے مغرب ہے سارا نئے جس کے چیلے بنے ہیں نصارا
زمانے کا ہے ذہن جس نے سنوارا وہ اس اگن کی جوت کا ہے شرارا

ہے کیلاس پر جس کا بلجا و مسکن
ہمالہ کے غاروں میں ہے جس کا مخزن

اُپنشد کا انمول ہے وہ خزانا زمانے نے اب جس کی قیمت کو جانا
انھیں مانتے ہیں حکیم اور دانا فدا اُن پہ ہے آج سارا زمانا

نہیں یاد کیا فلسفہ وہ کپل کا
ہے دم بند جس سے سپنسر کا مل کا

یہ تدلیل کی راہ کس نے نکالی یہ منطق کی بنیاد ہے کس نے ڈالی
یہ انسان کی عقل کس نے اُجالی ہوئی کس سے حکمت جلا پانے والی

ریاضی کے یہ علم یہ ہندسے کے
زمانے نے ہیں ہند ہی سے تو سیکھے

دمِ جنگ تھی تیغ کی وہ روانی جگر جس سے شیروں کے تھے پانی پانی

وہ برقِ فنا تھی سپے زندگانی ۔۔۔ امان جس سے دشوار تھی بچ کے پانی

شجاعت کا جوہر جو پہچانتے تھے

وہ لوہا اسی تیغ کا مانتے تھے

قدیم ہندوستان کے اعزاز کا افسانہ سنانے کے بعد کیفی صاحب نے اُن بدعنوانیوں کا پوست کندہ حال بیان کیا ہے جو موجودہ ہندوؤن کے لئے باعث ننگ ہین۔ مثلاً برہمنون کی خودپسندی اور لاعلمی پرستشگاہون کی قابل افسوس حالت، عورتون کی کم وقعتی، ضعیف الاعتقادی، نئی روشنی سے نفرت، بیواؤن کی دردناک کیفیت وغیرہ پر نہایت آزادی کے ساتھ اظہار نفرین کیا ہے۔ اور مصنوعی مذہب کا پردہ فاش کرنے مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا ہے اور واقعی کیفی صاحب کا یہ کہنا بہت بجا ہے کہ۔ ؎

کسی نے بھی دیکھی ہے ایسی تباہی ۔۔۔ تنزل سا ہے یہ تنزل الٰہی

نہ یون کوئی صابر لٹا کر ہو شاہی ۔۔۔ نہ ایسی کسی کی بھی ہو روسیاہی

نہین گنگا جمنا کا بہتا یہ سوتا

ہمالہ ہے بھارت کی بپتا پہ روتا

چڑھی وہ تنزل کی سر کو خماری ۔۔۔ اُلٹ ہی گئی بزم کی بزم ساری

عوض قہقہون کے ہوا آہ و زاری ۔۔۔ نہ ساقی ہے باقی نہ سنگت ہماری

جو ہے کوئی باقی تو شمع سحر ہے

کہ جو بزم کی یاد مین چشم تر ہے

کبھی یون نہ اُجڑا تھا مسکن کسی کا   نہ یون جل گیا ہوگا خرمن کسی کا
زمانہ نہ ایسا تھا دشمن کسی کا   لٹا یون خزان سے نہ گلشن کسی کا

رہی ایک بلبل بھی جس مین نہ باقی
بتھا جو اِس اُجڑے چمن کی سُناتی

مگر اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر کیفی صاحب آئندہ ترقی کے متعلق مایوس نہیں ہین اکثر حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ پستی کی حالت سے اُبھرنا ہندوستان کے لئے ایک امر محال ہے اور تمام ترقی و اصلاح کی کوششین فضول اور بیکار ہین۔ کیفی صاحب اس کے برعکس اُمید ترقی دلا کر آئندہ بہبودی کی بشارت سُناتے ہین۔ آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم نسوان، تجارت و حرفت اور باہمی اتفاق کو ترقی ہو تو قوم کا ادبار دور ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہین۔

نہین گرچہ اب وہ حرارت دلون مین   مگر خون تو ہے وہ ہی اپنی رگون مین
نہین جوش وہ گرچہ اپنے سرون مین   مگر آب و گل ہے وہی ہڈیون مین

لٹے بھی تو ہاتھی لٹے گا کہان تک
سمندر گھٹے تو گھٹے گا کہان تک

جو دل جام غیرت سے سرشار ہوگا   تو یہ بخت خفتہ بھی بیدار ہوگا
خزان کا جُدا گل سے ہر خار ہوگا   ترقی کا پھر گرم بازار ہوگا

اگر مانتے ہو تم آوا گون کو
تو نکلے گی کیسے خزان اس چمن کو

بنو سلطنت کی تم اعلےٰ رعایا　　تجارت مین صنعت مین اونچا ہو پایا
ہو اقبال و دولت کا بھارت پہ سایا　　ثنا خوان تمھارا ہوا پنا پرایا

یہی سنگرام اب ہے اور یہ ہو ساکھا
یہی جوہر اب تم کو ہے کر دکھانا

جب اس طرح کی قوم تم بن چکوگے　　مسلح ان آلات سے جبکہ ہوگے
تو اغیار کے دل مین بھی گھر کروگے　　شہنشاہ کے لاڈلے تم بنوگے

نہ بھولو اسے قول یہ مستند ہے
خدا اہل ہمّت کی کرتا مدد ہے

مسدس کے آخر مین چند مختصر نوٹ درج ہین جن مین مستند مصنفین کی سندین ان بیانات کی تائید مین پیش کی گئی ہین جو کہ جا بجا نظم کئے گئے ہین۔ ان سندون اور شہادتون کے دیکھنے سے حضرت کیفی کی تاریخی تحقیقات کا پتہ چلتا ہے اور نیز یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس مسدس کی تصنیف مین آپ نے کس قدر جانفشانی سے کام لیا ہے یعنی بجاے شاعرانہ مبالغے کے تقریبًا تمام نظم شدہ واقعات تاریخ پر مبنی ہین۔ حضرت کیفی نے اس پند و نصائح کے منظوم اور عبرت خیز دفتر مین جو تنزل کے اسباب بتلائے ہین اور اُن کی اصلاح کی جو تدبیرین پیش کی ہین ان سے بحیثیت مجموعی کسی بہی خواہ قوم کو اختلاف نہین ہو سکتا۔ ورنہ یون تو ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است۔

ہمدردانِ قوم اِس مسدس کو ملاحظہ فرمائین اور مصنف کی قومی ہمدردی اور تاریخی تحقیقات کی داد دین۔

اُردو شاعری

(مذاقِ سخن کی اصلاح)

(ماخوذ از "صبحِ اُمید" نومبر ۱۹۱۸ء)

کسی اُستاد کا شعر ہے۔ ؎

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونون ہین
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی کا

ہمارے عزیزان وطن نے جب غیر قوم کی اطاعت قبول کی تو اُنھین بھی دو قسم کی زنجیرین پہننا پڑین۔ فرمانروا قوم کے قانون کے پردے مین جو پابندیان اُنھین برداشت کرنا پڑین اُنھین لوہے کی زنجیر سمجھنا چاہیے۔ زبان و قلم کی کامل آزادی سے محروم رہنا انتظام حکومت مین شریک نہ ہونا قومی آرام و آسایش کے کافی ذریعون کی فکر مین گرفتار رہنا ان قانونی پابندیون کا نتیجہ تھا یہ ایسی گرفتاری تھی جو ہمارے اہل وطن ہمیشہ کم و بیش محسوس کرتے رہے اور اپنی قومی آزادی کے لئے دعا و فریاد کے نعرے بلند کیا کئے۔ پولٹیکل بحث و تحریک کے کارنامے ان لوہے کی زنجیرون سے آزاد ہونے کی کوشش کے افسانے ہین۔ مگر ان ظاہری پابندیون سے بہت زیادہ قابل عبرت خیالات کی غلامی تھی جس نے غیر قوم کی حکومت کا سکّہ ہمارے دل و دماغ پر جاری کر دیا۔ ہمارے

جذبات و خیالات مغربی تہذیب کے مصنوعی اور نمایشی رنگ مین گرفتار ہوگئے اور ہم اپنے قومی حفظ مراتب سے بیخبر ہوگئے۔ مین اس خیالات کی غلامی کے سلسلے کو سونے کی زنجیر کہونگا جسے ہم نے خوشی سے پہن لیا اور اپنی گرفتاری پر ناز کرنے لگے۔

اِس دماغی اور روحانی غلامی نے طبیعتون کا رنگ کچھ ایسا پلٹ دیا کہ ہم حکمران قوم کے انداز معاشرت کی تقلید کو تہذیب و تربیت کا جوہر سمجھنے لگے۔ قومی وقار کا سَودا ہمارے سَر سے رخصت ہوگیا۔ اکثر صورتون مین ہمین اپنے اخلاق و مذہب سے بھی شرم آنے لگی۔ اس قومی بیخبری کے عالم مین ہمین اپنے قدیم اَدَب یا لٹریچر سے بھی حجاب آنے لگا۔ انگریزی زبان مین کمال پیدا کرنا تعلیم و تربیت کا معیار ہوگیا۔ اُردو یا ہندی کی زباندانی کی یاد تک دل سے فراموش ہونے لگی۔ ایسے اہل قلم و اہل زبان پیدا ہوگئے جو انگریزی مین فصاحت کے دریا بہا سکتے تھے مگر اپنی مادری زبان کو جنت نصیب بزرگون کی ناواقفیت و کم نصیبی کا ورثہ سمجھتے تھے جیسا کہ لازمی تھا۔ اُردو زبان اور اُردو شاعری کا سفینہ بھی ڈگمگانے لگا۔ یہ صدائین عام ہوگئین کہ قدیم رنگ کی اُردو شاعری مین سوائے گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کے کیا رکھا ہے۔ اکثر انگریز مصنفین نے اُردو زبان یا شاعری کے بارے مین جو خامہ فرسائی کی ہے اس کا لفظ لفظ ہمارے ناواقف نوجوانون کے لئے قرآن و حدیث ہوگیا اور اُنھون نے اپنے مغربی اُستادون کے خیالات کی غلامی بلا تکلف قبول کر لی۔ جس طرح زندگی کے اکثر صیغون مین مغربی تہذیب کا نمایشی پہلو ہماری نظرون مین سما گیا تھا اور اصلی جوہرون سے نگاہین آشنا نہ تھین۔ اسی طرح انگریزی نظم کے ظاہری رنگ و روپ کو ہم حسن سخن کا معیار سمجھنے لگے اور چونکہ اُردو شاعری

اِس معیار کے کانٹے میں تُل نہ سکی لہذا وہ قابل نفرین قرار دی گئی۔

اُردو شاعری کے فروغ کا آغاز اسلامی تہذیب کے آخری دَور میں ہوا جب کہ عیش پرستی وکاہلی نے ہمارے ہموطنوں کے خیالات وجذبات کی روحانی آگ کو قریب قریب ٹھنڈا کردیا قومی زندگی کی نبض سست ہوچکی تھی۔ جو کچھ بلند خیالی وضعداری اور عالی حوصلگی کے جوہر باقی رہ گئے تھے اُن کی ہستی بجھتے ہوئے چراغوں کی روشنی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس بدنصیبی کے دَور میں اُردو زبان کی خوش قسمتی سے چند ایسے باکمال پیدا ہو گئے جو شاعری اور زباندانی کے جوہر اپنے ساتھ لائے تھے اور جن کے دلوں میں اس قومی زوال کے زمانے میں بھی اپنے بزرگوں کی قدیم حمیت وتہذیب کا اثر باقی تھا۔ میر و سودا، آتش و غالب و انیس نے اپنی شاعری سے جو چراغ روشن کئے اُنھیں زمانے کی ہوا ابھی پورے طور سے گل نہیں کر سکی ہے۔ مگر باوجود ان قدرتی جوہروں کے زمانے کا رنگ ان کے کمال کا دشمن تھا۔ جس دُنیا میں وہ رہتے تھے اس کے عام پسند خیالات وجذبات کے حلقوں میں اُن کے دل و دماغ جکڑے ہوئے تھے۔ اکثر وہ ان پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر اپنی قومی تہذیب و تربیت کے محدود دائرے سے مجبور ہو جاتے تھے۔ شاید یہی خیال غالب کے دل کو ستا رہا تھا جب اُس نے یہ شعر کہا۔ ؎

بقدر شوق نہیں اپنے تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیان کے لئے

یا! میر انیس نے انھیں پابندیوں سے عاجز آکر مرثیے کا وسیع میدان تلاش کیا لیکن باوجود اُن امنگوں کے ہمارے قدیم شاعروں کے مذاق سخن کے آئینے پر بہت کچھ مصنوعی شاعری کا گرد و غبار جم گیا اور

اُن کا دامن اکثر غیر پاکیزہ خیالات وجذبات کے کانٹون سے اُلجھ کر رہ گیا اگر زمانہ کروٹ لیتا اور قومی زندگی مین شاعرانہ مذاق کی ترقی کا پہلو قائم رہتا تو بعد کی نسل قدیم شعرا کے جوہرون کو اپنی نگاہون کے سامنے رکھتی اور جو عیب اُن کے کلام مین موجود تھے اُن سے زبان و شاعری کو پاک کر دیتی۔ مگر دُنیا دوسرے رنگ پر جا رہی تھی۔ نئی تہذیب کی اشاعت نے طبیعتون کا رنگ کچھ اس طرح بدل دیا تھا کہ صحیح مذاق سخن کا قائم ہونا دشوار تھا۔

انگریزی تعلیم نے ملک مین رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی ہے اُسے بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے۔ مگر اس تعلیم کا ایک صریحی اثر ہمارے قومی اخلاق پر بہت خراب پڑا۔ وہ یہ تھا کہ تعلیم محض ذریعہ معاش ہو گئی۔ علم و ادب کی تحصیل سے جو روحانی سرور کا سرمایہ دلون کو حاصل ہوتا ہے وہ بالکل نظر انداز ہو گیا۔ اس زمانے مین کثرت سے ایسے تعلیم یافتہ بزرگ ملین گے جنھین اُردو فارسی ہندی یا انگریزی کے مذاق سخن سے ذرا بھی حس نہین ہے۔ اُن کی زندگی شاعرانہ لطافت کے اثر سے بالکل خالی ہے تعلیم نے اُن کی آنکھین صرف اِس قدر روشن کر دی ہین کہ وہ کھوٹے کھرے روپیہ کو پرکھ سکین۔ قومی مفلسی نے تعلیم کے اِس تجارتی شوق پر اور تازیانے کا کام کیا ہے۔ وہ لطیف جذبات و خیالات جن کا تازہ کرنا تعلیم کا اصل منشا ہے اور جن کی نشو و نما سے انسان دنیا کے گرد و غبار سے ہٹ کر روحانی لطافتون کا حظ اُٹھا سکتا ہے روز بروز سرد ہو جاتے ہین۔ اِس تجارتی تعلیم کے طوفان مین جب کہ شاعرانہ جذبات کی ترتیب کی اصلاح کا راستہ ہی بند ہو رہا ہے مذاق سخن کی صحت کی اُمید رکھنا فضول ہے۔

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مذاق سخن صحیح و درست نہین ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ

حضرات عموماً اُردو فارسی ہندی یا سنسکرت کی شاعری سے ناآشنا ہین۔ انھون نے اپنا مذاق سخن انگریزی نظم کے مطالعے سے قائم کیا ہے لیکن اُن کے معیار سخن کا دارومدار بہت کچھ انگریزی شاعری کی غلط تعبیر پر ہے۔ انگریزی نظم کے جس پہلو کا اثر اُن کے دماغ پر ہوتا ہے اس کا تعلق محض خیالات سے ہے اُن کے دل انگریزی نظم کے اِس لطیف پہلو سے پورے طور پر آشنا نہین ہین جس کی بنیاد جذبات کے لطافت و نزاکت پر ہے اور جو اصلی جزو شاعری ہے انگریزی نظم اُن کے دماغ کو ضرور روشن کر دیتی ہے مگر اُن کے دلون مین جذبات کی آگ نہین بھڑکاتی۔ چنانچہ نئی تعلیم کے معصوم بندے یہ خیال کرنے لگے ہین کہ شاعری کی وقعت کا دارومدار محض خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر ہے۔ انگریزی نظمون مین آزادی و حب الوطنی کے خیالات دیکھتے ہین اور خوش ہوتے ہین۔ اُردو شاعری مین انھین اِس قسم کے خیالات کا پتہ نہین ملتا لہذا اس کے مطالعے کا بار اُن کی نگاہین نہین اُٹھا سکتین۔

نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ویسا ہے کہ سُریلی آواز کے سُننے سے یا دریا کی لہرون پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے حقیقت یہ ہے کہ شاعری و زبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے۔ بقول شاعر ؎

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زبان دل کے لئے ہو نہ دل زبان کے لئے

مگر بادی النظر مین شاعری کے دو پہلو ہین۔ ایک کا تعلق خیالات سے ہے۔ دوسرے کا زبان سے

ہے۔ جس کو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر میں بھی لطافت کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شاعر کے خیالات دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلتے ہیں اور زبان میں خاص تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ خیالات کے پھولوں کی نشو و نما محض دماغ کی پھلواری تک محدود نہیں رہتی ہے۔ شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت اِن پھولوں کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اسی کا نام شاعرانہ تاثیر و لطافت ہے۔ اس شاعرانہ لطافت و تاثیر کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اُس کے ہموطنوں کی زبان پر ہوتے ہیں مگر انھیں الفاظ کی اُلٹ پھیر سے وہ اپنے بیان میں عالم تصویر پیدا کر دیتا ہے اور محض عالم تصویر ہی نہیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے الفاظ میں ایک راگ کی تاثیر نمایاں ہو جاتی ہے جو فن موسیقی کی راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت اُن کے دلوں میں برقی حرارت پیدا کرتی ہے نہ زبان کی مصوری کا انھیں حس ہوتا ہے نہ الفاظ کا راگ اُن کے کانوں کی فضا میں سماتا ہے۔ اُن کا دماغ یہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کس قسم کے خیالات نظم کئے گئے ہیں مگر ان کا دل جسے جذبات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہیے یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان خیالات کے ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے۔ ان کے یہ کان یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر نے معمولی الفاظ میں کیا جادو بھر دیا ہے۔

ایسا ہونا ایک حد تک لازمی ہے جس زبان میں انگریزی شاعری ہے اس زبان کے الفاظ سے ہمارے کان قدرتی طور سے غیر مانوس ہیں۔ ان کا قدرتی نغمہ ہمارے لئے خلق نہیں ہوا تھا جس

تہذیب کے عالم مین مغربی شاعرون کے رنج وراحت کے جذبات نے نشو ونما پائی۔ ہماری سوسائٹی کی دُنیا اُس سے دُور اور الگ ہے۔ مغربی دُنیا کے قدیم مذہبی اور قومی کارنامے جو وہان کے سورماؤن اور پیمبران دین کی ذات کے ساتھ وابستہ ہین اور جن کی بدولت وہان کے اکثر دریا یا پہاڑ یا اکثر قدرتی منظر قومی شاعری کے سرمایۂ ناز ہوگئے ہین۔ ہمارے دلون مین تاثیر کی گرمی نہین پیدا کر سکتے۔ ایسی حالت مین مغربی نظم کے اصلی شاعرانہ پہلو کا اندازہ کرنا جس کا تعلق خاص جذبات سے ہے اگر ناممکن نہین تو دشوار ضرور ہے۔

ممکن ہے چند ایسے ارباب وطن ہون جنھون نے انگلستان کی بود وباش کی وجہ سے اور قدرتی ذہانت کے صدقے مین مغربی سوسائٹی کے قومی و مذہبی خیالات وجذبات کا رنگ پورے طور سے پہچان لیا ہوا ور جنھون نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہو کہ انھین اس ساز کے تمام پردون سے واقفیت حاصل ہوگئی ہو ایسے حضرات انگریزی نظم کی شاعرانہ لطافت سے ضرور حظ اُٹھا سکتے ہین مگر عام طور سے شیکسپیر و ملٹن کی جو ثنا وصفت انگریزی دان نوجوانون کی زبان سے سُننے مین آتی ہے وہ بہت کچھ فرہنگون کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ میر تقی میر جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو یہان کے چند بزرگ اُن سے ملنے گئے اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے کہا کہ آپ حضرات میرا کلام سمجھ نہین سکتے۔ بیچارے اپنا طیش ضبط نہ کر سکے اور کہہ اُٹھے کہ جناب ہم فردوسی و نظامی کا کلام سمجھ سکتے ہین مگر آپ کا کلام ایسا ہے کہ اس کی قدردانی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ فردوسی و نظامی کے کلام کی فرہنگین چھپ گئی ہین مگر میرے کلام کی ابھی کوئی فرہنگ نہین چھپی ہے اِس لئے آپ اُس کی خوبی کا اندازہ نہین کر سکتے۔ عام طور سے

انگریزی نظم کے قدر دانوں کی حالت اِس سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ فرہنگ کے مطالعے سے شیکسپیر کے کلام پر وجد کرنا سیکھ لیں مگر وہ اُس قدر دانی کے جذبے کا اندازہ نہیں کر سکتے جس نے کارلائل کو یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ اگر اُس سے پوچھا جائے کہ اُسے ہندوستان کی سلطنت زیادہ عزیز ہے کہ شیکسپیر تو اُس کا جواب یہ ہوگا کہ چاہے ہندوستان کی سلطنت نکل جائے مگر انگریزی قوم شیکسپیر کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔

یہ خامی ہمارے لئے باعث شرم نہیں ہے۔ کوئی انگریز کتنا ہی ہندی زبان سے واقف کیوں نہ ہو مگر تلسی داس کی شاعری کا اثر و نغمہ اس کے دل میں وہ کیفیت نہیں پیدا کر سکتا جس کا لطف اَن پڑھ ہندو رامائن کے طفیل میں روزمرہ اُٹھاتے ہیں۔ غیر ملک کا باشندہ تلسی داس کے خیالات کی بلندی و پاکیزگی کی داد دے سکتا ہے مگر زبان و شاعری کے جوہروں کو نہیں پرکھ سکتا نہ ان جذبات کی تاثیر قبول کر سکتا ہے جو ہندوؤں کی قومی تہذیب کے ٹکسالی سکّے ہیں۔ اس قدر خامی کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس حالت میں ہم اپنی مادری زبان کی شاعری سے حظ نہیں اُٹھا سکتے ہمارے لئے کسی غیر زبان کے مذاق سخن کی قدر شناسی سخت دشوار ہے۔ شاعری سے حظ اُٹھانے کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو انسان کے دل میں قدرتی طور سے شاعرانہ مذاق کا جوہر موجود ہو یا اُس کے جذبات کی ترتیب و اصلاح سے اس کی طبیعت میں سخن فہمی کا سلیقہ پیدا ہو گیا ہو۔ شاعرانہ نزاکت و لطافت کا حظ حاصل کرنے کے لئے محض دماغی تربیت کافی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ انسان کا دماغ فلسفہ و منطق کے نور سے آئینہ ہو مگر شاعرانہ مذاق کے جوہر سے خالی ہو۔ خیالات و زبان کی شاعرانہ لطافت کا اثر قبول کرنے کے لئے انسان کی ہستی

کے اس جزو لطیف کے نشو و نما کی ضرورت ہے جس کا تعلق خدمات سے ہے جس طرح فلسفہ و ریاضی کی باریکیون کے سمجھنے کے لئے خاص قسم کی دماغی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح طبیعت مین شاعرانہ مذاق سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے فطرتی جذبات کی اصلاح و تربیت لازمی ہے۔ اپنی زبان کی شاعری کے مطالعہ سے اس قسم کی اصلاح و تربیت کا سرانجام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ مادری زبان کے الفاظ کا نغمہ کانون مین بلا تکلف گھر کر لیتا ہے اور قومی شاعرون کے کلام مین جو رنج و راحت کے جذبات کے نشتر موجود ہین وہ دل مین چبھ جاتے ہین اور دبی ہوئی اُمنگون کو بیدار کر دیتے ہین اسی کا شاعرانہ تربیت ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ بغیر اس تربیت کے محض غیر زبان کی فرہنگون مین نفس شاعری کے متعلق مضامین پڑھ کر صحیح مذاق سخن قائم کر لے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔

افسوس ہے تو اس قدر کہ یہ خوش قسمتی ہمارے حصے مین نہین آئی۔ ہمارے تعلیم یافتہ عزیزان وطن نے اپنی زبان و شاعری سے بیخبر رہ کر انگریزی شاعری کا جو غیر صحیح اندازہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا مذاق سخن بگڑ گیا۔ ہمین اپنی قدیم شاعری کے قابل قدر ذخیرے سے شرم آنے لگی اور نئی شاعری کے لقب سے جس طرز کلام کی بنیاد پڑی اُس کی وقعت نثر نظم نما سے زیادہ نہ تھی۔ یہ خیال عالمگیر ہو گیا کہ محض بلند و پاکیزہ خیالات کا برُے بھلے الفاظ مین نظم کر لینا معراج شاعری ہے جذبات کی لطافت کا خیال نظر انداز ہو گیا۔ زبان کے نغمے سے کان ناآشنا ہو گئے۔ محض ننگے بوچے خیالات کی تصویرین کاغذ کے صفحون پر نظر آنے لگین۔

اُردو زبان پر مولانا حالی کا جو احسان ہے اُس کی یاد دلون مین ہمیشہ تازہ رہیگی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص تھے جنھون نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اُردو شاعری کو بھی نیا

لباس بدلنا چاہیئے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔ مگر اپنے انگریزی دان احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے مین اُردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اِس عیب سے خالی نہ تھا جس کا ابھی ذکر ہوچکا ہے۔ اِس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام مین کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مولانا کی ایک رباعی اس وقت تمثیلاً یاد آگئی ہے۔

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی — کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی

دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ — دھبّا رہے کپڑے پہ، نہ کپڑا باقی

جو خیال ان دو شعرون مین نظم کیا گیا ہے وہ نہایت اعلیٰ درجے کا اصول اصلاح ظاہر کرتا ہے مگر اظہار خیال کا طریقہ شاعرانہ نہین ہے۔ اگر پاکیزہ و سلیس نثر مین یہ خیال ادا کیا جائے تو اس نظم سے زیادہ دلکش ثابت ہوگا۔ ہمین افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا حاؔلی نے اُردو شاعری کی اصلاح مین اپنے اصول اصلاح کو مدنظر نہین رکھا۔ اُردو شاعری کے دامن پر جو داغ اور دھبّے تھے اُنھین اس طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ نہ داغ دھبّے باقی رہے نہ دامن کا ایک تار باقی رہا۔

قدیم اُردو شعرا کے کلام مین بہتیرے ایسے خیالات ملین گے جنھین موجودہ زمانے کا مذاق قبول نہین کر سکتا یا جو موجودہ معیار کے مطابق پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ہین۔ مگر محض خیالات کی پستی سے تنگ آکر ہمین اُن کے شاعرانہ جوہر کو نہ بھول جانا چاہیے اور یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ محض پند و نصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے۔ قدیم اُردو شاعرون کے خیالات بلند نہ ہون مگر ان کا انداز سخن شاعرانہ ہے۔ اُن کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضامین وہ نظم کرتے ہین اُن مین اُن کے دلی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے یہی شاعری ہے۔

اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو اُن کی شاعری کا قصور نہ تھا۔ بلکہ اپنی قومی بیخبری کے عالم مین جہان ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات مین مغربی تہذیب کے اکثر اصولون کی غلط تعبیر کی وہان انگریزی شاعری کے غیر صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی اُلٹا سیدھا قائم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آئندہ اصلاح و ترقی کے لئے قدیم شعرا کے انداز سخن اور رنگ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ جس غیر صحیح مذاق سخن کی بنیاد پر ہم قدیم رنگ سخن کی قدر نہ کر سکے اُس کی مدد سے ہم زبان و شاعری مین نئے جوہر نہین پیدا کر سکتے۔

پنڈت پران ناتھ سرسوتی

(ماخوذ از "کشمیر درپن" اپریل سنہ ۱۹۰۳ء)

یہ حبیب قوم جس کا نام زیب عنوان ہے اُن چند بزرگان عالی صفات مین سے ہے۔ جنھون نے اپنے اعلیٰ دماغی قابلیت اور جوہر طبعی سے خطۂ کشمیر کا نام کل ملک مین روشن کیا۔ یون تو اس عالی خیال کے ناخن فکر نے بہت سے سوشل مذہبی اور پولیٹکل مسائل کی گتھیان سُلجھائین لیکن زیادہ تر علمی ترقی کا خیال دامنگیر رہا۔ یہ شخص انگریزی زبان کا اسکالر اور سنسکرت کا عالم تھا علاوہ برین فارسی، اُردو، بنگالی، گجراتی، تیلیگو وغیرہ پر بھی قدرت حاصل تھی۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس صاحب کمال کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ یہ آفتاب نصف النہار تک بھی پہونچنے نہ پایا تھا کہ غروب ہو گیا۔ لیکن جو کچھ اس چند روزہ زندگی مین کیا وہ اہل قوم اور اہل ملک کے لیئے باعث ناز ہے۔

پنڈت پران ناتھ سرسوتی پنڈت شمبھوناتھ جج ہائیکورٹ کلکتہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد زمانۂ شاہی مین دارالسلطنت دہلی مین عہدہاے جلیلہ پر ممتاز تھے۔ لیکن کچھ عرصہ

بعد گردش زمانہ صوبۂ بنگال کی طرف کھینچ لائی۔ ایک مُدت تک بزرگون کی قدیم جائے سکونت سے تعلق قائم رہا لیکن آخرکار کلکتہ کی خاک ایسی دامنگیر ہوئی کہ وہین ہمیشہ کے لئے قیام کیا۔ یہان پنڈت شمبھوناتھ نے اپنی جودت طبعی اور قوت بازو سے وکالت کے پیشے مین وہ نام پیدا کیا کہ ہائیکورٹ کی کرسی پر اجلاس کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ واقعہ کشمیری قوم کی تاریخ مین یادگار رہیگا کہ پنڈت شمبھوناتھ ہی پہلے ہندوستانی تھے جو کہ اس عہدۂ جلیلہ پر ممتاز کئے گئے۔

پنڈت شمبھوناتھ کا ستارہ عین عروج پر تھا کہ ۱۸۵۵ء مین پنڈت پران ناتھ ضلع بھوانی پور مین پیدا ہوے۔ زہے نصیب اُس باپ کے جس کے آغوش محبت مین ایسا لڑکا پرورش پائے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ پنڈت شمبھوناتھ نے ۱۸۶۷ء مین انتقال کیا اور یہ گوہر یکتا گرد یتیمی مین مبتلا ہوگیا۔ اس وقت پنڈت پران ناتھ کی عمر بارہ سال کی تھی۔ سر سے باپ کا سایہ اُٹھنے کا قلق ایسا ویسا نہ تھا۔ لیکن سلسلہ تعلیم برابر جاری رکھا۔ اُردو تو مادری زبان تھی۔ فارسی کی تکمیل گھر پر پڑھ کر کرلی۔ ایک بنگالی درسگاہ مین بنگالی زبان مین استعداد علمی حاصل کی۔ تیلگو اور گجراتی زبانین زیادہ عمر مین سیکھین۔

اسکول مین انگریزی اور سنسکرت کی ابتدائی تعلیم کو انجام دیکر پریسیڈینسی کالج کلکتہ سے ۱۸۷۳ء مین بی اے کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ کامیابی مین غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا لہٰذا پچاس روپیہ ماہواری کا وظیفہ بھی ملا از بسکہ سنسکرت کی تحصیل کا شوق نہایت ترقی پر تھا لہٰذا اس زبان متبرک مین ایم اے پاس کرنے کے لئے سنسکرت کالج مین نام لکھایا۔ قبل اس کے کہ سلسلہ تعلیم ختم ہو آپ کی نورانی طبع اپنے جوہر دکھانے لگی۔ اس طالبعلمی ہی کے زمانے مین کالیداس

کی مشہور کتاب "میگھدوت" کی تقریظ لکھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا ترجمہ بنگالی زبان مین نظم مین شایع کیا جس سے کہ مصنّف کی عالمانہ لیاقت کا اظہار ہوتا تھا۔ ان تصنیفات کے شایع ہونے پر پنڈت صاحب کی استعداد علمی کے جابجا چرچے ہونے لگے اور محققین بنگال آپ کو قدردانی کی آنکھون سے دیکھنے لگے۔ ۱۸۷۴ء مین ایم اے، کا امتحان پاس کیا اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس سال سرسوتی کا خطاب پایا اور قدردانان علم سے ناموری کا تمغہ لیا۔ اور اس فخر قوم کی اعلیٰ مثال اُن خیرہ سرون کے توہمات رد کرنے کے لئے کافی ہے۔ جو تعلیم کے معنی یہ سمجھتے ہین کہ انسان اسکول یا کالج کی درسیہ کتابون کو رٹتا رہے اور تحصیل علم کا مآل کار یہ سمجھے کہ امتحان پاس ہو جائے۔ برخلاف اس کے اصل منشا تعلیم کا یہ ہے کہ ذہن کو صفا اور آئینہ عقل کو جلا حاصل ہو۔ یہی اصول پنڈت پران ناتھ نے تحصیل علم مین پیش نظر رکھا۔ بعد سلسلہ تعلیم ختم ہونے کے تحصیل علم کا چرچا برابر قائم رکھا۔ کتب بینی کا شوق عشق کے درجے تک پہونچ گیا تھا۔ آپ کا کتب خانہ اُن نایاب اور قیمتی کتابون کا ذخیرہ تھا جو کہ نہایت جانفشانی اور محنت سے جمع کی گئی تھین۔ انگریزی مین شکسپیر، بائرن، مور اور شیلی کا کلام نہایت پسند تھا۔ اکثر تنہائی کے عالم مین ان شعرا کا دلاویز کلام پڑھا کرتے تھے۔ سنسکرت مین کالی داس کی شاعری سے خاص اُنس تھا۔ رگھوبنس کے ایک حصّے کا ترجمہ بنگالی زبان مین کیا جس کی فصاحت کا نور اہل بنگال کے دیدۂ و دل کی روشنی ہے کچھ عرصے بعد ایک مضمون انگریزی مین کالی داس کے "اخلاق" کے متعلق بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے مین لکھا جس کو سخن شناسون نے حسن تحریر کا اعلیٰ نمونہ مانا۔

لیکن صرف علمی اور اخلاقی مسائل پر مضامین لکھنے پر اکتفا نہ کیا۔ جولانی طبع کا دریا ہر طرف

لہریں مار رہا تھا۔ چنانچہ آبائی جوہر کی طرف توجہ ہوئی اور مطالعہ قانون کا شوق پیدا ہوا۔ سنہ ۱۸۷۶ء
میں قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا اور وکالت شروع کر دی۔ اُس زمانے میں مسائل ملکی پر بھی
توجہ مبذول کی چونکہ سائنس اور لٹریچر کے مختلف صیغوں سے وقفیت کلی حاصل کر لی تھی اور قلم
میں خداداد زور تھا لہذا مختلف پولیٹکل سوشل اور مذہبی مسائل پر جو کہ اُس وقت چھڑے ہوئے تھے
بہت سے رسالے اور مضامین لکھے اور جابجا لکچر دیے جن کی فہرست لکھنا طول عمل سے خالی نہیں
عنفوان شباب کا زمانہ تھا اور طبیعت اپنی خداداد اُمنگیں اور جوہر دکھا رہی تھی۔ اُسی زمانے میں
ایک کتاب "بھگوت گیتا اور انجیل" کے نام سے انگریزی میں لکھی جس کی تعریف بہت سے
اخباروں میں چھپی اور مصنف کی عالی خیالی اور عالمانہ لیاقت کی داد علماے بنگال نے دی۔

قانونی لیاقت بھی اعلیٰ درجے کی تھی اور جودت طبعی نے اس پر اور جلا کر دی تھی۔ ایک
شخص کا مقدمہ کوئی وکیل محض اِس خیال سے نہیں لیتا تھا کہ ایک نامی گرامی وکیل فریق ثانی
کی طرف تھا۔ پنڈت پران ناتھ کو وکالت شروع کیے ہوے ابھی زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا لیکن
چونکہ ذہانت طبع بجلی کا کام کر رہی تھی لہذا ہمت کر کے اِس مقدمہ کی پیروی کا ذمہ لے لیا اور
اس خوش اسلوبی سے دوران مقدمے میں کام کیا کہ فیصلہ اپنے موافق کرا لیا۔ بڑے بڑے
گرگ باران دیدہ جو اِس مقدمے کی پیروی سے کنارہ کشی کر گئے تھے دنگ ہو کر رہ گئے اور اِس
نوعمر وکیل کی طباعی پر آفرین کہی۔ مہاراجہ کشمیر اکثر معاملات میں آپ سے قانونی مشورہ لیتے تھے
اور مختلف ریاستوں کے آپ مشیر قانونی تھے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں ٹاگور لا لکچرر کے عہدے پر ممتاز ہوئے
یہ اعزاز اُسی شخص کو عطا ہوتا ہے جو کہ اعلیٰ درجے کی قانونی لیاقت رکھتا ہو۔ علاوہ بریں بہت

سی قانونی کتابین آپ سے یادگار ہین جوکہ اب تک قدر و منزلت کی نگاہون سے دیکھی جاتی ہین فن تقریر مین زیادہ دخل نہ تھا لیکن نثر انگریزی لکھنے مین خاص ملکہ حاصل تھا۔ بنگال کے مشہور نثار ڈاکٹر شمبھو چندر مکرجی کے اخبار "رئیس و رعیت" مین آپ برابر مضامین لکھا کرتے تھے بلکہ جب وہ اخبار جاری ہوا تو اُس کے پہلے نمبر کے مضامین آپ ہی کے زورِ قلم کا نمونہ تھے۔ کچھ عرصے تک خود بھی ایک اخبار کے اڈیٹر رہے جس کا نام "نیشنل پیپر" تھا۔ شہر مین کوئی ایسی علمی سوسائٹی یا جماعت نہ تھی جس کی آپ دامے درمے قدمے سخنے مدد نہ کرتے ہون۔ کچھ روز کے بعد بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل ہوا اور سوسائٹی مذکورہ کو آپ کے اعلیٰ درجے کی خدمات پر ہمیشہ ناز رہا۔ اسی زمانے مین تعلیم نسوان کے متعلق ایک زور شور کا مضمون لکھا جس کا منشا یہ تھا کہ عیسائیون کے ہاتھ مین ہندوستانی لڑکیون کی تعلیم رکھنا خلاف مصلحت ہے۔ اس مضمون کی سُرخی تھی "کیا ہم جاگ رہے ہین"۔ اس تنبیہ نے بہتون کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور جابجا اخبارون اور رسالون مین اس مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔

فن تاریخ مین خاص مداخلت حاصل تھی سنسکرت کے عالم ہونے کی وجہ سے بہت سے تاریخی عقدے جن کا کہ قدیم ہندوستان سے تعلق ہے آپ کے لئے آئینہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر شمبھو چندر مکرجی نے جو مضمون آپ کی وفات پر اپنے اخبار مین لکھا اِس مین صاف طور پر تحریر ہے کہ جہان تک ہندوستان قدیم کے مسائل تواریخی سے تعلق ہے پنڈت پران ناتھ سرسوتی کی رائے بہ نسبت ڈاکٹر جنارر لال متر اور دیگر یورپ کے علمائے سنسکرت کے زیادہ قابل وقعت خیال کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی کل تواریخی تحقیقات دوسرے پنڈتون اور شاستریون کے ترجمون پر مبنی کرتے ہین۔ برخلاف اِس کے

پنڈت پران ناتھ خود سنسکرت کے محقق تھے اور کل تاریخی مسائل کی چھان بین آپ کرتے تھے۔
ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک تانبے کا پتر دستیاب ہوا جس پر کچھ عبارت منقوش تھی اس عبارت کے معنی حل کرنے پر بنگال کی قدیم تاریخ کا پتا چلتا تھا۔ ڈاکٹر رجندر لال متر نے جو کہ اُس زمانے میں تاریخ قدیم کی گتھیاں سُلجھانے میں فرد سمجھے جاتے تھے اِس عبارت کا مطلب کسی خاص صورت پر حل کر دکھایا۔ جس مجلس علمی میں اِس عبارت کے معنی جیسا کہ ڈاکٹر راجندر لال نے حل کئے تھے پڑھے گئے اِس میں پنڈت پران ناتھ بھی موجود تھے آپ نے نہایت آزادانہ طور پر اُٹھ کر ڈاکٹر رجندر لال متر کے بتائے ہوے مطلب کی تردید کی اور اس عقدے کو دوسرے طور پر حل کیا اس نوعمر اسکالر کو بنگال کے زبردست عالم پر اعتراض کرتے ہوے دیکھ کر حاضرین جلسہ دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر رجندر لال متر نے اپنی غلطی تسلیم کی اور سر جھکا لیا۔ خدا کی قدرت دیکھو اس غزال کشمیر کے آگے بنگال کا شیر پست ہو گیا۔

چھوٹے ناگپور کی ریاست کی تواریخ بھی آپ کے قلم کی یادگار ہے۔ پنڈت پران ناتھ نے ایک سلسلۂ مضامین کی بنیا ڈالی تھی جس میں کہ ہر ایک گورنر جنرل کی دوران حکومت کے تذکرے شایع ہوا کرتے تھے۔ پہلا مضمون وارن ہسٹینگز کے زمانے پر ایک تواریخ سے اقتباس کر کے چھاپا بھی تھا لیکن قبل اِس کے کہ دوسرا مضمون شایع ہو موت نے قصہ کوتاہ کر دیا۔

اپنے لڑکے کی علالت طبع کی وجہ سے چنار جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہونچکر بخار آیا۔ یا یوں کہیے کہ موت بخار کا بھیس بدل کر آئی۔ کچھ روز علیل رہ کر ۳۸ برس کی عمر میں مطابق ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ع اس دار فانی سے رحلت کی۔

اس قلیل زمانے مین جو اعزاز پنڈت پران ناتھ کو حاصل ہوا اس پر ہر فرد بشر کو ناز ہو سکتا ہے۔ آپ کی وفات پر کل ملکی اخبارون مین حسرت آگین مضامین نکلے۔ الہ آباد مین مسٹر ڈبلو سی بانرجی نے بہ حیثیت صدر انجمن کانگرس آپ کی وفات پر افسوس ظاہر کیا اور آپ کی خدمات کا رقت آمیز الفاظ مین تذکرہ کیا۔

اہل بنگال اگر خدا کے بعد کسی کی عظمت کے قائل ہین تو اپنی عظمت کے لیکن پنڈت پران ناتھ کا لوہا سب مانتے تھے اور پھر ایسے وقت مین جب کہ ڈاکٹر شمبھو چندر مکرجی، ایشور چندر ودیا ساگر، اور ڈاکٹر رجندر لال متر ایسے صاحب کمال موجود تھے۔ علما اور شرفا کے جلسون مین ادب و محبت کی آنکھین اس زبردست عالم اور نکتہ سنج کے لئے فرش راہ ہوتی تھین۔ مگر باوجود اس عزت و وقار کے اس عالی ظرف کا دامن شہرت بد دماغی اور تمکنت کے داغ سے پاک تھا۔ اہل بنگال پنڈت پران ناتھ کی وسعت اخلاق، لطافت مزاج اور سلامتی طبع کی تعریف مین ہمیشہ تر زبان رہے۔

اس مین شک نہین کہ اعزاز پر اعزاز نصیب ہوا۔ قانونی لیاقت اور شان ریاست کے لحاظ سے آنریری مجسٹریٹی کا عہدہ سرکار سے ملا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اپنا فیلو مقرر کیا۔ بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ والی کشمیر جب کلکتہ تشریف لائے تو آپ کو شرف حضوری بخشا اور سات پارچہ کا خلعت عطا فرمایا۔ علاوہ برین ملک و قوم کی نگاہون مین جو آپ کا وقار تھا وہ محتاج بیان نہین۔ لیکن عجب حُسن اتفاق تھا کہ باوجود اس عزت و اعزاز کے انکسار و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا اور طبیعت مین سلامت روی کا جوہر قائم رہا واقعی یہی مقتضائے انسانیت بھی ہے۔

تہذیب کی آنکھون کا اُجالا وہ ہے   رتبے مین فروتنی کے بالا وہ ہے
انسان کے لئے ہے خاکساری جوہر   ادنیٰ سے ملے جھک کے جو اعلیٰ وہ ہے

پنڈت پران ناتھ کی زندگی پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو اگر واقعی پڑھنے کا شوق ہو تو وہ تھوڑے سے زمانے مین کیا کمال حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اصلی جوش ہونا شرط ہے۔ جو لوگ شکایت کرتے ہین کہ اب ہماری قوم مین ایسے صاحب کمال نہین پیدا ہوتے ان اس بات پر غور کرنا لازمی ہے کہ اب تحصیل علم کا شوق محض ترقی علمی کے لئے دلون سے دور ہوتا جاتا ہے۔ کتابون کے مطالعے سے یہ مراد نہین رہتی کہ ان کا مضمون جزو دماغ ہو جائے جو کہ تعلیم کا اصل منشا ہے۔ آج کل کتب بینی کا مشغلہ ورق گردانی سے زیادہ وقعت نہین رکھتا اور وہ بھی امتحان کی سند حاصل کرنے کے لیئے۔ یہ مانا کہ بڑی وجہ ایسے مشاغل سے نفرت پیدا ہونے کی یہ ہے کہ افلاس نے لوگون کے حواس پراگندہ کر رکھے ہین خدا کے بندے معاش کے بندے ہو گئے ہین لیکن فضل الٰہی سے ہماری قوم مین ایسے صاحب استطاعت کثرت سے پائے جائین گے جو کہ تحصیل علمی کا مذاق نہایت آسانی سے قائم رکھ سکتے ہین لیکن یہ لوگ دولت دنیا کے دام مین ایسے اسیر ہین کہ دولت علمی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہین۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر نخوت، خود پرستی اور ما و من کا زور ہے۔ ؎

چاہے شکست جہل تو تحصیل علم کر   وابستہ یہ طلسم ہے لوح کتاب کا

برخلاف اس کے پنڈت پران ناتھ کا علمی شوق اس درجے پر پہونچ گیا تھا کہ ان کے مرنے پر جو مضامین ان کے احباب نے لکھے ان مین قریب قریب سب مین اس امر کا تذکرہ ہے کہ اُنھون نے ایک معنی مین اپنے تئین آپ مارا۔ یعنی ایسی دماغی محنت کی جس کے وہ متحمل نہ ہو سکے۔

اس سلسلہ مین اس امر کا خیال بھی لازمی ہے کہ انسان کی زندگی تاثیر صحبت سے صحبت کچھ رنگ پکڑتی ہے۔ پنڈت پران ناتھ ایسی جگہ پیدا ہوے تھے جو کہ اس عہد نو مین کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مسکن ہے اور جس کو اب وہی رتبہ حاصل ہے جو کہ زمانہ گذشتہ مین دہلی اور لکھنؤ کو حاصل تھا۔ لہذا اس ذی فہم اور نکتہ سنج نے اُس شایستہ اور پاکیزہ سوسائٹی کا خوب فائدہ اُٹھایا جو کہ بنگال کو ملک کا دار العلم بنائے ہوے تھی۔ اِس مین شک نہین کہ ایسے لوگ جوہر خداداد اپنے ساتھ لاتے ہین لیکن نیک صحبت کا اثر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ خالی تحصیل علمی سے کچھ فائدہ نہین۔ علمی ترقی کا مآل کار یہ ہے کہ دوسرون کو فیض حاصل ہو۔ علم کی دولت اگر قارون کا خزانہ ہوئی تو کیا۔ دماغ وہ ہے جو کہ علم کا سرچشمہ ہو نہ کہ قبر۔ پنڈت پران ناتھ کا فیض اِس معنی مین ہمیشہ جاری رہا انھون نے اپنے جوہر علمی کے چراغ سے بہت سے چراغ روشن کئے۔ ان تمام اخلاقی، سوشل، پولیٹکل اور مذہبی مسائل پر جو کہ اِس وقت ان کے پیش نظر تھے اپنے غور و فکر کی روشنی ڈالی۔

مگر کیا افسوس کا مقام ہے کہ اِس عالی دماغ کو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کا پورا موقع نہ ملا۔ دل کی آرزو دل ہی مین رہی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کیسے کیسے کمالات مرنے والے کے ساتھ مٹی مین مل گئے۔ وہ نخل حیات جو کہ عین بہار پر تھا اگر اتنی جلدی قلم نہ ہو جاتا تو خدا جانے اس مین کیسی کیسی کونپلین پھوٹتین اور کیا کیا پھل پھول پیدا ہوتے مگر قدرت کے کارخانے مین کسی کو دخل نہین ہے

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

دادابھائی نوروجی

ماخوذ از "کشمیر درپن" جنوری ۱۹۰۶ء

یادگارِ زمانہ ہین یہ لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہین یہ لوگ

جب اُنیسوین صدی کے آغاز مین زمانے کے انقلاب مین ہندوستان کی قدیم سلطنت کے ساتھ قدیم تہذیب کا بھی ورق اُلٹا تو نئے دَور کے انداز معاشرت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے چند ایسے پاک طینت بزرگ پیدا ہوے جن کے دل محبّت سے پُر تھے اور جن کی آنکھین اس دوراندیشی کے نور سے روشن تھین۔ جن کی بدولت انسان پُرانی روش کے نقش قدم کو نقش عبرت سمجھکر آیندہ شاہراہ تلاش کرلیتا ہے۔ اس زمرے مین کچھ پاک روحین ایسی تھین جو مذہبی اور سوشل اصلاح کے عالم مین گرم سیر رہے۔ انھون نے قدیم تعصّبات وتوہمات کے بُت توڑے اور خودغرضی وجہل کے تنگ وتاریک معبد کو وسعت دے کر اپنے بلند نظری کے فیض سے نورانی بنا دیا۔ راجہ رام موہن رائے سوامی دیانند سرسوتی، مسٹر رنیڈے وغیرہ کا شمار ایسے ہادیان طریقت مین ہے۔ ان بزرگون کے علاوہ چند ایسے پیمبران اصلاح ظہور مین آئے جنھون نے پولیٹکل بیداری کا صور پھونکا اور اپنے مردہ دل ہموطنون کو پستی وگمنامی کے گورستان سے نجات دیکر قومی زندگی کی جنت کا راستہ دکھایا۔

اِس رنگ پر چلنے والون مین دادا بھائی نوروجی، سرندرناتھ بنرجی، سرسید احمد خان وغیرہ ہین - اس مین شک نہین کہ ان نیک نفس حضرات کی کوششون کا برقی اثر اکثر مذہبی اور سوشل اصلاح کے دائرے تک بھی پہونچا - لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے زندگی کے کارنامون کا اندازہ کیا جائے تو یہی ثابت ہوگا کہ ان کا سرمایۂ حیات زیادہ تر اپنے ہموطنون کے پولیٹیکل حقوق کی وسعت کے لیئے وقف رہا - ان گران قدر بزرگون مین ہمارے مضمون کا تعلق دادا بھائی نوروجی سے ہے اور ان دو چار صفحون مین عزیزان وطن کے سامنے اِس فدائے ملک کے پولیٹیکل عقائد کا خاکہ پیش کرنے کوشش کی جائے گی -

دادا بھائی نوروجی کے سوانحی حالات زیادہ تفصیل طلب نہین - کیونکہ ہر سال جو مضامین آپ کے متعلق شایع ہوتے رہتے ہین ان کی وجہ سے یہ حالات زبان زد عام ہوئے ہین - ہان غور کا مقام ہے تو یہ ہے کہ وہ بچہ جس کے سر سے چار برس کی عمر مین باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہو، جس نے شیر مادر کے ساتھ مفلسی کا مزہ چکھا ہو، سوائے غریب مان کے کوئی خبرگیران نہ ہو، ایسا قابل اور ہونہار نکلے کہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک ہر رنگ اور ہر عالم مین اپنے ہم جلیسون مین ممتاز رہے اور مُدّتُ العمر تک ملکی کشتی کا ناخدا سمجھا جائے - فیضان قدرت اسی کو کہتے ہین - اور انسانی زندگی کی عظمت اسی کا نام ہے - الفنسٹن کالج مین طالب علمی کے زمانے مین دادا بھائی کے معلمون کا یہ قول رہا کہ یہ لڑکا کروڑ مین ایک ہوگا - اسی کالج مین جو علمی انجمن قائم ہوئی اس کے روح روان یہی تھے - تعلیم نسوان کا پہلا مدرسہ بمبئی مین دادا بھائی نے قائم کیا - نیز علمی ترقی اور سوشل تربیت کے لئے جو انجمنین قائم ہوئی ہین اور جو زمانے کے ہاتھون سے اب تک محفوظ ہین

ان کے نشو و نما کا سہرا دادا بھائی کے سر ہے۔ بمبئی میں پہلی مرتبہ جو دیسی اخبار آزاد خیالی اور روشن دماغی کی امیدوں پر جاری کیا گیا اس کے اڈیٹر دادا بھائی ہی تھے۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ دادا بھائی الفنسٹن کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور اس مشہور کالج کے لئے آپ کی خدمات باعث ناز ہیں۔ بڑودہ کے دیوان کی حیثیت سے جو شان مدبری کے کرشمے دادا بھائی نے دکھائے اُن سے اس ریاست کی تاریخ کے صفحے روشن ہیں۔ دادا بھائی اس کارخانے کے سر برآوردہ شرکا میں تھے جس نے کہ پہلی مرتبہ انگلستان سے براہ راست تجارت شروع کی۔ بمبئی کی مجلس واضعان قانون کے نام آور ارکین میں دادا بھائی کا شمار رہا۔ انگلستان اور ہندوستان میں جو شاہی کمیشن مقرر ہوئے دادا بھائی کو ان کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل رہا یہی پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے پارلیمنٹ کے شاہی دربار میں کرسی پاکر اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ دادا بھائی پہلے حبیب وطن ہیں جن کے سر پر قوم نے تین مرتبہ کانگرس کی صدر نشینی کا تاج رکھا۔ ان تمام واقعات کا تفصیل وار لکھنا ایک طولانی سوانح عمری لکھنا ہے۔ ذیل کے مضمون میں محض اس پولیٹیکل مذہب کے چند حقیقی پہلوؤں پر تنقید کی نظر ڈالی جائیگی جس کے دادا بھائی پیرو ہیں۔

ہندوستان میں تقریباً ڈیڑھ سو برس سے سلطنت برطانیہ کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ یہ زمانہ تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ پہلے دور سے وہ سراسیمگی کا عالم مراد ہے جبکہ میدان جنگ میں انگریزی سنگینوں کے زور سے دولت برطانیہ کی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ دوسرے دور میں یہ بنیاد مستحکم ہوئی اور قضا و قدر کے محکمے سے یہ فرمان جاری ہوا کہ آخر کار نیکنامی یا بدنامی کی تدبیروں سے ہندوستان کا نگین تاج برطانیہ میں جڑ دیا گیا۔ تیسرا دور، وہ دور اندیشی اور زمانہ شناسی کا عہد تھا

جب کہ واقعات کی رفتار دیکھ کر یہ مسئلہ پیش آیا کہ نئی حکومت اور نئے انداز معاشرت کے مطابق ہندوستان کی رعایا کو اپنی زندگی کا کیا دستور العمل قرار دینا چاہیئے جس کام کے لئے پہلے دو دَور وقف رہے وہ کام اہل ہند کی مدد کا محتاج نہ تھا۔ مگر تیسرے دَور کے کارِ عظیم انجام دینے کے لئے بہت کچھ اہل ہند ذمہ دار تھے۔ اس کارِ عظیم کے معنی یہ تھے کہ ہندوستانی نظام معاشرت مین اور ملک کی انقلابی حالت مین تناسب کا رشتہ قائم کیا جائے تاکہ انسانی کشاکش حیات کے عالم مین ہندوستانیون کی ہستی قائم رہے۔ اس مسئلے کے حل کرنے کے لئے اس وقت کے عالی دماغ بزرگون نے یہ روش اختیار کی ایک جانب تو حکمران قوم اور دل شکستہ رعایا کے تعلقات مین رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور دوسرے جانب ہندوستان کے مختلف فرقون کی بکھری ہوئی کڑیون کو ایک سلسلے مین لاکر کل قوم کی شیرازہ بندی کی فکر کی جائے۔ ان بزرگون مین دادا بھائی کا نام سب سے زیادہ قابل امتیاز ہے۔ جن حضرات کی نظر سے دادا بھائی کی پولیٹکل تقریرین اور تحریرین گزری ہین وہ جانتے ہین کہ شروع سے اُن کا مسلک یہی رہا کہ ہندوستان کی بہبودی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل ہند سلطنت برطانیہ کی وفاداری سے مُنہ نہ موڑین اور باضابطہ بحث وتحریک کی مدد سے بلالحاظ ملت و مذہب یک دل اور یک زبان ہو کر اپنے پولیٹکل فرائض انجام دین اور اپنے پولیٹکل حقوق کی توسیع کی کوشش کرین۔ دادا بھائی کا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جو امن وامان کی نعمت ہندوستان کو دولت برطانیہ کے سائے مین حاصل ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا اہل ہند کا فرض ہے اور نیز جو برکتین اس مہذب حکومت کے ساتھ وابستہ ہین ان سے کوئی چشم پوشی نہین کر سکتا۔ مگر باوجود ان محاسن کے انگریزی حکومت کے دامن پر دو ایسے داغ

ہین جوکسی طرح مٹائے مٹ نہین سکتے۔ اولاً حاکم ومحکوم کے مالی تعلقات ایسے غیر منصفانہ ہین کہ ہندوستان کے تیرہ خاکدان مین روز بروز مفلسی کا اندھیرا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ثانیاً ہندوستان کے باشندون کے لئے اعلیٰ ذمہ داری اور اعزاز کے عہدون کا در بند ہوگیا۔ لہذا اُن کی دماغی اور اخلاقی ترقی کا معیار ادنیٰ ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ جن قابلیتون کو اظہار کا موقع نہین ملتا اُنکی نشو ونما ممکن نہین۔ ان عیوب کے فنا کرنے کے لئے دادا بھائی نے اپنی زندگی وقف کردی ہے اور ہمیشہ اُن کی تلقین یہی رہی ہے کہ جو متنفس ہندوستان کی خاک سے اُٹھا ہے اُس کا یہ فرض ہے کہ وہ باضابطہ بحث وتحریک کی مدد سے اپنے درددل کی داستان حکمران قوم کے کان تک پہونچاے۔ آج جب کہ ہندوستان مین پولیٹکل معرکہ آرائیون کا بازار گرم ہے۔ یہ تلقین روزمرّہ کی گفتگو مین شامل ہے۔ مگر جس وقت دادا بھائی نے باضابطہ بحث وتحریک وقومی اتحاد ویگانگت کا وعظ شروع کیا وہ زمانہ ہندوستان کے لئے عجب بیخبری کا زمانہ تھا۔ چارون طرف جہل وخود پرستی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۲۵ء مین مرہٹون کی قوت شکست کھا چکی تھی۔ مگر ان کے خون آشام تلوارین ابھی پوری طور سے میان مین نہین داخل ہوئین تھین۔ رسّی جل گئی تھی مگر بل قائم تھا دہلی کی گذشتہ عظمت کے مزار پر ایک دھیمی سی شمع ابھی تک جل رہی تھی۔ اودھ مین نوابی دور کا نشہ قائم تھا۔ سکھون اور مسلمانون کے درمیان مین نفاق کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انگریزی تہذیب وتربیت کے نشو ونما کا زمانہ دُور تھا۔ قومی اتحاد اور پولیٹکل نجات کے ولولے دلون نے محسوس ہی نہین کئے تھے۔ کانگرس کا خیال خواب مین بھی نہین پیدا ہوا تھا۔ ایسے عالم مین اہل ہند کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کا خیال پیدا ہونا اور پھر اس خیال کا کسی خاص فرقے یا قوم

تک محدود نہ رہنا ایک عجیب روحانی وقار اور بلند نظر کا کرشمہ تھا۔ میرے دوستو عظیم الشان پیشوایان قوم جس نگاہ سے زمانے کی رفتار دیکھتے ہین اس نگاہ سے معمولی نظر کا آدمی نہین دیکھ سکتا۔ جہل و تعصب کے پردے ان کی آنکھون سے اُٹھ جاتے ہین۔ کوتاہ اندیشی اور مذہبی تعصبی کی آہنی دیوارین ان کے سامنے شق ہو جاتی ہین۔ اور وہ عالم خیال مین اپنی روحانی پاکیزگی کی روشنی کی مدد سے آیندہ منزل مقصود کا جلوہ اپنی عقیدتمند آنکھون سے دیکھ لیتے ہین اور اسی طرف اپنے اُن دوستون کو چلنے کی تلقین کرتے ہین جن کی نظر اتنی بلند نہین ہے اور جن کے خیال کا دائرہ اتنا وسیع نہین ہے۔ دادا بھائی کی بلند نظری اور اخلاقی عظمت کا وقار ہمارے دل مین اور بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہین کہ اب بیسوین صدی کے آغاز مین جب کہ انگریزی تہذیب کا سکہ ہمارے دلون پر چل رہا ہے۔ جب کہ مغربی قومین اتحاد اور جمہوری اصولون کی ترقی کی بدولت روے زمین کا نقشہ بدلتی جاتی ہین ہماری مبارک سرزمین پر ایسی خدا کی مخلوق انسان کی شکل مین موجود ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندو مسلمانون کا پولیٹیکل اتحاد اک امر محال ہے۔ اور جس کے مذہب مین منصفی اور سب جحی کی چاردن کی چاندنی حاصل کرنے کے لیئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا ثواب مین داخل ہے۔ مگر دادا بھائی کی طینت مین اس کفر کو کبھی دخل نہ تھا۔ ان کی دور اندیش نگاہون کو پچاس برس قبل وہ راستہ نظر آگیا تھا جس پر اِس وقت ملک کے بہترین دماغ چلنے کی کوشش کر رہے ہین۔ سرندرناتھ بنرجی اسی بیشہ کے شیر ہین۔ بدرالدین طیب جی اسی مذہب کا کلمہ پڑھتے تھے۔ رومیش چندردت اسی شمع کے پروانے ہین۔ پروفیسر گوکھلے اسی چمن کے بلبل ہین۔ اور کالی چرن بنرجی اسی کلیسہ مین سجدہ کرتے ہین۔

مگر اٹھارہ یا اُنیس سال کا عرصہ ہوا کہ اس عام عقیدے کے خلاف ایک زبردست اور پُرشوکت آواز علی گڑھ سے بلند ہوئی اور یہ آواز اب تک مسلمانون کے ایک کثیر حصے مین گونج رہی ہے۔ یہ سرسید احمد خان (نور اللہ مرقدہٗ) کی آواز تھی۔ سرسید احمد مرحوم کے سر مین بھی دادا بھائی کی طرح جب قوم کا سَوْدا سمایا ہوا تھا اور اس فدائے قوم کی کوششون مین اسی سرگرمی اور مستقل مزاجی کا جلوہ نظر آتا ہے جو تمام عظیم الشان انسانون کا جوہر ہے۔ اور جو اصلاحین سرسید کی زبردست تدبیرون سے مسلمانون کے تعلیمی، سوشل اور مذہبی نظام مین ظہور مین آئین ان کے ذکر خیر سے آیندہ نسلون کی زبان ہمیشہ تر رہیگی۔ مگر سرسید کا پولیٹیکل مذہب دادا بھائی کے اصولون کے خلاف ہے۔ سرسید نے اہل اسلام کو یہ سبق دیا کہ اُن کو حکّام وقت کی شفقت اور انصاف پسندی پر بھروسا رکھنا چاہیے اور پولیٹیکل بحث و تحریک سے اپنا دامن آلودہ نہ کرنا چاہیے۔ سرسید کی صدق نیت مین شک کرنا کفر ہے۔ جو کچھ اس حبیب قوم نے کیا اپنے ہم مذہبون کی سچی بہبودی کے خیال سے۔ مگر بااین ہمہ ہماری ادب آموز نگاہین یکایک اس عظیم الشان بزرگ کی خیالی تصویر کی جانب اُٹھتی ہین اور ہماری زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلتا ہے کہ افسوس سرسید نے باوجوُد اعلیٰ درجے کی مُدبّری اور عالی خیالی کے اپنے زمانے کی پولیٹیکل تہذیب کی قوتون کا صحیح اندازہ نہ کیا۔ میرے دوستو سرسید کا پولیٹیکل عقیدہ دادا بھائی کے مذہب ہی کے خلاف نہین ہے بلکہ دُور اندیشی اور زمانہ شناسی کے خلاف بھی ہے۔ کون نہین جانتا کہ اس وقت ہندوستان کی تمدنی ترقی کی معرکہ آرائیون مین مغربی قومون سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور یہ مقابلہ کامیابی کے ساتھ اسی حالت مین ہو سکتا ہے جب کہ ہم اُن آلات حرب سے واقف ہون جو کہ مغربی قومون کے قوت بازو بنے ہوے ہین۔

یہ آلات حرب کیا ہین۔ اُن کی تہذیب معاشرت کے جمہوری اصول ہین۔ اگر اہل ہند کچھ روز دُنیا مین عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہین تو اُن کو اپنی ترقی کے راستے مین انھین اصولون کو سنگ نشان خیال کرنا چاہیئے۔ انھین اصولون کے مطابق ہم موجودہ تہذیب کا یہ رنگ دیکھتے ہین کہ نظام معاشرت کے ہر صیغے مین ہر ایک قسم کے اقتدار و قوت کا سرمایہ افراد واحد کے قبضے سے نکلکر عوام مین تقسیم ہوتا جاتا ہے۔ وہ مذہبی پیشوا جو پیشتر اپنے قلم کی ایک گردش سے تخت و تاج کا فیصلہ کر دیتے تھے اب اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ مقلدین کی رائے کے خلاف کوئی فتوے نہین جاری کر سکتے۔ بڑے بڑے مسائل مین بیٹا باپ کے خلاف اپنے عقیدے کا اظہار کر سکتا ہے اور اُس کا ایسا کرنا بے ادبی اور بد تہذیبی مین شامل نہین سمجھا جاتا۔ اِس جمہوری اصول کی نشو و نما زیادہ تر پولیٹیکل دُنیا مین ہوئی ہے۔ شاہ وقت یا وزیر اعظم کے احکامات محض عام رعایا کے مجموعی خیالات کا عکس ہوتے ہین۔ اور رعایا کو اختیار حاصل ہے کہ وہ حکام وقت کے خلاف اپنی نارضگی کا باضابطہ اظہار کرے۔ اسی اصول کا پرتو دادا بھائی کے پولیٹکل مذہب مین بھی نظر آتا ہے۔ وہ انگریزی حکومت کا استحکام ہندوستان کی بہبودی کے لئے نہایت ضروری خیال کرتے ہین اور ان کی سچی وفاداری سے پائنیر ایسے کافر کو بھی انکار نہین ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اہل ہند کو حکام وقت کے سامنے اپنے ضروریات کا اظہار باضابطہ بحث و تحریک کے پیرائے مین کرنا چاہیئے اور اپنے پولیٹکل حقوق کے تحفظ و توسیع کی کوشش مین سرگرم رہنا چاہیئے۔ برعکس اس کے سرسید مرحوم کا عمل شیخ سعدیؒ کے مقولہ پر تھا کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب ست این ۔۔۔ بباید گفت اینک ماہ و پروین

اور یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ یہ اصول موجودہ تہذیب و تربیت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم کو اس بات کی شکایت نہین کہ سر سیّد نے کانگرس کو اپنی شرکت سے کیون محروم رکھا۔ ممکن ہے کہ سر سید کو کانگرس کے اراکین کی نیک نیتی مین شک ہو یا اسی قسم کے اور خیالات کانگرس سے اختلاف کے حامی ہوے ہون۔ ہم کو افسوس ہے تو یہ کہ سر سید نے یہ تلقین کس اصول پر کی کہ مُسلمانون کو پولیٹکل بحث و تحریک سے قطعاً پرہیز کرنا چاہیئے۔ اور حکّام وقت کی محبّت و انصاف پسندی پر کافی اعتماد رکھنا چاہیے۔ اگر کانگرس ان کے امتحان مین پوری نہین اُتری تھی تو وہ مسلمانون کے لئے دوسری پولیٹکل انجمن قائم کر سکتے تھے۔ مگر نہین۔ اِس جلیب قوم کی تو مُسلسل کوشش یہی کہ مسلمان نوجوان پولیٹکل تعلیم کے سرچشمے سے اپنے ہونٹ نہ تر کرسکین۔ اس تلقین کا نیتجہ یہ ہے کہ مسلمانون مین باوجود اعلیٰ ذہانت کے ایسے بزرگ نظر نہین آتے جو پولیٹکل یا تمدّنی مسائل کے محقق سمجھے جائین۔ اُن مین دادابھائی کے ایسے پولیٹکل رشی، اور گوکھلے کے ایسے پولیٹکل سنیاسی معدوم ہین۔ ایسے بزرگون کا نہ پیدا ہونا کوئی معمولی بات نہین ہے۔ ایسے لوگ قوم کی جان ہوتے ہین اور انھین کی اخلاقی عظمت سے قوم کی عظمت کا اندازہ کیا جاتا ہے برعکس اس کے ہم دیکھتے ہین کہ نواب سلیم اللہ صاحب کے ایسے اکثر قوم فروش پیدا ہو گئے ہین جو پولیٹکل اور تمدنی تعلیم کے ابتدائی اصولون سے بے بہرہ ہین اور جو ذاتی فروغ حاصل کرنے کے لئے کل قوم کی طرف سے یہ صدا لگانے کے لیئے تیار ہین کہ "الٰہی آفتاب دولت درخشان باد۔ لارڈ منٹو سلامت" نواب صاحب موصوف نے مسلمانون کی ایک انجمن قائم کرنے کی فکر کی تھی جس کا دستور العمل یہ ہوتا کہ کانگرس کی ہر تجویز سے اختلاف کرے اور حکّام وقت کی تائید کرے

اگر یہ قوم فروشی نہین ہے تو کیا ہے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ نواب محسن الملک اور شرف الدین صاحب کے ایسے بزرگ نواب سلیم اللہ صاحب کے ایسے پولیٹکل پیشواؤن کے پیچھے قومی ترقی کی نماز پڑھنے مین تکلف نہین کرتے۔ ان باتون سے اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو وہ یہ سب ہے کہ مسلمانون کے دل مین پولیٹکل ترقی کے ابدی اصول ذہن نشین نہین ہوئے این۔ وہ پولیٹکل واقعات کے رفتار کا اندازہ کرتے ہوئے عارضی اور دائمی قوتون مین فرق نہین کرسکتے۔ میرے ہم وطنو! نواب سلیم اللہ صاحب کی پولیٹکل حکمت محض مسلمانون ہی کے لئے نہین بلکہ کل ہندوستان کے لئے باعث ننگ ہے۔ انگریزی حکام چاہے مصلحت کے خیال سے ایسے حضرات کی حرکات پر آفرین کہین مگر وہ دل مین خوش نہین ہوسکتے۔ وہ اس قوم کے رکن ہین جس نے اپنے خون سے پولیٹکل آزادی کے چمن کو سینچا ہے اور جس کا یہ اصول ہے کہ جو شخص اپنے حقوق کی حفاظت نہین کرسکتا۔ وہ اُن حقوق کے حاصل کرنے کا مستحق نہین ہے اگر ان کی نگاہون مین قدر ہوسکتی ہے تو دادا بھائی کے ایسے بزرگون کی جن کی رگون مین پولیٹکل ترقی کا جوش بجلی کی طرح سرایت کرگیا ہے۔

علاوہ ان اصولی کمزوریون کے سرسید مرحوم نے جو روشنی قائم کی ہے وہ اسی حالت مین عملی طور پر عارضی حیثیت سے مسلمانون کے لئے نفع رسان ثابت ہوسکتی ہے جب کہ ہندو ملکی حقوق کی توسیع و حفاظت کے لئے پولیٹکل معرکہ آرائیون مین مصروف ہین اور اپنے مسلمان ہموطنون کو اس بات کا موقع دین کہ وہ ان معرکہ آرائیون سے اختلاف ظاہر کرکے حکام کی نگاہون مین سُرخ روئی حاصل کرین۔ برعکس اس کے اگر ہندو بھی باضابطہ بحث و تحریک کے

دائرے سے نکل کر اور ملکی ترقی کی کوشش ترک کرکے مسلمانون کی تحریکون کی بیجا مخالفت شروع
کردین تو اُس وقت دونون مین کوئی فرق قائم نہین رہیگا اور حکام کو کوئی وجہ نہین رہیگی کہ وہ
مسلمانون کی مصنوعی دلجوئی کی فکر کرین - اوران کو اس چال سے پولٹیکل تحریکون مین شریک ہونے
سے باز رکھین - کیونکہ اس حالت مین ہندو مسلمانون کی حالت یکسان ہوگی - دونون کا صرف
مشغلہ یہ ہوگا کہ باہمی نفاق کی آگ مشتعل کرتے رہین اور پولٹیکل حقوق کی جانب رُخ نہ کرین -
اِس لحاظ سے بھی سرسید کی پولٹیکل تلقین پائدار اصولون پر مبنی نظر نہین آئی - ان سب باتون پر
غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کی پولٹیکل ترقی کے لئے دادا بھائی کے اصولون
کی پیروی لازمی ہے اور آثار زمانہ بتلارہے ہین کہ ہمارے مسلمان ہموطنون مین ایک فرقہ ایسا پیدا
ہوگیا ہے جو سرسید کی پولٹیکل نصیحتون کو فراموش کرتا جاتا ہے اور وہ زمانہ ضرور آنے والا ہے
جب کہ سلطنت برطانیہ کے سایہ عاطفت مین تمام ہندو مسلمان دادا بھائی کے پھریرے کے
نیچے اپنے پیر جماکر پولٹیکل ترقی کے منزل مین قدم رکھین گے - ہندؤن مین اکثر اس پر ور طبیعتین
مذہبی تعصب کے نشے مین دادا بھائی کے اصولون سے انحراف کرنے پر آمادہ ہین - ان عاقبت
اندیش حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہندؤن کو پولٹیکل اتحاد کی کوشش ترک کرکے مسلمانون کی
طرح محض اپنے ہم مذہبون کی ترقی کی کوشش کرنا چاہیے مگر ہمارے دستون کو مایوس ہونا چاہیے -
قومی اتحاد و قومی ترقی کی منزلین دشوار گزار ہین - بگڑی ہوئی قسمت ایک دن مین نہین بنتی ہے
مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرتے ہین تو اس کی وجہ یہ نہین ہے
کہ ان مین فطرتی طور سے ہندؤن کی مخالفت کا مادہ موجود ہے - اصل وجہ یہ ہے کہ ابھی مغربی اصول

پورے طور سے اُن کے ذہن نشین نہین ہوے ہین۔ ابھی زمانے کے معلّم نے انہین قومی یگانگت کا سبق نہین دیا ہے لیکن وہ زمانہ بہت قریب نہین ہے تو بہت دور بھی نہین ہے جب کہ یہ زمانہ سازی کا رنگ زمانہ شناسی سے بدل جائیگا۔ دادا بھائی کی کوششین کامل طور پر بار آور ہونگی اور ہندوستان کی تاریخ مین قومی یگانگت کا نیا دَور شروع ہوگا۔ ؎

لذّتِ سیرِ دگر چشمِ تمنا لے گی ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

مایوسی کا کوئی مقام نہین ہے۔ سچّائی اور نیک نیتی کی قوتون کو دُنیا مین ہمیشہ فتح ہوئی ہے۔ عارضی ناکامیان مردون کا دل نہین توڑ سکتین۔ دادا بھائی کی عمدہ مثال آنکھون کے سامنے ہے۔ مُدّت العمر کی معرکہ آرائیون مین کیسی کیسی ناکامیابیون سے انھین سامنا ہوتا رہا ہے اور زمانے کے ظالم ہاتھون سے کون کون صدمے انھین پہونچے ہین۔ مگر ان کی ہمت مین کمی نہین ہے اور اُن کی نورانی پیشانی پر افسردگی کی شکن کا نشان نہین نظر آتا۔ وہ اِس وقت زندگی کے سفر کی بیاسی منزلین طے کرنے کے بعد اپنے حج پیری کے نورانی عالم مین فرشتۂ اُمید کے ظہور کے منتظر ہین۔ اُن کو یقین ہے کہ زمانہ ضرور کروٹ لے گا اور ہندوستان کی تقدیر چمکے گی۔ وطن کی محبّت اُن کے لئے مذہبی عقیدے کے درجے تک پہونچ گئی ہے اور دلی جوش خون کے ساتھ رگون مین دوڑ گیا ہے۔ اِس خیال کی پختگی ان کی عظمت کا راز ہے۔ اکثر ایسے نیک نفس انسان ہین جن کے دل رنج و درد کے نظارے دیکھ کر پگھل جاتے ہین اور یہ اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ بیکس کی چارہ سازی کی جائے اور غریب کے زخم پر مرہم رکھا جائے۔ مگر جب دُنیا کے فانوس خیال مین اور اور دلکش تصویرین سامنے آجاتی ہین تو جو اُمنگین درد و غم کے مرقعے دیکھ کر پیدا ہوئی تھین وہ فنا ہو جاتی ہین

اور خود غرضی کے جذبات ذاتی عیش و آرام کے دام مین اسیر کر دیتے ہین یا اکثر عارضی ناکامیابی ہمّت توڑ دیتی ہے اور یا یوسی کی زنجیر پہنا کر گوشۂ عافیت مین بٹھا دیتی ہے۔ مگر دادا بھائی کا سودا وہ سودا نہ تھا جو کہ دُنیا کے آدم فریب عیش و آرام کی ہوا سے دُور ہو جائے یا جس پر یاس و بیم کے جذبات غالب آجائین۔ یہ وہ سُودا تھا جس کی بدولت اُنھون نے اپنی تمام زندگی ملکی خدمت کے لئے نذر کر دی۔ اپنی راحت کو ملک کی راحت پر قربان کر دیا۔ ملکی افلاس دور کرنے کی کوشش مین اپنی مفلسی کو مفلسی نہ سمجھا۔ اور جو پولیٹکل آرائی شباب مین شروع کی تھی اسے بڑھاپے تک اسی دم خم کے ساتھ قائم رکھا جن کے دلون مین محبت و ہمدردی کے سرچشمے خشک ہو گئے ہین۔ اور قومی حمیّت و غیرت کے شعلے بجھ کر رہ گئے ہین اور جو ذاتی عیش اور ذاتی نجات کو زندگی کا فرض اولی سمجھتے ہین۔ اُن کی نظرون مین دادا بھائی کی مردانہ اور مسلسل کوششین زیادہ وقعت نہین پیدا کر سکتین مگر جو قومی محبت کے بندے اور قومی خانقاہ کے در کے فقیر ہین اور جن کے دل سنگ و خشت کے نہین بنے ہوئے ہین وہ اس قومی محبت کے پتلے کی عظمت کا اندازہ کر سکتے ہین۔ ؎

حریفِ ناوکِ مژگانِ خونریزم نہ ای ناصح
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

پنڈت بشن نراین در

(ماخوذ از "ادیب" جنوری سنہ ۱۹۱۰ء)

باغ جہان مین کھلتے ہین گل کتنے جا بجا　　بو بھی نہین سنگھا تی ہے جن کی کبھی صبا
کتنے گہر ہین گردِ یتیمی مین مبتلا　　آئینے خاک مین ہین پڑے کتنے بے جلا

ہین بے نشان کتنے نگین ہائے نامدار
حیران جن کو دیکھ کے ہو عقل سادہ کار
(آبرؔ)

مین عزیزانِ وطن کی نگاہون کے سامنے ایسی زندگی کا مرقع پیش کر رہا ہون جس کی قدرتی آب و تاب پر مکروہات دنیوی کے گرد و غبار نے پردہ ڈال دیا ہے مگر جس کا حُسن ازلی عقیدت مند آنکھون سے پنہان نہین ہے جو بندگان خدا محض دولت دنیا اور شہرت و ناموری کو مآل کار ہستی سمجھتے ہین اُن کو اس زندگی کے افسانے مین ایک واقعہ بھی دلچسپ نظر نہ آئے گا لیکن جن علم دوست محبانِ وطن کا یہ خیال ہے کہ انسان کے دل و دماغ مین اکثر ایسے جوہر لطیف موجود ہین جن کا حُسن ذاتی مصنوعی شان و شوکت کی جلا کا محتاج نہین ہے وہ اس حیرت و عبرت کی داستان کو ضرور ادب کے کانون سے سُنینگے۔

پنڈت بشن نراین صاحب درؔ کی زندگی ایک ایسے مرد قانع کی زندگی ہے جس نے علم کو دولت اور ملک و قوم کی خدمت کو ذریعہ نجات سمجھا اور آزاد خیالی اور بلند نظری کو انسانی شرافت کا معیار خیال کیا۔ جو واقعات ذیل مین قلمبند این اُن کو انھین صفات کی تفسیر سمجھنا چاہیے۔ آپ ضلع بارہ بنکی مین ۱۸۶۴ء مین پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ آٹھ نو برس کے سن مین اُردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ اِس کے بعد اسکول مین انگریزی تعلیم کی بنیاد پڑی۔ انگریزی زبان سے آپ کو کچھ ایسا خلقی اُنس تھا کہ مڈل ہی کی جماعت مین آپنے علاوہ نصاب تعلیم کی کتابون کے انگلستان کے مشہور مصنف اسمائلس (Smiles) کی وہ نورانی تصانیف پڑھین جو سلف ہلپ (Self-help) اور کیرکٹر (Character) کے لقب سے مشہور ہین۔ ان کتابون کو آپ کے علمی مذاق کی عالی شان عمارت کا بنیادی پتھر خیال کرنا چاہیے۔ انٹرنس مین پہونچکر آپ کے مطالعے کا دائرہ اِس قدر وسیع ہوا کہ آپنے کارلائل ایسے خارا شگاف مصنف کی زبردست تصنیف ہیرو اور ہیرو ورشپ (Hero and Hero-worship) کو بارہا پڑھا اور جزو دماغ کیا۔ اس کے علاوہ اسپکٹیٹر (Spectator) کو بھی بہت پڑھا۔ انٹرنس کی منزل طے کرنے کے بعد لکھنؤ مین کیننگ کالج مین شریک ہو کر ایف۔ اے۔ کی جماعت مین قدم رکھا۔ یہان کالج کا نفیس کتب خانہ کیا ملا گویا پیاسے مسافر کو دریا کا کنارا مل گیا۔ یہان آپ مذہب، اخلاق اور فطرت انسانی کے فلسفے کے متعلق متعدد کتابین پڑھا کیے۔ جن مین مندرجۂ ذیل تصانیف خاص شوق کے ساتھ پڑھین۔

(1) Spencer's Study of Sociology.

(2) *Spencer's Essays.*

(3) *Spencer's First Principles.*

(4) *Hume's Essays.*

(5) *Conflict between Science and Religion.*

(6) *Mill's Subjection of Women.*

(7) *Mill's Three Essays on Religion*

آخری کتاب لکھنؤ سے بنارس تک ریل کے سفر مین پڑھ ڈالی - میرے نوجوان دوستو اس علمی شوق کی مجسّم تصویر پر نظر ڈالو اور اپنے مذاق کی پاکیزگی پر غور کرو - اوّل تو نصاب تعلیم کی کتابون کے علاوہ تمہارے لئے دوسری کتاب کا پڑھنا محض خلاف وضع ہی نہین ہے بلکہ کفر مین داخل ہے اور خدا خدا کر کے یہ کفر اگر کبھی ٹوٹتا بھی ہے تو اُن ادنیٰ درجے کے افسانون کے مطالعے سے جن کا بازار اسٹیشنون پر گرم رہتا ہے - دیکھو اگر ایک ایف - اے - کی جماعت کا طالب علم اپنی دماغی قابلیت کو کافی نشو و نما دیتا ہے تو وہ کارلائل - مل - اور اسپنسر کے ایسے باریک بین اور نکتہ سنج مصنفون کے آسمان فکر سے تارے توڑ لا سکتا ہے - مگر یہ ہو تو کیونکر ہو تم کو پوشاک کی تراش و خراش اور دماغ کے بیرونی حصے کی آرائش اور بیٹ اور ریکٹ کی گردش پر وجد کرنے ہی سے فرصت نہین ملتی کہ تم مل اور اسپنسر کی روح پر احسان کرو - پنڈت بشن نراین در کا یہ وتیرہ نہ تھا - آپ طالب علمی کے زمانے مین دماغی مشاغل مین ہمہ تن محو رہتے تھے - اور انگریزی لکھنے مین آپ نے خاص مہارت پیدا کر لی تھی - کالج کی تعلیم کے علاوہ آپ کے

دل و دماغ کی نشوونما پر ایک اور بہترین اثر پڑ رہا تھا۔ یہ کشمیری کلب کا اخلاقی اثر تھا۔ اِس کلب کے جلسے ہفتہ وار ہوتے تھے جن مین مختلف اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ اس مرکز اخلاق کا اثر بہت زبردست اور وسیع تھا اور حضرت دؔر خود فرماتے تھے کہ آپ کے گھر کی نظری تعلیم ایسی تھی کہ اگر آپ کلب کے ممبر نہ ہوئے ہوتے تو شاید قومی اور سوشل مسائل کے متعلق آپ اکثر نئے خیالات سے عرصۂ دراز تک بے خبر رہتے۔ غرضکہ کلب کی تربیت اور ذاتی مطالعۂ کتب سے آپ کے خیال روز بروز وسیع اور روشن ہوتے گئے اور آپ کو ولایت جانے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ خیال رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا اور کالج کی تعلیم سے طبیعت ہٹ گئی۔ اس عرصے مین امتحان کا زمانہ آیا اور آپ ریاضی کی مدین ناکامیاب رہے اور بی۔ اے۔ کی جماعت مین ترقی نہ پا سکے اِس ناکامیابی نے ولایت کے شوق پر تازیانے کا کام کیا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ولایت کے نام سے روح فنا ہوتی تھی اور ولایت کا سفر عقبے کے سفر سے کم وحشتناک نہین کیا جاتا تھا۔ لہٰذا والدین سے اجازت ملنا ناممکن تھا۔ مگر آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کو موافق کر لیا اور بجز دو ایک احباب کے اِس راز سے کسی کو آگاہ نہ کیا۔ اور ایک روز الہ آباد کے سفر کا بہانہ کر کے بمبئی روانہ ہو گئے اور وہان سے ولایت کی راہ لی۔ لندن پہونچکر آپ نے بیرسٹری کی تکمیل کی فکر کی مگر چونکہ قانون سے طبعی مناسبت نہ تھی لہٰذا اس کو محض ایک معاش کا ذریعہ سمجھا اور اپنا علمی مذاق وہان بھی قائم رکھا۔ ولایت کے تین سال کے قیام کے زمانے مین آپ نے زیادہ تر فن تاریخ فلسفہ اصول پالیٹکس (Abstract Politics) اور سوشیالوجی (تمدن) کے متعلق کتابین پڑھین۔ خصوصاً ذیل کی کتابون پر زیادہ توجہ رہی۔

Herbert Spencer's Works.

Huxley's Essays.

Tyndall's Fragments of Science.

Darwin's Origin of Species.

Mill's Works.

Lecky's Rationalism.

Lecky's History of European Morals.

History of Civilization.

Draper's Intellectual Development of Europe.

Sir H. Mayne's Works

Carlyle's Works.

ولایت کے سفر کے قبل کارلائل کی ہیرو ورشپ اور اسپنسر کی سوشیالوجی کا اثر آپ کی دماغی تربیت پر بہت پڑا تھا۔ ولایت مین آپ کو مل کی تصانیف پڑھنے کا زیادہ شوق دامنگیر ہوا۔ آپ فرماتے تھے کہ ولایت مین آپ نے مکالے کی کوئی تصنیف نہین پڑھی بلکہ ہندوستان واپس آنے کے بھی کئی برس بعد اس برق وش مصنف کی سیر کی۔ پنڈت بشن نراین در کو سنجیدہ تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ مدنظر رہا۔ افسانون اور ناولون کو بالاے طاق رکھا۔ یعنی ادنےٰ درجے کے ناول تو خارج از بحث ہین۔ پنڈت صاحب موصوف نے ولایت سے واپس آنے کے بعد انگلستان کے جادو

نگار مصنف اسکاٹ کے تاریخی افسانے پڑھے۔ ولایت کی تعلیم سے آپ کا علمی مذاق پختہ ہوگیا۔ اور آپ کو انگریزی ادب اور انگریزی زبان پر وہ عبور حاصل ہوگیا جس کی تعریف آسان ہے مگر تقلید مشکل ہے۔ انگریزی زبان کے مصنفین مین کارلائل، ٹرل۔ فرووڈ۔ میتھو آرنلڈ۔ ہکسلی مارلی ہیر یسن۔ برک زیادہ تر ہمیشہ سے آپ کے پسند خاطر ہین۔ اور شعرا مین شکسپیر۔ بائرن۔ شلی کیٹس۔ ورڈس ورتھ اور ٹینی سن کے چمنستان سخن مین آپ زیادہ گرم سیر رہتے ہین۔ ملٹن کا کلام کم پڑھا ہے اور اُس طرف طبیعت بھی زیادہ مائل نہین ہے۔

ولایت کے اخبارون مین لندن ٹائمس کی نسبت آپ ایک لطیفہ بیان کرتے تھے کہ اس گران قدر اخبار کے نسبت آپ سے ولایت کے قیام کے زمانے مین مسٹر ہنٹنگ نے (جو کہ اب سر سپی ہنٹنگ ہین) فرمایا کہ اگر "تم کو دریافت کرنا ہو کہ انگریزون کا اصلی خیال کیا نہین ہے تو ٹائمس کو پڑھو"۔

"If you wish to know what the English people do not think, read the Tims."

یہ ایک عجیب فقرہ تھا۔ مگر پنڈت صاحب موصوف کا خیال ہے کہ ایسا کہنا بالکل صحیح نہین ٹائمس مین جمہور کے خیالات کا عکس نہو مگر اس کو اُمرا اور اکابر کے جذبات اور خیالات کا مرقع ضرور سمجھنا چاہیے۔ ولایت کے اکثر اخبارون اور رسالون مین پنڈت بشن نراین نے مضامین لکھے جو وہان وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ولایت کے قیام کے پہلے سال مین پنڈت صاحب موصوف کو پولیٹکل امور مین زیادہ دلچسپی پیدا نہین ہوئی مگر جب ۱۸۸۴ء کے آخر مین مسٹر گلیڈسٹن نے

ہوم رول بل پیش کر کے انگریزون کے پولیٹیکل خیالات کے دریا مین تلاطم پیدا کر دیا تو اُس سے آپ بھی متاثر ہوے اور ہندوستان کے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کے جذبات آپ کے دل مین بھی بیدار ہوے۔ حسن اتفاق سے اُسی زمانے مین مسٹر لال موہن گھوش مرحوم اور مسٹر چندر وارکر بھی ہندوستان کے ادبار و بیکسی پر نوحہ خوانی کرنے کے لیئے ولایت تشریف لے گئے اور مسٹر گھوش موصوف نے پارلیمنٹ کی پولیٹیکل خانقاہ مین اپنا سجادہ قائم کرنے کی فکر کی۔ ان تمام واقعات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ آپ نے بھی ہندوستان کے پولیٹیکل مسائل کا مطالعہ شروع کیا اور ملکی خدمت کا بیڑا اُٹھالیا۔ ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آنے کے بعد مطالعۂ قانون محض تفنن طبع کی طور پر جاری رکھا اور پولیٹیکل اور سوشل مسائل کی چھان بنان مین ہمہ تن سرگرم رہے۔ آپ کے کتب خانہ مین انگریزی ادب و فلسفہ و اخلاق وغیرہ کی کتابون کی تعداد سیکڑون سے تجاوز کر گئی مگر قانون کی کتابون کا ذخیرہ بہت محدود رہا مین اپنے ذاتی علم سے کہ سکتا ہون کہ ایک مرتبہ آپ کی خدمت مین نیاز حاصل کرنے کے لیئے جانا ہوا تو یہ تماشا نظر آیا کہ آپ کسی پولیٹیکل یا سوشل مسئلے پر مضمون تحریر فرما رہے ہین اور خدمتگار کو یہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر موکل آئے تو اُس سے کہ دو کہ بیرسٹر صاحب گھر پر موجود نہین ہین۔ دنیادار اور زر پرست اس اخلاقی سرگرمی کو نرم سے نرم الفاظ مین جنون اور سخت الفاظ مین حماقت کہین گے۔ مگر جن فدائیان وطن کے دل درد محبت سے آشنا ہین اور جن کے سر پر ایثار کے فرشتے کے پرون کا سایہ ہے وہ ضرور اس حب الوطنی کے جوش پہ درود پڑھین گے۔ میرے دوستو انسانی عظمت اسی کا نام ہے اور حیات جاودانی کا سرمایہ ایسی ہی زندگی سے حاصل ہوتا ہے مگر حرص و ہوا کے اسیر

خود پرستی سے کے شیدا ان روحانی رموز سے واقف نہین۔ فارسی کا اُستاد کہ گیا ہے؟ ؎

حریف ناوکِ مژگان خون ریزم نئی ناصح   بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

۱۸۸۷ء مین جب کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس مین ہوا تو پنڈت بشن نراین در بھی اُس مین شریک ہوے۔ کانگرس مین شریک ہونے کا آپ کا یہ پہلا موقع تھا۔ لیکن آپ کی تقریر سے کانگرس کے پیرِ طریقت مسٹر ہیوم ایسے متاثر ہوے کہ اُنھون نے تقریر مذکور کے ایک اقتباس سے کانگرس کی روئداد کی پیشانی کو رونق دی۔

آپ کی پولٹیکل جد و جہد کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۸۹۳ء مین اعظم گڈھ کے ہندو مسلمانون مین گاؤکشی کی بنیاد پر فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہوگئی اور بعض حکّام ضلع کی ناعاقبت اندیشی اور پولٹیکل تعصب کی وجہ سے واقعات نے یہ رفتار اختیار کی کہ ہندوؤن پر سرکاری عتاب نازل ہوا۔ اور متعدد ہندو رئیسون اور زمینداروں کی آبرو خطرے مین آگئی۔ اِس طوفان کے عالم مین جب کہ سرکاری قہر سے اعظم گڈھ کے در و دیوار بھی پناہ مانگ رہے تھے اور کسی وکیل یا بیرسٹر کی جُرأت نہ ہوتی تھی کہ ناکردہ گناہ ملزمون کے مقدمات کی پیروی کرے۔ پنڈت بشن نراین در خود اعظم گڈھ تشریف لے گئے اور وہان کل واقعات کی تحقیقات کر کے ایک معرکہ آرا پمفلٹ مین حکام کی انتظامی بدعنوانیون کا پردہ فاش کیا۔ یہ پولیٹکل معرکہ اِس صوبے کی تاریخ مین یادگار رہیگا۔ اور اُس زمانے مین بنگال کے اخبارون نے لکھا تھا کہ پنڈت بشن نراین در نے وہ کام کیا ہے جس کے لئے اگر اُن کا سونے کا بت قائم کیا جائے تو مناسب ہے۔ اِس پمفلٹ کے علاوہ پنڈت صاحب موصوف نے اکثر طولانی مضامین پولٹیکل اور سوشل مسائل پر مختلف اخبارون مین لکھے ہین جن کے پڑھنے سے یہ واضح

ہوتا ہے کہ آپ نے مغربی ملکون کی تاریخ اور فلسفہ پر کیسا عبور حاصل کیا ہے اور مغربی اصول کی روشنی مین آپ کس آسانی سے ہندوستان کی پولیٹکل اور سوشل گتھیان سلجھانے کی کوشش کرتے ہین آپ کی تحریرین ہمیشہ نہایت فلسفیانہ آزاد خیالی کے جوہر سے معمور ہوتی ہین اور اعلیٰ درجے کی تنقید کا نمونہ ہوتی ہین ۔ جہان تک حسن تحریر کا تعلق ہے اُس کی تعریف میرے قلم کی محتاج نہین ہے ۔ بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کہتے تھے کہ مسٹر ڈگبی نے اُن سے ایک مرتبہ فرمایا کہ اِس وقت ہندوستان مین دو شخص اعلیٰ درجے کی انگریزی لکھ سکتے ہین ۔ ایک پنڈت بشن نراین در اور دوسرے مسٹر ان ۔ ان ۔ گھوش مرحوم ۔

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کا بیان ہے کہ جب وہ آگرہ مین کالج مین پڑھتے تھے تو ایک روز مسٹر اینڈروز اُن کے پروفیسر جو کہ خود انگریزی زبان کے ایک عالم متبحر تھے کہنے لگے کہ اگر اِس صوبے مین کوئی شخص ایسی انگریزی لکھتا ہے کہ جس کی تحریر پر اہل زبان انگریز کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہے تو وہ بشن نراین در ہے ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ آگرہ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹامسن نے اُن سے برسبیل تذکرہ ایک روز کہا کہ جو مضامین بشن نراین در نے آثار زمانہ (Signs of Times) کے عنوان سے تحریر کیے ہین ۔ اگر مین ایسے مضامین لکھتا تو ولایت کے کسی نامی اخبار مین شایع کرتا اور ان کی اشاعت سے میرا نام ہو گیا ہوتا ۔

پنڈت بشن نراین در کا علمی مذاق محض انگریزی ادب اور انگریزی زبان تک محدود نہین، اُردو اور فارسی شاعرون کا کلام بھی آپ نہایت شوق سے پڑھا کرتے ہین اور آپ کا خیال یہ ہے کہ قومی اور ملکی ترقی کے لیئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے وطن کی قدیم زبانون کو یعنی

اُردو وہندی وغیرہ کی مردہ ہڈیون مین نئی رُوح پھونکی جائے۔ چنانچہ آپ خود اُردو کے سخن سنج ہین۔ پہلی غزل جو اُردو مین آپنے تصنیف فرمائی تھی اُس کا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آگیا۔ وہ شعر یہ ہے۔

جلیب ملک ہین اپنے وطن سے ہم کو اُلفت ہے
تمنائے ولایت کیا کرین ہندوستان ہو کر

بارہ تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ پنڈت للتا پرشاد صاحب بٹ پوری کے یہان لکھنؤ مین دو سال تک مشاعرے ہوا کئے۔ یہ مشاعرے بھی یاد رہینگے۔ پنڈت بشن نراین دَر برابر ان مشاعرون مین شریک ہوتے رہے اور برابر طرحی غزلین کہتے رہے۔ پہلی ہی جو غزل آپ نے مشاعرے مین پڑھی اس کا ایک شعر بہت مقبول ہوا اور مشہور بھی ہوا۔

نیّتِ پاک ہی کافی ہی طہارت کے لئے
نہ وضو چاہیے زاہد نہ تیمم مجھ کو

ایک مرتبہ آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہان قطب کی لاٹ کی سیر کو بھی گئے۔ اُس خاص موقع پر آپ نے ایک رباعی تصنیف فرمائی۔

رباعی

دُنیا کی عجیب ہم نے ہستی دیکھی
پہونچے جو بلندی پہ تو پستی دیکھی

مینار سے قطب کے جو کی ہم نے نگاہ
اُجڑی ہوئی دہلی کوئی بستی دیکھی

اُردو شاعرون مین آپ کو آتش وانیس وغالب کا کلام بہت پسند ہے اور انیس کو آپ تمام اُردو شعرا مین ممتاز سمجھتے ہین۔ اور نیز آپ کا یہ خیال ہے کہ اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کی پرواز فکر اکثر بڑے بڑے انگریزی شعرا کی پرواز فکر کا مقابلہ کرتی ہے۔ آپ کے کلام سے چند اشعار تبرکاً

درج ذیل ہین۔

قیدیِ دامِ رگِ گل ہون برنگِ نکہتِ گل　　　اے صبا آزاد کر دے صورتِ نکہت مجھے
منّ و سلوا مفت کا گر ہو تو ہے مجھکو حرام　　　ہو ریاضت کی تو نانِ خشک ہے نعمت مجھے

ہر دانے کی کیا زیرِ زمین کل تھی حقیقت　　　کیون خاک سے دامن کو اٹھائے ہین شجر آج

ہی بیکاری بھی اس خمخانۂ عالم مین بیگاری　　　جو خالی بیٹھے ہین وہ عمر کا پیمانہ بھرتے ہین

جب نہ سوجھی راہِ حق گم گشتگانِ دہر کو　　　شیخ کوئی ہو گیا کوئی برہمن ہو گیا

اثر ہو سننے سے کانون کو یا نہ ہو لیکن　　　جو فرض تھا وہ ادا کر چکی زبان اپنا

ہر اک تھا زیرِ سایۂ دامانِ مادری　　　کس کو نہین ہے یاد وہ الطاف گستری
موقوف جب تھی شیر ہی پر جسم پروری　　　تاثیرِ مادری سے ہو کیونکر کوئی بری

بچون کو مان کی گود بھی مکتب سے کم نہین
اس مدرسے مین حاجتِ لوح و قلم نہین

ابھی دو تین ہفتہ کا عرصہ ہوا کہ بیماری کی حالت مین آپ نے الموڑہ سے ایک غزل کہہ کر بھیجی ہے۔ دو ایک شعر اُس کے درج ذیل ہین ؎

طریق لطف مہمانی مین یکسان دوست دشمن ہین　　گھر اُس کا ہے یہان جو آشنا بیگانہ آتا ہے
نکل آئے ہین کس وحشت سرا مین تیرے دیوانے　　نظر کو سون تلک ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے
ہین مرگ و زیست پردے شعبدہ گر کے تماشے کے　　نظر بندی کا عالم ہے کوئی جاتا نہ آتا ہے

لیکن دس بارہ سال کے عرصے سے آپ کچھ ایسے مکروہات دنیوی سے تنگ رہے جس کی وجہ سے آپ کو پولیٹکل معرکہ آرائیون کے میدان سے ہٹ کر گوشۂ تنہائی اختیار کرنا پڑا اور سوائے مطالعۂ کتب کے آپ کے تمام دماغی مشاغل کا بازار سرد رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عرصۂ دراز سے آپ کے اہل وطن آپ کی تحریر و تقریر کے فیض سے محروم رہے اور ملک کے اکثر گوشون سے یہ صدا آیا کی ؎

صد فصل نو بہار گذشت و درین چمن　　بلبل تو نالۂ نکشیدی چہ شد ترا

زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ملک اور قوم کی بدنصیبی آپ کی مسلسل علالت کی شکل مین نمودار ہوئی ہے جس مین آپ چار سال سے گرفتار ہین۔ لیکن اِس عالم مین بھی آپ ملک کی خدمت سے بے خبر نہین ہین۔ لکھنؤ کی پراونشل کانفرنس مین جو آپ نے زبردست تحریر رفارم اسکیم کے متعلق پڑھی تھی اس سے لوگون پر یہ آئینہ ہو گیا کہ تپ دق کی جانگزا علالت سے بھی اِس شیر دل اور شیر مرد مدبر کی قوت دماغ اور شان تحریر مین فرق نہین آیا ہے۔ یا جو مضمون آپ کا ۱۲ و ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کے لیڈر مین نئی کونسل کے قواعد کے متعلق شایع ہوا ہے۔ اُس نے سب کو حیرت مین ڈال دیا ہے اور آپ کی صحت کی ناقابل اطمینان حالت کو دیکھ کر اگر ہم اِس مضمون کو قوت تحریر کا

معجزہ کہوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ ملک کے پولیٹیکل واقعات کی رفتار کا اندازہ آپ اپنی بیماری کے بستر سے کررہے ہین۔ اور رجحان ماری کی نیک نیتی مین آپ کو یقین نہین بلکہ عقیدہ ہے۔ اس وقت اکسٹریمیسٹ یعنی شورش پسند فرقے نے جو ملک مین ہنگامہ حشر بپا کر رکھا ہے اس کے نسبت آپ ایک حال کے خط مین تحریر فرماتے ہین۔

"اس وقت کی پولیٹیکل شورش کی نسبت میری نہایت مختصر رائے یہ ہے کہ (Anarchy)[1] تو ہر طرح سے قابل گردن زدنی ہے لیکن (Extremism)[2] ابھی ہمارے واسطے سخت مضر ہے۔ جس قسم کے فائدے ان سے کبھی کبھی بعض ملکون مین ہون لیکن جو میرے نزدیک نہایت مشتبہ ہین وہ بھی ابھی ہندوستان کو ۵۰ برس تک نہین ہو سکتے۔ میرے نزدیک جو بمبئی کے لیڈر ہین اُنھون نے اس معاملے کو خوب سمجھا ہے اور بہت دانشمندی کی پالیسی اختیار کی ہے۔ بنگال کے بعض لیڈرون کی حالت قابل اطمینان نہین ہے اور ہمارے صوبے والون کو تو انکی کبھی اس معاملے مین تقلید نہین کرنا چاہیے (Moderate)[3] فریق کے اصول بہت عمدہ ہین مگر اُن سے مجھکو یہ خوف ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ وہ (too moderate)[4] نہ ہو جائین۔"

طالبعلمون کو آپ خاص محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہین اور متعدد نوجوان آپ کے علمی فیض کے چشمے سے سیراب ہو چکے ہین اور اس وقت تک اپنے کو آپ کا شاگرد خیال کرتے ہین اور فخر کرتے ہین۔ ڈاکٹر تیج بہادر صاحب سپرو۔ ایم۔ اے۔ ال۔ال۔ ڈی۔ اس صوبے کے تعلیم یافتہ حضرات مین خاص امتیاز رکھتے ہین۔ آپ ایک خط مین تحریر فرماتے ہین۔

---

[1] طوائف الملوکی۔ [2] شورش پسند فرقے کا طرز عمل۔ [3] اعتدال پسند۔ [4] ضرورت سے زیادہ اعتدال پسند۔

"۱۸۹۵ء مین مجھے پنڈت بشن نراین سے دہلی مین چند بار موقع ملاقات کا ہوا اور اس کے بعد مجھے اُن سے ایسی عقیدت ہوگئی جیسے کہ کسی شاگرد کو اُستاد سے ہوتی ہے۔ مین نے اُسی زمانے مین ایم۔اے۔ کا امتحان پاس کیا تھا اور ایم۔اے۔ کے امتحان کے کورس مین میرے زمانے مین مل کی مشہور کتاب لبرٹی (Liberty) مقرر تھی۔ باوجودیکہ مین نے اس کتاب کو نہایت محنت سے پڑھا تھا۔ مگر چند مشکلات مجھے ایسی معلوم ہوتی تھین کہ جن کا جواب مین خود آسانی سے نہین دیسکتا تھا۔ مین نے ایک مرتبہ موقع پاکر پنڈت صاحب سے ان کا تذکرہ کیا ...... مین اپنے تجربے بعد یقیناً کہہ سکتا ہون کہ مل کو جس خوبی کے ساتھ پنڈت بشن نراین صاحب نے سمجھا ہے بہت کم ہندوستانیون نے سمجھا ہوگا۔"

اسی صورت پر پنڈت منوہر لال صاحب زتشی ایم۔اے۔ پروفیسر ٹریننگ کالج الہ آباد ایک نج کے خط مین تحریر فرماتے ہین۔

"مجھے یہ کہنے مین کلام نہین ہے کہ پنڈت بشن نراین در نے مجھ کو غور و فکر کا طریقہ بتلایا۔ مجھ کو اُن کی علمی شاگردی کا فخر ہے اور مین اُن کی خدمت مین نیاز حاصل ہونے کو ایک نعمت سمجھتا ہون۔"

میرے دوستو! ابھی تک مین نے بشن نراین در کے دماغی اوصاف کا ذکر کیا ہے لیکن پنڈت صاحب موصوف کی اصلی وقعت و عظمت کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہین جن کو آپ کی خدمت مین دوستانہ یا شاگردانہ نیاز حاصل ہے۔ میرا یہ کہنا ہرگز مبالغہ مین داخل نہ ہوگا اور آپ کے احباب مجھ سے کلیتاً اتفاق کرینگے کہ پنڈت صاحب موصوف اپنے صفائی قلب۔ حمیت و نیک نیتی

اور صبر و استقلال کے لحاظ سے انسانی عظمت کی تصویر ہین یا یون کہون کہ قدرت نے توکل اور استغنا کے پتلے مین کسی یوگی کی روح پھونک دی ہے - اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے احباب آپ کی پرستش کرتے ہین - جب آپ کے ولایت سے واپس آنے پر کشمیری پنڈتون کے فرقے مین طوفان بے تمیزی برپا ہوا اور آپ کو برادری سے خارج کرنے کا فتوی دیا گیا تو اُس زمانے مین بھی آپ کے دل مین بغض و کینہ کے جذبات جوش مین نہ آئے اور آپ نے اپنے پرجوش مخالفین کی حماقتون کو ہنسی مین ٹال دیا - اور آپ کی اس اخلاقی عظمت یہ نتیجہ تھا کہ کشمیری پنڈتون مین سفر ولایت کا مسئلہ آسانی سے طے ہوگیا - آپ کا ہمیشہ یہی اصول رہا - ؎

وفا سرشت ہون شیوہ ہے دوستی میرا　　نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

مگر مین یہ ضرور کہون گا کہ اکثر موقعون پر پنڈت صاحب کا توکل و استغنا درجۂ اعتدال سے گزر جاتا ہے - مثلاً ایک مرتبہ انگلستان کی مشہور فسانہ نگار مسز اسٹیل نے آپ سے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے تمام مضامین ہم کو عنایت کرین تاکہ ہم اپنے زیر اہتمام ولایت مین شایع کرائین اور وہان کے انگریزون پر آپ کے خداداد طبعی جوہرون کا اظہار کرین - آپ نے مضامین دینے کا وعدہ تو کرلیا مگر آپ کے پاس آپ کے ایک مضمون کا بھی مسودہ نہ تھا - اب مضمون آئین تو کہان سے آئین - بہرحال آپ کے اکثر احباب آپ کے مضامین جمع کرتے تھے - اُنھون نے جتنے مضامین آپ کے قلم سے نکلے ہوے دستیاب ہوسکے آپ کے حوالے کئے - مگر آپ کے استغنا اور تساہل نے اس امر کی اجازت نہ دی کہ آپ وہ مضامین مسز اسٹیل کو روانہ کردین - اُنھون نے ولایت پہونچکر بہت تقاضے کئے لیکن یہان سے بجز سکوت کے جواب نہ ملا - آخر معلوم

ہوا کہ وہ مضامین آپ سے گم ہو گئے۔ میں یہ ضرور کہونگا کہ آپ کو ذاتی شہرت کا خیال مطلق نہین ہے۔ لیکن اگر آپ کے مضامین ولایت مین مسز اسٹیل کے اہتمام سے شایع ہو جاتے تو غریب ہندوستان کا بہت کچھ بھلا ہوتا اور وہان کے انگریز اس تیرہ خاکدان کی بہت سی حالتون سے واقف ہو جاتے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی جرمن سائنٹسٹ نے آپ کو ایک خط بھیجا اور اُس مین یہ درخواست کی کہ آپ مسئلہ ذات کے متعلق اگر ایک مضمون لکھ کر بھیج دین تو آپ کو پی، ایچ، ڈی، کا خطاب دیا جائے۔ آپ نے اُس خط کو بھی ردی کی ٹوکری کے سپرد کیا۔ آپ کے دوستون کو اس طرح کی متعدد مثالین یاد ہین جب کہ آپ نے شہرت سے دور بھاگنے کی کوشش بلیغ فرمائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جناب موصوف میری اِس نکتہ چینی کی گستاخی کو معاف فرمائین گے کیونکہ مین ہمیشہ سے آپ کو اپنا محسن اور فرشتہ رحمت خیال کرتا ہون۔ اس توکل و استغنا کے ساتھ طبیعت مین صبر و استقلال کا یہ عالم ہے کہ تپ دق کی بیماری نے بھی آپ کی کمر ہمت نہین توڑی ہے۔ آپ کو اپنی بیماری مین محض ایک سائنٹفک دلچسپی ہے اور وہ وحشت یا خوف جو کہ عام طور پر ایسے مریضون مین پایا جاتا ہے آپ سے کوسون دور رہے۔ مجھے گذشتہ ستمبر مین الموڑہ جانے کا اتفاق ہوا اور آپ کی خدمت مین قریب تین ہفتے کے نیاز حاصل رہا۔ اِس عرصے مین آپ سے مختلف سوشل پولیٹیکل معاملات پر مباحثہ رہا مگر آپ کی گفتگو کی تازگی مین مطلق فرق نہین پایا۔ نہ آپ کے بشرے سے خوف یا مایوسی کے آثار نمایان دیکھے۔ برعکس اس کے گفتگو مین وہی قدیم انداز اور ظرافت کی چاشنی کا مزہ موجود تھا۔ ایک روز ایک طالبعلم آپ سے ملنے آیا جو بیچارہ خود دق و سل کے مرض مین مبتلا تھا۔ اس کی

حالت اچھی تھی مگر حسب معمول وہ کسی قدر مایوسی کی گفتگو کر رہا تھا اور کچھ اس امر پر مجھ سے اور اُس سے بحث ہونے لگی کہ ڈاکٹر جو آلہ لگا کر امراض سینہ کی جانچ کرتے ہین تو واقعی یہ تشخیص کا طریقہ نہایت مشکل ہے، اور محض سانس کی آواز سے پھیپھڑون کے زخمون کا اندازہ کرنا کارے دارد۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی اور اس طریقہ تشخیص کے غیر مکمل ہونے پر طالب علم مذکور کچھ افسوس اور مایوسی ظاہر کر رہا تھا کہ آپ نے ایک مرتبہ ہنس کر کہا کہ تشخیص کا طریقہ تو بہت اچھا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر ہوشیار ہو اور اسی کے ساتھ غالب کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

محرم نہین ہے تو ہی نوا ہاے راز کا ... یان ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس شعر کے پڑھتے ہی ہما سب ہنس پڑے اور مایوسی کا رنگ تازگی سے بدل گیا۔ اور یہی طبیعت کی تازگی ہے جس کو کہ ڈاکٹر بہت اچھی علامت سمجھتے ہین اور یقین ہے کہ وہ ایک مہینے کے عرصے مین تپ رہنا موقوف ہوجاے۔ اور صحت عود کر آئے۔ اطبا کی یہ راے ہے کہ آپ کے مرض کا زور بہت کم ہوگیا ہے اور عقیدت مند دل یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہے ہین کہ ؎

لذت سیر دگر چشم تمناسے گی ... ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

مگر ابھی مرض پورے طور سے فنا نہین ہوا ہے اور ضعف اِس قدر قائم ہے کہ ہر گھنٹے بستر ہی کے نذر ہوتے ہین مگر یہ جسمانی کاہشین اس پولٹیکل یوگی کی روح کی تازگی مین فرق نہین پیدا کر سکتین اور آزاد دماغ کے آزاد خیالات اپنی اصلی قوت کے کرشمے دکھا رہے ہین۔ میرے دوستو عبرت کی آنکھین کھولو اور انسانی عظمت کی پرستش کا کلمہ پڑھو اور یہ دعا کرو کہ آپ فتح پھر جوہین آئے۔ تمہاری دعا مستجاب ہو گی کیونکہ

ع۔ اثر باقی ہے بیکیس کی دعاہین

تاریخ

(ماخوذ از رسالہ "تہذیب")

تاریخ ہے معلم باہوش وباخبر ہو اس کے مدرسے مین اگر ایک دم گزر
مضمون ملین وہ جن سے ہو روشن دل بشر عالم جہان کا اور ہی آنے لگے نظر
اُٹھے نقاب دیدۂ وہم وخیال سے
ماضی زیادہ صاف نظر آئے حال سے

تاریخ عقدہاے سلف کی کلید ہے رشتہ یہی میان قریب وبعید ہے
جس کو کہ ہم سمجھتے ہین وضع جدید ہے اس کے لباس کہنہ سے قطع وبرید ہے
تاریخ حال اہل سلف کی گواہ ہے
غافل کے واسطے سبق انتباہ ہے

(پنڈت بشن نراین در - آبر)

موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دُنیا مین جس قدر رسم ورواج یا علوم وفنون ہین وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور مین آئے ہین - فن تاریخ بھی اس حالت سے مستثنی نہین ہے

ابتداے آفرینش سے موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبون کے مختلف سانچون مین ڈھلتا چلا آیا ہے - ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دُنیا مین آئے ہوے بہت کم دن گزرے تھے قدرت کے کارخانے اِس کے لئے معمے سے کم نہ تھے اِس عالم حیرت مین اس کی نگاہون کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گزرتے تھے وہ اِس کے دل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑے ہوتے ہین کبھی راتین کبھی چاند سورج سیاہی مین چھپ جاتے ہین - کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے - کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے - شروع شروع مین وہ قدرت کے کارخانون مین کوئی انتظام یا ترتیب نہین پاتا تھا - ان انقلابات سے متاثر ہو کر وہ دُنیا کی کیفیت تشبیہون اور استعارون کے رنگ مین ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا - اب بھی جو وحشی قومین باقی ہین ان کی گفتگو تشبیہ اور استعارے کے پیرایے مین ہوا کرتی ہے - مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہوگا کہ فلان شخص میرا ہمسایہ ہے تو وہ یہ کہے گا کہ اس کے گھر کی پتیان میرے گھر مین اُڑ کر آتی ہین - چنانچہ زمانہ گذشتہ مین بھی وحشی قومون کا یہی رنگ تھا - اِس قسم کے گیت یا نظمین ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ مین موجود ہین جن مین وہ خیالات پائے جاتے ہین جو کہ انسان کے دل مین ابتدائی تہذیب مین پیدا ہوے ہونگے - مثلاً سیارون کو ایک قسم کا دیوتا مانتا ہے - دریاؤن اور پہاڑون کی عظمت و شوکت سے متاثر ہو کر اُن کی پرستش کرتا ہے اور جب اس کے جذبات دلی جوش مین آتے ہین تو وہ اُن خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے جو کہ نظمون یا گیتون کی شکل مین یاد رہ جاتے ہین اور آیندہ نسلون کو ایک ایسی تاریخ کا کام دیتے ہین جس سے اس وقت کی تہذیب اور ترقی کی حالت آئینہ ہو

نظر آتی ہے۔ ایسی نظمون وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان مین مائی تھالوجی کہتے ہین خلاف عقل انسانی جان کر بالکل بے وقعت نہین سمجھنا چاہیئے۔ ان سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی تشریح نہین ہوتی ہے لیکن اُس وقت کی تہذیب کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ ہو سکتا ہے جس وقت کہ نظمین تصنیف ہوئی تھین۔ اور یہ ایسی تحقیقات ہے جو کہ تاریخی تحقیقات کی حد سے کسی حالت مین باہر نہین ہے اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ تاریخی صراحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تصریح ہے جو کہ موجودہ سائنس کے اصولون پر مبنی ہے۔ دوسرے جذبات انسانی کی توسیع و ترقی کی تشریح ہے۔ فن تاریخ کے ابتدائی کارنامون سے ہم خارجی واقعات کی تصریح عمل مین نہین لا سکتے لیکن اُس وقت کے انسانون کے جذبات دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کر سکتے ہین اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلےٰ علمی ذخیرے کا کام دے سکتے ہین۔ یہ فن تاریخ کی ابتدائی منزل ہے۔

دوسری منزل مین اِس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی۔ جب کہ انسان ترقی کے میدان مین دس قدم اور آگے بڑھا اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہان طاقتین ظہور مین آئین۔ اِس حالت مین تاریخ صرف اُن جذبات و عقائد انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے دل مین محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوے تھے بلکہ اس مین خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارنامون کو بھی دخل ہوتا گیا لیکن یہ واقعات اصلی حالت مین نہین بیان کئے گئے ہر روایت کے بیان مین خیالی عظمت و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اس دور مین پیدا ہوے ان کی تعریف مین بہت سی داستانین

کہی گئین - کچھ نظم مین کچھ نثر مین - مگر واقعات کی صراحت کا خیال بالکل بالاے طاق رہا - اس قسم کی داستانین پڑھنے سے ہم کو ہزارون تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہین مگر جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے ہر واقعے کے بیان مین مبالغے کو بہت دخل ہے - مثلاً لڑائیون کی داستانین اس طرح لکھی گئی ہین جنھین عقل انسانی کبھی قابل اعتبار نہین مان سکتی یا اکثر عظیم الشان انسانون کی تعریف مین مبالغہ درجۂ اعتدال سے گزر گیا ہے - یورپ مین آرتھر[1] ہرکولیز[2] وغیرہ ایسے قدیمی تہذیب کے عظیم الشان انسانون کی مثالین موجود ہین جن کی بہادری اور رُوئین تنی کی تعریف مین دریا بہا دیے گئے ہین - ہندوستان مین مہابھارت[3] کے سورما[4] ہیران کے جواب ہین - ان کی بہادری کی روایتین جس طرز پر لکھی گئی ہین اِن سے صاف ظاہر ہے کہ کس قدر مبالغہ آمیز ہین - مہابھارت کے ہرکولیز یعنی بھیم کی نسبت یہ روایت تحریر ہے کہ اِس نے غصے کے عالم مین ایک بہت بڑا درخت زمین سے اُکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اِس طرح کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اُٹھا کر پھینک دے - گو بادی النظر مین یہ واقعہ خلاف قانون قدرت معلوم ہو لیکن اصل مین یہ ایک بہادر اور قوی ہیکل شخص کی بہادری اور رُوئین تنی کی مبالغہ آمیز تعریف ہے - اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکایتون کا مطالعہ کرین تو ہم بہت کچھ تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہین - اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مبالغہ پسندی کی وجہ کیا ہے - حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا مین بڑے بڑے لوگون کی نسبت مبالغہ آمیز

---

[1] انگلستان کا ایک بادشاہ جو چھٹی صدی مین حکمران تھا -

[2] یونان قدیم کا ایک پہلوان جس کو دیوتا کا رتبہ دیا گیا تھا -

[3] ہندوون کی ایک مذہبی کتاب جو شاہنامہ کے طرز پر ہے اور جس مین پانڈون اور کورون کی لڑائی کی داستان بیان کی گئی ہے - [4] بہادر -

روایتین مشہور ہو جاتی ہین اور جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اس ذخیرے مین اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلاف قدرت کرشمون کا اُنھون نے اپنی زندگی مین کبھی دعوی نہین کیا انھین کا وہ مجموعہ بتلائے جاتے ہین۔ مثلاً ہندوستان مین گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہین کیا بُت پرستی کے خلاف اِس نے وعظ کہا لیکن برہمنون نے ایک پران بنا کر اُس کو اوتار کا اعزاز بخشا ہے اور اس کے مریدون نے اس کے مرنے کے بعد اس کا بُت پوجنا شروع کر دیا ہے۔ ع

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یا سیواجی کی مثال بہت نزدیک زمانے کی مثال ہے۔ یہ سب جانتے ہین کہ سیواجی انسان تھا اس کے وقت کی قابل اعتبار تاریخ موجود ہے لیکن مہاراشٹ مین ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ سیواجی شیوجی کا اوتار تھا اور اس کی پیدایش ایک معجزے کے ذریعے سے ظہور مین آئی تھی۔ اِن واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان مین چونکہ عظمت و شوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہین اس وجہ سے مبالغہ آمیز روایتین بڑے بڑے آدمیون کی نسبت مشہور ہو جاتی ہین۔ یہان تک کہ اکثر ان کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ ابتدائے تہذیب مین چونکہ یہ جذبات نہایت زور شور کے ساتھ انسان کے دل مین پائے جاتے تھے اور اِس کا عقیدہ غائبانہ روحانی قوتون مین تھا لہذا اُس زمانہ مین جو عظیم الشان انسان گزرے اُس کے مداحون نے اُن کو آسمان پر چڑھا دیا اور اُن کی تعریف مین کوئی دقیقہ اٹھا نہین رکھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مبالغہ پسندی کو عیب نہین سمجھتے تھے اُن کے نزدیک یہ ایک قسم کی

عزت تھی کہ بڑے آدمیون کی صفت مین مبالغے سے کام لیا جائے نیز وہ یہ سمجھتے تھے کہ بزرگون کے کارنامون پر جس قدر خیالی تعریف کی وارنش کی جائے زیبا ہے۔ لہٰذا جب ہم اس قسم کی روایتین پڑھین تو ہم کو اس امر کا خیال لازمی ہے کہ ہم اصلی واقعات بجنسہٖ نہین پڑھ رہے ہین بلکہ ان واقعات کی وہ تصویر دیکھ رہے ہین جس مین کہ بہت کچھ مبالغے کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ یہ فن تاریخ کی دوسری منزل کی حالت ہے تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حس پیدا ہوئی ابھی تک اس کا منشا محض جذبات دلی کا اظہار تھا یا بزرگون کی عظمت کرنا نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اُس نے گزشتہ و موجودہ واقعات کو یکجا جمع کرنا شروع کیا لیکن یاد رہے کہ اس وقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہین پہونچ گیا تھا۔ اُس زمانے کی تاریخین محض واقعات کی فہرستین ہین نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت کی فلسفیانہ تفسیرین نیز اس وقت تک مبالغے کو تاریخی واقعات لکھنے مین بہت کچھ دخل تھا۔ ہیراڈوٹس[۱] یورپ کا اِس رنگ کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے اس نے اپنی تاریخ مین اکثر واقعات لکھے ہین جو مبالغے سے پُر ہین یا اسی زمانے کا ایک دوسرا مورخ ہے اُس نے صاف الفاظ مین لکھ دیا ہے کہ مین نے اصلی واقعات کے علاوہ بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ جیسے فردوسی نے شاہنامہ مین صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان ۔۔۔ وگرنہ یلے بود در سیستان

ہندوستان مین تاریخ نویسی کا مذاق اِس حد سے آگے ترقی نہ کر سکا۔ یہان پرانین وغیرہ موجود

---

[۱] یونان کا پہلا مورخ۔

ہین جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ اب چلا ہے لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام ملک کی موجود نہین - اس مین شک نہین کہ ہندوستان کے قدیم باشندون نے مختلف علوم و فنون مین حیرت انگیز ترقی کی تھی جس کی ثنا و صفت مین یورپ کے محققین تر زبان ہین لیکن فن تاریخ نے یہان نشو و نما نہ پائی - اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانون کے دوران حکومت مین اکثر جابر اور متعصب فرمانرواؤن نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلا دین مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس قابل نہین کہ اس پر اعتبار کیا جائے - کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی فلسفہ اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب تک موجود ہے مگر تاریخی کتابین اس انتظام کے ساتھ جلائی گئین کہ اُن کی خاک بھی سرمے کے لئے نہین ملتی - اصل وجہ یہ ہے کہ فن تاریخ نے اُسی ملک مین زیادہ نشو و نما پائی کہ جس ملک مین نظام معاشرت پولیٹکل اصولون پر مبنی تھا - ہندوستان کی حالت جداگانہ تھی یہان نظام معاشرت کا دارومدار محض مذہبی اُصولون پر تھا - یہان دُنیا سے زیادہ عقبیٰ کی فکر رہتی تھی اِس لئے فن تاریخ کو قابل اطمینان ترقی نہ ہوئی کیونکہ فن مذکور زیادہ تر دنیاوی کارنامون سے تعلق رکھتا ہے - اب فن تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو جب انسان مین غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض عادت کا غلام نہین رہا تو اُس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا بلکہ اُن کی رفتار کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا عام اسباب سے عام نتائج اخذ کئے اور ان عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کئے اور ان عام اصولون کو پیش نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی - اس دماغی ترقی کے ساتھ نظام معاشرت کی سادگی مین بھی روز بروز فرق آ گیا اور

زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی - اِس حالت مین تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ اُن واقعات کی اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح ہوگئی - اِس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یورپ مین پڑی - اِس مین شک نہین کہ عربی فارسی وغیرہ مین اکثر مستند تاریخین موجود ہین مگر ان مین صرف سلطنتون کے کمال و زوال کی داستانین درج ہین مگر سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان مین ذکر نہین ہے - یورپ مین سب سے پیشتر ملک اطالیہ مین میکےولی[1] نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل ڈالی - اس کے بعد جرمنی انگلستان وغیرہ مین ایسے مورخ پیدا ہوے جنھون نے علاوہ معمولی واقعات کے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤن پر تاریخ مین نقادانہ نظر ڈالی - آخر کار فرانس مین گیزو[2] نے تاریخ تمدن لکھ کر تمام دنیا کو حیرت مین ڈال دیا - غرضکہ رفتہ رفتہ فن تاریخ ترقی کرتا گیا اور آخر کار تجربے سے یہ ثابت ہوگیا کہ فن تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے یعنی مورخ کامل وہی شخص ہو سکتا ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصور کا قلم رکھتا ہو - دماغ سے واقعات کا فلسفیانہ طور پر اندازہ کرے اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی تصویر کھینچے لیکن ابھی تک غالباً یورپ مین بھی کوئی ایسا مؤرخ نہین پیدا ہوا جس مین یہ دونون وصف درجہ کمال پر پائے جاتے ہون - بالفعل وہان فن تاریخ دو حصون پر منقسم ہے ایک فرقہ ایسے مؤرخین کا ہے جس نے واقعات کی تشریح اور ان کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا حصہ کر لیا ہے - دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگارون کا ہے - اِس قسم کے مصنفین زمانہ ہاے دور دراز کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کی تصویر افسانون کے پیرایہ

---

(1) *Machiavelli* (2) *Guizot.*

مین کھینچتے ہین - جو شخص کہ پوری طور سے تاریخی واقفیت حاصل کرنا چاہے اُس کے لئے ان دونون قسم کی تصانیف کی سیر ضروری ہے - ہمارے اُردو سٹریچر مین تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے - یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگون کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے مثلاً شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اکثر تاریخین لکھی ہین مگر ان تصانیف مین اُس نقادانہ لیاقت سے کام نہین لیا گیا ہے جو کہ فن تاریخ کی شان مین داخل ہے مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہین - بیشک اُردو مین ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پر کہ سچی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کتاب کا نام " دربار اکبری " ہے اور اس کا لکھنے والا ہندوستان کا مشہور مصنف محمد حسین آزاد ہے -

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے

" دربار اکبری " مین محض اکبر کے زمانے کے محاربات وغیرہ ہی کا ذکر نہین ہے بلکہ اکبر کے زمانے کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے - اِس نامور مصنف سے نظم اُردو کی تاریخ " آب حیات " کے نام سے یادگار ہے - یہ تاریخ بھی اپنے رنگ مین لاجواب ہے - علاوہ ان نامی مصنفین کے اکثر حضرات نے چھوٹی چھوٹی تاریخین ہندوستان کے مختلف حصون کی لکھی ہین اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے - مگر افسوس ہے کہ فن تاریخ کی دوسری شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشو و نما نہین پائی - یون تو ایسے فسانہ نگارون کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے تیئن تاریخی فسانہ نگار سمجھتے ہین - مگر

ابھی تک ایک بھی ایسا مصنف نہین پیدا ہوا جو کہ واقعی تاریخی فسانہ نگار کے لقب کا مستحق ہو
میری نظر سے اکثر فسانے گزرے ہین جن کی لوح پر یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ تاریخی فسانہ ہے"
مگر ایک فسانہ کے پڑھنے سے بھی اس زمانے کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کا پتہ نہین چلتا
تھا جس زمانے کا اُن فسانون مین ذکر تھا۔ ان مین محض تاریخی واقعات درج کر دیے گئے تھے
مگر ان کے مصنف زمانہ دیرینہ کے مردہ قالبون مین جان نہین ڈال سکتے تھے۔ ایک فسانہ مین
جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس مین کہ ہزار برس اُدھر کی تاریخ کا ذکر تھا۔ یہ واقعہ نظر سے
گزرا کہ کسی شخص نے کسی کو رجسٹری کر کے خط بھیجا۔ حالانکہ عرب مین اب تک جسٹری کا پتہ
نہین ہے۔ ایک صاحب نے اپنے تاریخی فسانہ مین کسی مغربی عورت کے حُسن کی تصویر مین
سیاہ اور چمکدار زلفین بھی شامل کر دی ہین۔ حالانکہ مغرب مین سُنہرے اور گھونگھر والے
بال ہوتے ہین نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفین۔ ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی فسانہ مین جو کہ راجپوتانہ
کی سو برس اُدھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے محل مین مختلف آرائشون کے علاوہ
اپنے دماغ سے گیس کی روشنی بھی پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اُس زمانہ مین گیس کی روشنی کہان۔

اس تشریح کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ فن تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور کیا کیا رنگ
بدلے۔ اور جو کچھ مین نے اس حد تک تحریر کیا ہے اسے مین فن تاریخ کی تاریخ کہون گا۔
مذکورالصدر اصولون کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کرین تو بہت سی کاوشین رفع ہو جائینگی
مثلاً ہم پر یہ امر روشن رہیگا کہ پرانی کتب مذہبی جنھین کہ ہم تقویم پارینہ خیال کرتے ہین ایک
قسم کے تاریخی سرمایہ سے کم نہین جس سے تہذیب انسانی کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے

یا مہابھارت الیڈ[1] اڈیسی وغیرہ ایسی تاریخی تصانیف ہین جن مین ایسی روایتین درج ہین جو کہ مبالغے سے خالی نہین مگر جن کی اصلیت ضرور ہے۔ علاوہ برین مطالعہ تاریخ مین ہم کو اور چند امور کا بھی خیال لازمی ہے۔ اولاً یہ کہ تاریخ پڑھنے مین ہم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم صرف ایک کہانی یا داستان نہین پڑھ رہے ہین جس مین بادشاہون کی تخت نشینی یا مرنے جینے کے تذکرے ہین بر عکس اس کے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ مختلف زمانون مین انسانی اخلاق کا کیا معیار رہا ہے جس سے کہ تہذیب کے مختلف درجون کا اندازہ ہو سکتا ہے یا مذہبی انقلابات، پر ہم کو غور کرنا چاہیے کہ کون کون مذہبی عقائد مختلف زمانون مین سوسائٹی پر حاوی رہے ہین اور علم طبیعات کی ترقی کے ساتھ ان عقائد مین کیا تبدیلیان پیدا ہوئی ہین اور ان مذہبی انقلابات کے ساتھ سوسائٹی کے سوشل رسم ورواج کا کیا رنگ رہا ہے کون اصول دیرپا ثابت ہوئے ہین اور کن کو زمانے نے فنا کر دیا ہے۔ اِس انداز پر مطالعہ تاریخ کرنے سے تاریخی زمانہ ہم کو محض ایک داستان غیر مسلسل نہ نظر آئے گا بلکہ ہم پر یہ امر آئینہ ہو جائے گا کہ یہ اخلاقی مذہبی اور سوشل قوتون اور ان کے نتائج کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہ ازل سے شروع ہوا ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔

دوسرا امر جس کا خیال مطالعہ تاریخ مین لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو صرف بڑے بڑے واقعات کو ضروری سمجھ کر حفظ نہ کر لینا چاہیے۔ محض بڑی بڑی لڑائیون کی حکایتین یا انقلاب عظیم کی داستانین یاد کر لینے سے ہم سوسائٹی کی اندرونی یا اصلی حالت کا اندازہ

---

[1] الیڈ اور آڈسی یونان کے مشہور اور قدیم شاعر ہومر کی تصانیف ہین۔

نہین کرسکتے ہین - ہم کو زیادہ تر توجہ اُن واقعات پر کرنا چاہیے جو کہ بادی النظر مین غیر ضروری معلوم ہوتے ہین مگر جو دراصل قوم یا ملک کے اخلاق یا عادات پر اثر کرتے آئے ہین مثلاً علمی ترقی یا جہالت کی طرف سوسائٹی کے رجحان کا اندازہ کرنا افلاس و دولتمندی کی مختلف حالتون پر غور کرنا نہایت ضروری ہے - کیونکہ یہ ایسی پنہان قوتین ہین جن سے کہ بڑے بڑے انقلابات ظہور مین آسکتے ہین - لہذا سوسائٹی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے لئے محض عظیم الشان واقعات پر توجہ کرنا ضروری نہین بلکہ اُن نہانی اخلاقی اور علمی قوتون پر غور و تعمق کی نظر ڈالنا چاہیے جن کے زوال و کمال کے ساتھ ملکون اور قومون کے زوال و کمال کی داستانین وابستہ رہی ہین - اکثر لوگون کا یہ خیال ہے کہ دین اسلام کو جو کچھ فروغ ہوا ہے وہ تلوار کے زور سے ہوا ہے جس کے یہ معنی ہین کہ یہ عظیم الشان مذہب محض جبر سے پھیلایا گیا ہے ایسا خیال محض تاریخ اسلام کے سطحی نظارے سے پیدا ہو سکتا ہے - جن لوگون نے عمیق نظر سے عروج اسلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہین کہ اسلام کے فروغ کی بانی ایک زبردست اخلاقی قوت تھی جو کہ رسول عربی کی تلقین سے ظہور مین آئی تھی اور جس نے عرب کے جاہل وحشیون کو سرفروش اور توحید پرست مسلمان بنا دیا تھا - مسلمان ایمان پر جان و دولت قربان کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور یہی زبردست قوت اخلاقی تھی جس نے اسلام کا سکہ دُنیا مین جاری کر دیا - اسی طرح اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان مین مرہٹون کو جو کچھ عروج حاصل ہوا ہے وہ محض لوٹ مار کی بدولت حاصل ہوا ہے اور وہ سیواجی محض ایک زبردست لٹیرا تھا لیکن اگر نظر غور اور انصاف سے مرہٹون کی حیرت انگیز ترقی کی داستان

پڑھی جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ مرہٹون کے سینون مین حُبّ الوطنی کی آگ روشن تھی اور وہ محض ذاتی عروج و فائدے کے لئے نہین لڑتے تھے بلکہ اپنے ملک پر اپنی جان قربان کرتے تھے اور یہ زبردست اخلاقی قوت سیواجی کی بہادری اور جان نثاری سے پیدا ہو گئی تھی جن صاحبون نے جناب رانا ڈے[1] مرحوم کی وہ لاجواب کتاب پڑھی ہے۔ جس کا نام "عروج سلطنت مرہٹہ" ہے۔ وہ میرے اس دعوے کی تائید کرین گے۔ مُرا د ان مثالون کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ محض بڑی بڑی انقلابی حالتون کے ظاہری عنوان تک مطالعہ تاریخ مین نظر نہ محدود رکھنا چاہیے۔ بلکہ ان انقلابات کے اسباب باطنی بھی تلاش کرنے چاہیین۔ مطالعہ تاریخ مین اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہر واقعے کا اندازہ تحقیق و تنقید کی نظر سے کیا جاے کیونکہ اگر کسی قسم کے تعصب سے کام لیا گیا تو واقعات کی تشریح سے کبھی قابل اطمینان نتیجہ نہین نکل سکتا بلکہ نتائج کی صحت مین فرق آجانے سے اُلٹا سبق گمراہی کا ملتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بالفعل ہندوستان مین تاریخی مطالعے کے وقت بہت کچھ تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ یہان رسم و رواج دیرینہ کی پابندی کی بیڑیان ایسی مضبوط ٹھکی ہوئی ہین کہ ہر پرانی بات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اصول اخلاق سمجھا جاتا ہے اس کا اثر مطالعہ تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اکثر حضرات کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہین تو اُن کی محض یہ غرض رہتی ہے کہ جو واقعات کہ پُرانے ہندوؤن کے اخلاقی یا علمی اعزاز کے شاہد ہون اُن کی تشہیر کی جاے اور "پدرم سلطان بود" کا غلغلہ

---

[1] مہادیو گوبند رانا ڈے مبئی ہائیکورٹ کے جج اور اُنیسوین صدی مین ہندوستان کے سرآوردہ لوگون مین تھے۔

بلند کیا جائے اور اگر کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قدیم ہندوستان مین بھی ریل اور تار برقی کا سامان موجود تھا تو پھر کیا کہنا ہے اور جب اس وضع کے حضرات کو کسی ایسی لغزش کا سامنا ہوتا ہے جس سے کہ ہندوستان کے قدیم باشندون کو کسی اخلاقی یا سوشل بدعنوانی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح ان واقعات پر خاک ڈال دی جائے یا اکثر بانیان اصلاح نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کسی اصلاح کی عمل مین لانے کی کوشش کرتے ہین تو اختلاف کی شورش سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے ہین کہ تاریخی واقعات توڑ مروڑ کر لفظی شعبدہ پردازی سے یہ ثابت کر دیتے ہین کہ ہم کوئی نئی بات نہین کہتے ہین بلکہ ایک پرانی رسم تازہ کر رہے ہین - مثلاً ایک بزرگوار پردے کے خلاف ہین انھون نے اپنے دلائل مین اس بے بنیاد تاریخی تصرّف کو بھی شامل کیا ہے کہ مسلمانون مین کبھی پردے کی رسم نہ تھی ہندوستان مین چین سے پردہ آیا اور ہندوؤن سے مسلمانان ہند نے پردے کی رسم سیکھی - حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی قابل وقعت تاریخی شہادت نہین موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ہندوستان نے چین سے پردہ اُڑایا اور مسلمانون پر ابر کی طرح چھا گیا - اسی طرح کی اور مثالین موجود ہین مگر یاد رہے کہ اصلاح قومی کی عالی شان عمارت ایسی سست بنیاد پر تیار کرنا خالی از اندیشہ نہین ہے - اِن خدا کے بندون سے کوئی پوچھے کہ قومی اصلاح کی کوشش مین ایسا "دروغ مصلحت آمیز" شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے - کیا ہمارے بزرگ انسان نہ تھے ؟ کیا اُن کی تہذیب فرشتون کی تہذیب تھی کہ اس مین نقص دریافت کرنا کفر مین داخل ہے - اِن سب باتون کو چھوڑ کر ہمارا فرض یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تحقیق و

تنقید کی نظر سے کرین جو لغزشین اپنے بزرگون کے نظام معاشرت مین دیکھین ان سے عبرت حاصل کرین اور اُن کے تجربے سے فائدہ اُٹھائین ۔ سب سے زیادہ ضروری اصول مطالعہ تاریخ کی نسبت یہ ہے کہ ہمین اپنے ملک یا قوم کی تاریخ کو کل دنیا کی تاریخ سے الگ نہ سمجھنا چاہیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ملک یا قوم کی تاریخ اُس عظیم الشان تاریخ کی ایک شاخ ہے جو کل بنی نوع انسان کی تہذیب و ترقی کی داستان ہے اور جس کا سلسلہ زمانہ قدیم مین دور تک پہونچتا ہے ۔ اگر غور سے ہم تاریخ ماضیہ پر نظر ڈالین تو ہم پر ثابت ہو جائے گا کہ ہماری موجودہ حالت اُن ہزارون اخلاقی اور علمی قوتون کی مدد سے ظہور مین آئی ہے جو کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک مختلف ملکون اور قومون مین کام کرتی آئی ہین ۔ ہزارون دل و دماغ تحقیقات علمی کے لئے وقف ہو گئے ہین جنھون نے مختلف ملکون اور مختلف قومون مین مختلف زمانون مین تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے اور ایک ملک کا چراغ دوسرے ملک سے جلا ہے ۔ مثلاً اُس زمانے کی سیر کرو جب کہ وادی انڈس مین تہذیب کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا چین مین علم و فن کی ترقی ظہور مین آ رہی تھی ۔ بابل مین تہذیب اپنا ابتدائی رنگ جما رہی تھی ۔ پھر اُس زمانے کی تصویر اپنی آنکھون کے سامنے کھینچو جب کہ اُن مختلف تہذیبون مین تعلقات باہمی شروع ہوے ۔ مختلف علم و عقل کے کارنامے اور صنعت و حرفت کے نمونے ایک ملک سے دوسرے ملک مین پہونچے ۔ غرضکہ اسی طور سے دُنیا روز بروز ترقی کرتی گئی ۔ آج ہمارے سامنے تہذیب کے وسیع باغ مین مختلف رنگ کے مختلف پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے ہین اور ہمارے دلون کو سرور اور آنکھون کو نور بخش رہے ہین ۔ ان مین ایسے پودے بہت کم ہین کہ جنھون نے

ابتداے آفرینش سے اب تک ایک ہی سرزمین کی آب وہوا مین نشو ونما پائی ہو۔ برعکس اسکے ہر ایک پودا ایسا ملے گا جس مین کسی دوسرے ملک کے پودے سے لاکر قلم لگائی گئی ہے۔ دیکھو آج علم ہندسہ کس ترقی پر ہے اہل یورپ نے اس مین کیا کیا باریکیان پیدا کی ہین۔ اب اگر اس کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اہل یورپ نے اہل عرب سے حاصل کیا ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے جہان سے اہل عرب نے اسے سیکھا۔ ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ پر تقسیم اہل بابل کا ایجاد ہے۔ آتش فشان آلات حرب کی صنعت اہل یورپ کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل مین اہل چین ان کے موجد ہین کیونکہ بارود چین ہی کا ایجاد ہے۔ فن جہاز رانی آج کس ترقی پر ہے اِس کے لئے بھی ایک معنی مین اہل چین کا شکریہ لازم ہے کیونکہ قطب نما پہلے اُنھون نے بنایا۔ دور کیون جاؤ یورپ کی موجودہ تہذیب بہت کچھ اہل عرب کے احسانون سے گرانبار ہو۔ سب جانتے ہین کہ یورپ مین پہلی یونیورسٹی مسلمانون نے قائم کی اور مسلمانون ہی نے پہلی رصدگاہ وہان بنائی۔

اسی طرح اور بہت سی مثالین مل سکتی ہین۔ غرضکہ اس صورت پر تاریخی واقعات کا اندازہ کرنے سے یہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کل پُرانی تہذیبون کا عطر ہے اور یہ ایسا اصول ہے جو تنگ خیالی اور کم نظری کے فنا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اکثر ہندو مسلمانون کے جھگڑے "پدرم سلطان بود" کے نازیبا پر قائم ہین۔ ہندو کہتے ہین کہ ہم نے عادات بد مسلمانون سے سیکھے۔ اور مسلمان کہتے ہین کہ ہم نے ہندوؤن کو اخلاق حسنہ سکھائے ہین۔ اُن سے کچھ نہین سکھا ہے۔ مگر دونون فرقون مین جن لوگون کی نظر وسیع اور جن لوگون کے دماغ علم تاریخ کے نور سے روشن ہین وہ جانتے ہین کہ ہندو بہت سی خوبیون کے لئے مسلمانون کے احسان مند ہین اور مسلمان ہندوؤن کے

جناب رانا ڈے مرحوم نے لکھنؤ مین سوشل کانفرنس کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اُس مین ثابت کر دیا تھا کہ ہندوؤن نے انتظامی قابلیت اور قومی یگانگت کا اصول مسلمانون سے سیکھا اور دماغی اور روحانی ترقی کا سبق مسلمانون نے ہندوؤن سے - ان واقعات پر غور کرنے سے اُن کاوشون سے نجات مل سکتی ہے جو کہ جہل و تعصب کی وجہ سے دلون مین پیدا ہو گئی ہین -

قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجب روحانی سرور کا سرمایہ بہم پہونچاتی ہے اور آئینہ عقل کو جلا دیتی ہے - اِس عالم مین قدم رکھتے ہی تجربے کا آفتاب نور افشان نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھین روشن ہوتی ہین - اِس عالم مین تہذیب و ترقی کی وہ زبردست شاہراہ نظر آتی ہے جس کا ایک کنارا ازل ہے اور دوسرا ابد - جس کی ہر منزل پر فیض کے چشمے جاری ہین کہین وہ بزرگ اپنی خانقاہون مین بیٹھے ہوے نظر آتے ہین جنھون نے مذہب و فلسفہ کی تحقیق مین اپنی عمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی سے ایسے چراغ روشن کر گئے ہین جنھین ہواے مخالف کے جھونکے نہین بجھا سکتے اور جن کی روشنی مین اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہونچ جاتے ہین کہین وہ بزم جادو آراستہ نظر آتی ہے جس مین بڑے بڑے معجز نگار نثارون اور شاعرون کا مجمع ہے - نکتہ سنجیون کے گلدستے مہک رہے ہین اور شراب سخن کا جادو چل رہا ہے - کہین اُن قوی ہیکل اور ضیغم منش جوانون کی پُر رعب صورتین دکھائی دیتی ہین جن کی چتونون سے شجاعت کا نور برس رہا ہے اور جن کی تلوارون کے پانی سے اب تک مختلف قومون کے اعزاز و وقار کا چمن ہرا ہو رہا ہے - اسی طرح عالم تاریخ مین ہر علم و فن کے باکمال حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص عظیم الشان انسانون کی صحبت مین بلا تکلف شریک ہو سکتا ہے اور اپنی قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے -

ذات کی تفریق

(ماخوذ از "زمانہ" جولائی و اگست سنہ ۱۹۰۶ء)

اس مین شک نہین کہ ہندوستان مین ذات کی پابندی کا خیال ایک بہت بڑی اخلاقی قوت ہے جس کا اثر قریب قریب ہمارے نظام معاشرت کے ہر صیغے مین پایا جاتا ہے قبل اس کے کہ اس رواج دیرینہ کے متعلق اصولاً بحث کی جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدائی حالت اور اصل بنیاد کی نسبت کچھ عرض کیا جائے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ذات کی تفریق کی بنیاد قدیم زمانے کے سوسائٹی کی تین مختلف حالتون کا نتیجہ ہے۔ اوّل قومی اختلاف۔ دوم پولیٹکل اختلاف تیسرے پیشہ کا اختلاف۔ جب قدیم زمانے مین آریا لوگون نے ہندوستان کے اصلی باشندے نیم مذہب وحشیون پر حکومت کا سکہ جمایا۔ اُسی وقت سے ذات کی تفریق کی بنیاد پڑ گئی۔ سُرخ و سفید آریا لوگ فاتح قوم کے غرور و نخوت مین ڈوبے ہوے اپنے محکوم سیاہ فام وحشیون کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور یہ طبیعت انسانی کا مقتضا ہے گویا یہ نیم مہذب وحشی اُس وقت کے "کالے آدمی" تھے۔ لہذا سب سے پیشتر اس شرف قومی سے جو کہ اختلاف قومی کا نتیجہ تھا۔ ذات کی تفریق کی بنیاد پڑی۔

جب ایک مرتبہ یہ تفریق ظہور مین آئی تو اس کا اثر پولیٹیکل تعلقات پر پڑنا لازمی ہوا - پولیٹیکل حقوق کی کمی بیشی سے اس تفریق کی بنیاد اور مضبوط ہو گئی - اِس پولیٹیکل تفریق کے بعد پیشون کی تفریق وجود مین آئی اور اس سے اُس اُلجھاؤ کو ایک اور پیچ دیدیا - اصل مین آخری تفریق نے ذات کی پابندی کا رنگ بہت چوکھا کر دکھایا - یہ سب جانتے ہین کہ اگلے وقتون مین شاہ وقت خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا - اس کو جیسا کہ اپنی رعایا کی پولیٹیکل حالت پر اختیار حاصل تھا ایسا ہی سوشل اور اخلاقی حالت پر بھی اس کا فرمان احکام الٰہی کے برابر سمجھا جاتا تھا - اِس صورت مین شاہ وقت نے جس کے لئے جو پیشہ تجویز کیا وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا پیشہ تھا مختلف پیشون کے لوگ سمجھنے لگے کہ اُن کی سوشل حالت خاص مشیت ایزدی پر مبنی ہے اور اس سے ایک قدم ہٹنا کفر ہے - رفتہ رفتہ اس عقیدے پر کچھ مصلحت وقت اور کچھ خود غرضی کے لحاظ سے مذہبی وارنش ہوتی گئی - اور لوگ سمجھنے لگے کہ چار ذاتین ازل سے موجود ہین اور ابد تک قائم رہینگی - اب ان چار شاخون مین اور کوپلین بھی پھوٹنی شروع ہوئین اور وہ تخم جو کہ اختلاف قومی نے بویا تھا اُس نے ایسی نشو و نما پائی کہ ایک بڑے درخت کی طرح پھیل کر ہند پر چھا گیا اور تمام ہندو قوم کو اپنے سائے مین لے لیا - اب ان چار ذاتون سے ہزارون فرقے پیدا ہو گئے - ان فرقون کی پیدایش اس طرح ظہور مین آئی کہ جب کسی ذات کے چند افراد زمانے کی تفرقہ پردازی سے اپنے اصلی مخرج سے جدا ہو کر کسی دور دراز مقام پر پہونچ گئے اور ان کا سلسلہ اپنی قدیمی سوسائٹی سے بالکل منقطع ہو گیا تو اس حالت مین ان مین چند اوصاف ایسے پیدا ہو گئے جو کہ ان کی اصلی سوسائٹی کے قوانین اور طرز

معاشرت سے جداگانہ تھے۔ اب اُن کی نئی سوسائٹی کی رنگت ہی اور ہوگئی جس کو انھون نے نئے فرقے کے نام سے منسوب کرلیا۔ مثال کے طور پر کشمیری پنڈتون کا فرقہ اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ ایک زمانہ گذرا جب کہ چند کشمیری برہمن آوارہ وطن ہوکر پنجاب اور ممالک مغربی و شمالی مین آباد ہوے۔ ان کا سلسلہ اپنی قدیمی سوسائٹی سے بالکل ترک ہوگیا یہان مسلمانون کی صحبت نے ان کے رسم و رواج۔ خیالات۔ پوشاک وغیرہ پر اسلامی تہذیب و تربیت کا اثر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قدیمی حالت بالکل بدل گئی اور ایک چھوٹا سا فرقہ ایسا پیدا ہوگیا جو کہ کشمیر مین شادی کرنا خلاف شان سمجھنے لگا اور اپنے عزیزان وطن کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر انگریزی تعلیم کو ترقی نہ ہوتی اور سفر کی آسانی کی وجہ سے باہم سوشل تعلقات کی صورت نہ پیدا ہوجاتی تو ایک زمانہ وہ نہ آتا کہ یہان کے کشمیری پنڈت کشمیر کے برہمنون سے خورونوش بھی ترک کردیتے اور بالکل ایک نئے فرقے کی شکل پکڑ لیتے۔ یہی واقعات پرانے زمانے مین بھی پیش آئے۔ چونکہ اس زمانے مین مذہب کا زیادہ زور تھا لہذا ایسے اختلافات پر مذہبی رنگ و روغن چڑھایا گیا اور خورونوش کی پابندی بھی لازمی سمجھی گئی۔ قیود ذات کی ماہیت موجودہ تہذیب کے اصولون او فلسفیانہ تحقیقات کے مطابق جو کہ یورپ کے محققین کی جانفشانی کا نتیجہ ہے اسی طرح بیان کی گئی ہے۔ اب مین اصل منشائے مضمون کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہون۔

اس مین شک نہین کہ ذات کی پابندی ہماری موجودہ ترقی کے میدان مین سنگ راہ ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ ان نقصانات کا ذکر کیا جائے جو کہ ہندو قوم کو اس کی وجہ سے براہ راست

یا بالواسطہ پہونچے ہین یہ مناسب ہے کہ ان خیالی فوائد کی تردید کی جائے جو کہ معاونین ذات اس کے کارآمد ہونے کی تائید مین پیش کرتے ہین - اولاً بہت بڑی دلیل جو کہ ذات کی پابندی کے طرفدار پیش کرتے ہین وہ یہ ہے کہ یہ رواج دیرینہ سوسائٹی کی سوشل حالت پر ایک اخلاقی پولیس یا محافظ کا کام کرتا ہے یعنی ذات کے قوانین پر نظر رکھنے سے انسان ممنوعات مین دخل نہین دے سکتا اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت اس کے ذریعے سے معرض خطر مین نہین آسکتی اس مین شک نہین کہ یہ اصول ایک حد تک درست ہے لیکن موجودہ واقعات اور زمانے کی رفتار کے لحاظ سے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ واقعی اب تک یہ حفظ اخلاق کا اصول فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے خراب اثر نیک نتائج سے زیادہ نہین ہین تو یا تو وہ راسخ الخیال نہین ہے یا اس کا دماغ کافی طور سے وسیع نہین ہے - گو کہ یہ الفاظ اکثر حضرات کو ناگوار معلوم ہون - لیکن اُن کے درست و صحیح ثابت کرنے کی کوشش آیندہ حصہ مضمون مین کی جاے گی -

جس وقت ہم یہ کہتے ہین کہ ذات کی پابندی ایک قسم کی سوشل پولیس یا محافظ ہے تو ہم کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے - یعنی یہی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جسکی مدد سے سوسائٹی کے ہر ممبر کی ذات پر عام راے کے لحاظ سے ایک قسم کی اخلاقی بندش رہتی ہے - مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عام قواعد جو کہ اِس عام راے کا نتیجہ ہین اور جن کا برتنا سوسائٹی کے ہر ممبر پر فرض سمجھا جاتا ہے کن جزوی اصولون پر مبنی ہین - اولاً بہت سے اصول جن پر کہ قیود ذات کا دار و مدار ہے زمانہ قدیم کی رفتار کے بموجب اختیار کیے گئے تھے - دیگر قیود جو کہ اتنے قدیم نہین ہین وہ دقیانوسی خیالات کے ہندون کے مذہبی عقائد اور تعصبات پر مبنی ہین

لہذا ثابت ہوا کہ ذات کے قیود مین کوئی ایسا جزو نہین ہے جو کہ موجودہ ترقی کا حامی ہو میرا
مطلب اس دلیل سے یہ نہین ہے کہ ہم مین کوئی ایسا معمولی خیالات اور تعلیم کا شخص نہین ہے
کہ ان بندشون سے فائدہ نہ اُٹھا سکے جو کہ ذات کے قیود مین شامل ہین۔ بلکہ میرا اصل منشا یہ ہے
کہ یہ بندشین اُن لوگون کے حق مین سخت مضر ہین جن کا تعلیم یافتہ اور ترقی خواہ فرقے مین شمار ہے
یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ دُنیا مین جب کبھی اور جہان کہین کوئی نئی بات رائج کرنے کی کوشش کی گئی
ہے سخت اختلاف پیش آیا ہے۔ مگر ہندوستان مین سب سے زیادہ دقّت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ
یہان بانیان اصلاح یا ریفارمرون کو ایسی سخت سزا دی جاتی ہے کہ اصلاح کے مخالف اس سے
زیادہ سخت سزا دے نہین سکتے اور وہ سزا اخراج قومی کی ہے ذات سے خارج ہونے کا ڈر لوگون
کے دلون مین ایسا سمایا ہے کہ بڑے بڑے روشن دماغ اور عالی خیال جو کہ دل سے اصلاح اور
ریفارم کے حامی ہین ذرا سی نئی بات پر عمل کرنے مین جان چُراتے ہین۔ قوانین ذات
اخلاقی اور سوشل اصلاح عمل مین لاتے ہوے بڑی بڑی دقتین لاحق کرتے ہین۔ اور یہ کہنا
کہ قوانین ذات انسان کو ممنوعات مین دخل دینے سے روکتے ہین سراسر خلاف واقعات ہے
ہزارون ہندو ایسے موجود ہین جو کہ شراب خواری اور عیاشی مین لاکھون روپیہ تباہ کرتے ہین
یا سیکڑون برہمن مسلمان عورتون سے ناپاک تعلقات پیدا کرتے ہین۔ پُرانے بزرگ اس قسم کی زندہ
یادگارین چھوڑ گئے ہین۔ پھر یہ باتین چھپا کر نہین کی گئی ہین بلکہ طشت از بام ہین۔ ان گناہون کے
مرتکب اقبالی مجرم ہین مگر اُنھین کوئی قوم سے خارج نہین کرتا۔ ہان اگر کوئی غیر برہمن کے ہاتھ
کا پکّا ہوا کھانے کی اصلاح پیش کرے تو اُس کی گردن نا انصافی کی کُند چھری سے ریتنے کو سب کے

سب آمادہ ہو جاتے ہین ۔مطلب یہ ہے کہ حفظانِ اخلاق کا خیال تو بالاے طاق رکھا جاتا ہے ۔صرف بانیان اصلاح کے خلاف جہان اور شورشین برپا کی جاتی ہین وہان خارج کرنے کا خوف بھی دلایا جاتا ہے ۔

اکثر اصحاب کا یہ قول ہے کہ ذات کی تفریق کسی نہ کسی شکل مین ہر جگہ موجود رہے ۔ وہ انگلستان کی نظیر پیش کرتے ہین ۔یعنی اُن خیالی تعصبات کا اشارہ کرتے ہین جو کہ وہان کے امرا مین اوسط درجے کے لوگون کے خلاف پائے جاتے ہین یا وہ اعزاز و مرتبت کا فرق جو کہ اوسط درجے کے لوگون اور مزدور پیشہ فرقے مین ہے لیکن یہ خیال رہے کہ یہ اختلاف جو انسانی طبیعت کا مقتضی ہے درجۂ اعتدال سے گزر نہین گیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ امیر آدمی غریب کی سوسائٹی مین شامل ہونا پسند نہین کرتے ۔مگر ہر انگلستان کے باشندے کے دل پر یہ اصول نقش ہے کہ اگر ذلیل سا ذلیل انگریز اپنے جوہر ذاتی سے اعزاز حاصل کرنا چاہے تو وہ وزیر اعظم کے درجے تک پہونچ سکتا ہے اور رؤسا و امرا کے ساتھ خور و نوش مین شریک ہو سکتا ہے ۔مگر ہندوستان مین یہ بات کہان نصیب یہان تو شودر کیسا ہی اعزاز کیون نہ حاصل کرے مگر ہندو سوسائٹی کے اصولون کے موافق کبھی وقعت کی نگاہ سے نہین دیکھا جا سکتا ۔لیکن اب یہ بات یہان بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے ۔جن کے دماغ تہذیب مغربی کے نور سے روشن ہین وہ ان تعصبات کو جو ترقی قومی کے دشمن ہین ۔ترک کرتے جاتے ہین ۔بعض حامیان و معاونین ذات کا یہ خیال ہے کہ مختلف فرقے جو کہ مختلف ذاتون کی حیثیت مین قائم ہین وہی کام دیتے ہین جو کہ ممالک یورپ مین مختلف اہل پیشہ کی مختلف جماعتین کام دیتی ہین ۔یعنی ایسی جماعتون کے ذریعے سے ایک

ساتھ مل کر کام کرنے کی قابلیت لوگون مین بڑھتی ہے اور انسانی ہمدردی کو ترقی ہوتی ہے
بیشک انگلستان وغیرہ مین ایسی جماعتین ہین - ایک کلب ان مزدورون کا ہے جو کہ کلون
مین کام کرتے ہین یا تعلیم یافتہ گروہون کی مختلف سوسائٹیان ہین ہر ایک جماعت کے ممبر اپنے
فرقے کے متعلق سوشل اور پولیٹیکل امور کا تصفیہ کرتے ہین - سیکڑون جھگڑے مل جُل کر طے کر لیتے
ہین - لیکن یہ ان کا خیال ہرگز نہین ہوتا کہ دوسرے فرقے والے کو ذات کی نگاہ سے دیکھین یا اُس کو
نقصان پہونچانے کی کوشش کرین - ہندوستان مین معاملہ برعکس ہے - یہان ایک فرقے
یا ذات کے مختلف ممبرون مین ہرگز اتفاق نہین ہوتا - ہاتھ کو ہاتھ کھانے کی کوشش کرتا ہے
غیر فرقے والے سے تو ہنس کر بات بھی کر لین گے مگر اپنے فرقے والے کو ہمیشہ چرکا دینے کی کوشش
مین رہینگے - اس صورت مین ساتھ مل کر کام کرنے کی قابلیت کا پیدا ہونا دشوار کیا ناممکن ہے
اور یہ امر موجودہ واقعات سے جو کہ روزمرہ تک کی زندگی مین پیش آتے ہین ثابت ہے - دوسرے
یہ کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے - کشمیری کایستھون کو "لالہ"
سمجھتے ہین - کایستھ کشمیری پیچ سے گھبراتے ہین - بنگالی مرہٹون کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے
ہین - اور مرہٹے بنگالیون کو بلیک سمجھتے ہین - اِس حالت مین انسانی ہمدردی کو ترقی ہونا
تو درکنار حسد و بغض کو البتہ روز افزون ترقی ہوتی جاتی ہے -

بعض حبیب وطن فرماتے ہین کہ ذات کے قیود ٹوٹنے سے وہ چند باتین جن سے کہ قومی
تخصیص کا اظہار ہوتا ہے مٹ جائین گی - ہم بھی صاحب بہادر بن جائین گے - پھر "ہندوپن"
کی کون سی بات باقی رہیگی - مگر مین ان سے پوچھتا ہون کہ ہم مین قومی تخصیص کی کون سی بات باقی

رہ گئی ہے ؟ کیا ہماری موجودہ پوشاک ہماری قومی پوشاک ہے ؟ شیروانی اچکن اور فلٹ کیپ کیا ویدک زمانے کے درزیون کی ایجاد ہے ۔ یا لالہ نوندھ رائے کو خدا بخشے اُن کی دستور الصبیان مین ہم کو نعت سرور کائنات صلعم اور توصیف پنجتن ع جو پڑھائی جاتی ہے یہ ہماری قومی تعلیم ہے ۔ یا ہمارے یہان کی سوشل محفلون مین مکلّف فرش تقسیم عطر و پان بیت بازی مسلمانی غذا کے ذائقے ۔ ہماری قومی تخصیص کا پتہ دیتے ہین ۔ ہمارا لباس قومی نہین رہا ۔ ہماری زبان مادری زبان نہین رہی ۔ ہمارا طرز معاشرت مشرقی و مغربی قومون کی نقل ہو گیا ہے ۔ اس صورت مین اگر ہم ”میان بھائی“ نہ رہے اور ”صاحب بہادر“ بن گئے تو ہماری شان مین کیون کر بٹہ لگ گیا ؟ اور بالفرض اگر ہم مین قومی تخصیص کی کوئی علامت باقی بھی ہے تو کیا وہ اس درجۂ کمال پر پہونچی ہوئی ہے کہ اب اس مین کسی اصلاح کی ضرورت یا گنجائش نہین رہی ۔ خداوند کریم نے جس کو عقل سلیم عطا کی ہے وہ اس اصلاح کی ضرورت کو ضرور تسلیم کرے گا ۔

یہ خیال رہے کہ جن باتون کو ہم قومی تخصیص کی علامت سمجھتے ہین وہ طرفہ معجون ہین ۔ کچھ قدیم ہندوستان کے وحشیون کی یادگار ہین کچھ مسلمانون کے اثر صحبت کا نتیجہ ہین اور کچھ انگریزی تعلیم سے پیدا ہو گئی ہین ۔

بعض دور اندیش نہایت متانت سے رطب اللسان ہوتے ہین کہ سوسائٹی ابھی ذات کی تفریق دور کرنے کے لئے تیار نہین ہے ۔ جب کوئی نئی روش اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اکثر محبان قوم مختلف پہلوؤن سے اعتراض کرتے ہین ۔ کوئی پابند مذہب پکار اُٹھتا ہے کہ دھرم کی ناو بھنور مین آ گئی ۔ کوئی عالم بالتحقیق سائنس کے اصولون پر اپنی دلیل قائم کرتا ہے کہ

کہ اُدھر اپنی وضع چھوٹی اور اُدھر اعتدال عناصر مین فرق آگیا - اسی طرح سیکڑون ہی خواہ ملک و قوم ہزارون براہین قاطع پیش کرنے مین تامل نہین کرتے مگر جب دیکھتے ہین کہ لوگ دین یا ان کے گرڑبھے ہوے روحانی مسلون کے سمجھنے کی قابلیت نہین رہی اور نہ سائنس کے اصول کارگر ہوے تو پھر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ تم لوگون مین زمانہ شناسی کی قابلیت نہین ہے - جب کانگرس قائم ہوئی تو مذہبی اور پولیٹیکل اصولون پر تو اختلاف ہوا ہی مگر یہ بھی ایک بہت بڑا اعتراض مخالفین کانگرس کا تھا کہ ملک ابھی ایسی کارروائی کے لئے تیار نہین ہے - مگر خیر تجربے سے ثابت ہوگیا کہ ملک انٹی کانگرس کی کارروائی کے لئے تیار نہین تھا حقیقت یہ ہے کہ جب اصلاح کی کوشش کی گئی ہے تو اس پر ایسے ہی اعتراضات ہوے ہین - اس لئے جب تک تجربے سے نہ ثابت ہو جائے کہ فلان شئے قبل از وقت ہے اُس وقت تک ایسی باتین کرنا جن سے کہ سواے خیالی اطمینان کے اور کچھ حاصل نہ ہو دانشمندی سے بعید ہے -

اکثر محققین جو کہ اپنے تئین ہندو مذہب کے اصولون سے واقف اور علم طبیعات یا سائنس مین ماہر سمجھتے ہین فرماتے ہین کہ ذات کے قوانین کے مطابق جو کھانے پینے کی پابندی کی گئی ہے یہ خاص الخاص سائنس کے اصولون پر مبنی ہے گویا یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جتنے علم و فن آج کل اہل مغرب کو معلوم ہین یہ سب قدیم ہندوستان مین موجود تھے اور جتنی آئندہ ترقیان آئندہ نسلون کی کوشش کا نتیجہ ہونگی وہ بھی پرانے زمانے کے ہندؤن کو معلوم تھین - چنانچہ کچھ عرصہ گزرا کہ اہل مغرب نے فن طب مین ایک تحقیقات کی ، کہ کل وبائی امراض خاص قسم کے کیڑون یا (ذرون) کی وجہ سے پیدا ہوتے ہین جو ہوا مین اُڑا کرتے ہین یا پانی مین

پائے جاتے ہین مگر بغیر خوردبین کے نظر نہین آسکتے۔ لہٰذا جو شخص وبائی امراض مین مبتلا ہو اِس کے ہاتھ کا یا اُس کے ساتھ کھانا نہ کھانا چاہیے کیونکہ اُس مین اُس قسم کے کیڑے موجود ہوتے ہین اس حالت مین اندیشہ ہے کہ جو اُس کے ساتھ کھائے اُس مین بھی وہ سرایت نہ کر جائین اور وہی مرض پیدا نہ کردین۔ گویا ہمارے محققین کے خیال کے موافق اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر قدیم ہندوٗن نے کھانے پینے کی پابندی قائم کی تھی کہ خدانخواستہ اگر کبھی ہندوستان مین طاعون یا ہیضہ آیا تو اُس وقت ذات کی تفریق کام آئے گی۔ کیا سائنس کی تحقیقات کے بموجب یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ صرف "کچی رسوئی" مین وبائی امراض کے کیڑے پائے جاتے ہین؟ کیا پکوان وغیرہ جو کہ مختلف فرقے ہندون کے ایک دوسرے کے ہاتھ کا پکا ہوا کھا سکتے ہین اِس بلا سے بری ہین؟ کیا پانی (جس مین کسی تفریق سے کام نہین لیا جاتا) کے ذریعے سے وبا نہین پھیل سکتی؟ حالانکہ جہان تک کشمیریون کا تعلق ہے وہ اس اعتراض سے مستثنیٰ ہین یعنی ان کے مختلف "دھڑون" مین پان کیا بلکہ پانی تک کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہے۔

قیود ذات کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ہندوستانیون اور انگریزون مین میل جول کو ترقی نہین ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشل تعلقات کی ترقی دو اصولون پر مبنی ہے۔ اوّل یہ کہ اُنھین دوستون مین سوشل تعلقات قابل اطمینان ہوسکتے ہین جو کہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہون۔ دوسرے یہ کہ عورتین بھی سوسائٹی مین شامل ہون مگر ذات کے قوانین کے مطابق یہ دونو صورتین ناممکن ہین۔ انگریز ہماری دعوت کرتے ہین مگر ہم کھانے پینے مین شریک نہین ہوسکتے وہ اپنی بیوی یا مان بہنون کی ہماری مستورات سے ملاقات کرانا چاہتے ہین مگر ہمارے یہان کی عورتین

اُن کی سوسائٹی مین شریک نہین ہوسکتین - اِس حالت مین سوشل تعلقات اور میل جول کا بڑھنا دشوار ہے گو یہ ضرور ہے کہ انگریزون کی سرد مہری کا بھی بہت کچھ اس مین حصّہ ہے اس سرد مہری کا نتیجہ ملک کی پولیٹیکل حالت کے لحاظ سے جتنا بُرا ہے سب پر روشن ہے مگر اِس کے علاوہ ہمارے سوشل اور اخلاقی حالت پر بھی اس کا بہت خراب اثر پڑتا ہے اس امر سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا کہ بحیثیت مجموعی انگریزون کی دماغی اور اخلاقی حالت ہم سے بہ برتر ہے - اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے نیک خصائل کا فائدہ اُٹھائین - یہ اُس حالت مین ممکن ہے جب کہ ہم اُن کی سوسائٹی مین بے تکلفی کے ساتھ شریک ہوسکین - دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض سائنس اور حکمت کے اصولون پر یہ خورونوش کی پابندی قائم کی گئی ہے تو اس کا توڑنے والا برادری سے کیون خارج کیا جاتا ہے -

مختلف ذرایع سے جو کہ خورونوش کی پابندی توڑنے سے زیادہ صریحی نقصان پہونچتے ہین اصول صحت خاک مین ملائے جاتے ہین - تب کوئی خارج کرنے کا نام بھی نہین لیتا - مگر وبائی امراض کا کچھ ایسا دھڑکا بیٹھا ہوا ہے کہ جہان کسی پر کھانے پینے کی قیود توڑنے کا شک ہوا - فوراً ہی تو سوسائٹی کا شیرازہ باندھنے کی فکر پیدا ہو جاتی ہے - اور باوجود اس کے کیا ہندؤن کی صحت اور جسمانی قوت بحیثیت مجموعی اُن قومون سے اچھی ہے جن مین کہ خورونوش کی پابندی نہین ہے - ؟ مثلاً انگریز، مسلمان، پارسی وغیرہ ؟ اور اگر ہے ؟ تو کیا اس وجہ سے کہ ہندو مذہب کے جامع اصول طب پر مبنی ہین - غرض اسی طرح ذرا سے غور مین ذات کی تمام دلیلین غلط اور بے بنیاد ہو جاتی ہین - اب اس آخری حصّہ مضمون مین ان صریحی نقصانات کی نسبت

بحث کی جائیگی جوکہ ہندو قوم کو ذات کی پابندی سے پہونچے ہین۔

سب سے خراب نتیجہ قوانین ذات کا یہ ہے کہ (جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے) یہ سوشل ترقی کے میدان مین سنگ راہ ہوتے ہین۔ شادی صغر سنی، ازدواج بیوگان، سفر ولایت، تعلیم نسوان، قوانین حفظان صحت وغیرہ۔ سب ذات کی پابندی سے مارے ہوے ہین۔ صغر سنی کی اصلاح یا بیوہ کی شادی کی کوشش خلاف مذہب ہنود سمجھی جاتی ہے۔ اُن کی تلقین جو شخص کرے وہ لامذہب سمجھا جاتا ہی اور خارج ہونے کا مستحق خیال کیا جاتا ہے۔ سفر ولایت تو گویا حرام ہی ہے۔ تعلیم نسوان کیونکر ہو۔ ہندو عورتون کو یہ سخت ناگوار ہوتا ہے کہ انگریزی عورتین اپنے قدمون سے ان کے گھرون کو ناپاک کرین۔ قوانین حفظان صحت کیونکر عمل مین آئین وہ ہندو مذہب کے خلاف ہین۔ اِس صورت سے ہم ان کے نیک خصائل سے فائدہ نہین اُٹھا سکتے ہین۔ شاید کوئی کہے کہ مسلمانون اور ہندؤن مین ربط وضبط کیونکر بڑھا ان سے یہی تو خور و نوش مین پرہیز رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونون کی طبائع ایشیائی طرز کے واقع ہوے ہین۔ مسلمانون کے دل و دماغ اُسی سانچے مین ڈھلے تھے جس مین کہ ہندؤن کے توہمات مین ان کا بھی ویسا ہی عقیدہ تھا جیسا کہ ہمارا۔ لہذا ہم ان کے توہمات کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ ہمارے تعصبات کی توقیر کرتے تھے۔ ہمارے بزرگ شہید مردون کو ریوڑیان چڑھاتے تھے۔ لڑکون کو امام حسینؑ کا فقیر بناتے تھے۔ تعزیہ داری کرتے تھے۔ مسلمان ہمارے فقیرون سے منتین مانگتے تھے چیچک جب بچون کے نکلتی تھی ہندو مالیون کی خوشامد کرتے تھے۔ لہذا ایک قسم کا سوشل اتحاد دونون قومون مین پیدا ہوگیا تھا۔ علاوہ اس کے عموماً ہندو اس زمانے مین

اپنی خوشی سے مسلمان نہین ہوتے تھے اس لیے ان کا ظاہری طرز معاشرت بدل جاتا تھا لیکن ان کا دلی عقیدہ نہین بدلتا تھا۔ لہذا وہ مسلمان ہوکر بھی بہت سی باتین ہندو مذہب کی پوشیدہ طور سے قائم رکھتے تھے اس کا اثر عام سوسائٹی پر پڑتا تھا اس لیئے دو مذہبون مین میل جول کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ انگریزون کا معاملہ برعکس ہے وہ ہمارے تعصبات و توہمات کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہین ہمارے روحانی عقائد کا مضحکہ اُڑاتے ہین جو ہندو عیسائی ہوتے ہین وہ دلی عقیدے سے ہوتے ہین نہ کہ جبراً۔ لہذا انگریزون سے اِس صورت مین میل جول نہین ہوسکتا جب تک کہ دیگر سوشل تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ علاوہ برین ذات کی پابندی وہ بلاے بد ہے کہ اس نے مسلمانون سے بھی ایک حد تک نااتفاقی پیدا کرادی۔ اکثر شیعہ مسلمان ایسے ہین کہ اگر ہندو ان کے فرش پر بیٹھ جائے تو وہ فرش دھلوا ڈالتے ہین۔ ہندو کے ہاتھ کا پان تک نہین کھاتے۔ ظاہر ہے کہ عرب و عجم کی یہ رسم نہین ہے صرف ان کو یہ خیال ہے کہ اگر ہندو ہم کو ناپاک سمجھتے ہین تو ہم بھی اُن کو ناپاک کیون نہ سمجھین۔ مختصر یہ کہ گو کہ دیگر وجوہ سے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل چلے تھے مگر ذات کی تفریق سوشل نااتفاقی کی بنیاد ڈال رہی تھی۔

یہ سب کو ماننا پڑیگا کہ ہندوستان مین اتحاد و یگانگت قومی کی ضرورت ہے اور ایسے اتحاد قائم کرنے کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے مین شادی کرین۔ جب اس قسم کی شادیان ہونگی تو وہ تعصبات دور ہو جائین گے۔ جو کہ مختلف فرقات کے لوگون مین آپس مین موجود ہین یعنی اس قسم کے خیالات کہ فلان فرقہ ذلیل ہے اس کی لڑکی

اپنے خاندان مین لانا باعث توہین ہے۔ سوشل اتحاد مین ہارج ہوتے ہین۔ ایسی رسم ازدواج سے جو محبت و اتحاد کو ترقی ہوتی ہے وہ اس سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کہ جس روز سے راجپوت شاہزادیان اکبری حرم سرا مین داخل ہوئین اُسی روز سے راجپوت سردار تخت مغلیہ کے جان نثار خادم بن گئے۔ جب ہندو اور مسلمانون مین ایسے ازدواج کا یہ نتیجہ ہوا تو ہندوون کے مختلف فرقون مین اگر یہ سلسلہ چل نکلے تو ضرور قومی اتفاق کو ترقی ہو گی۔ مگر اس رسم کو بھی اُس وقت فروغ ہو سکتا ہے جب کہ ذات کے قیود توڑے جائین۔ اس رسم کی عدم موجودگی مین جو نقصانات ہندو سوسائٹی کو پہونچ رہے ہین وہ قابل غور ہین۔ اول یہ کہ ہندوؤن کی جسمانی او دماغی ترقی مین بہت کچھ خلل واقع ہے۔ یہ ایک طب کا اصول ہے کہ دو مختلف فرقون کا خون ملنے سے جسمانی اور دماغی ترقی ہوتی ہے لیکن یہان معاملہ برعکس ہے۔ ایک ہی فرقے کے چار ٹکڑے ہو جاتے ہین کہ جن کے علاوہ شادی کرنا ممنوع خیال کیا جاتا ہے اس کا جو کچھ اثر ہماری جسمانی اور دماغی ترقی پر ہے۔ ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے ہمارے سوشل اور اخلاقی حالت بھی اس رسم کی عدم موجودگی کی وجہ سے معرض خطر مین ہے۔ جب ایک فرقے مین ہزار شاخین پیدا ہو گئین تو یہ لازمی ہے کہ ہر ایک شاخ مین لڑکے اور لڑکیون کی تعداد محدود ہو۔ اس حالت مین صغر سنی کی شادی کو فروغ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس فکر مین رہتا ہے کہ اپنی اولاد کے لئے اچھا خاندان سب سے پہلے تجویز کرے تا کہ دوسرے نہ شکار پھانس لین۔ لہذا آٹھ یا نو برس ہی کی عمر مین جلدی پڑ جاتی ہے کہ کسی طرح لڑکی یا لڑکے کی شادی کا بندوبست ہو جائے۔ اور "قرارداد" کی رسم بھی اسی وجہ سے ترقی پذیر ہے۔ کیونکہ جب لڑکون کی تعداد محدود ہوئی تو

جہیز کی قیمت بڑھانے کا اختیار لالچی والدین کو حاصل ہے۔ علاوہ اس کے ہندوستان اُسی وقت ترقی کرسکتا ہے کہ کل مختلف فرقے ایک قومی یگانگت کا لباس پہنین۔ مگر یہ آرزو اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب کہ ذات کی پابندی نہ رہے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خورونوش اور شادی بیاہ مین شریک ہون۔ غرضکہ ذات کی پابندی نے ہماری حالت بدتر کر رکھی ہے ہزارون سوشل اور پولیٹکل اخلاقی جسمانی دماغی خرابیون کی یہی باعث ہے۔

۸۔ آخر مین اِس مسئلے کے مذہبی پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ ہندوستان مین انیسوین صدی مین چار ایسے شخص پیدا ہوے جن کی راے ہر شخص کو قابل وقعت ماننا پڑے گی یعنی راجہ رام موہن راے۔ سوامی دیانند سرسوتی کیشب چندر سین۔ مسٹر راناڈے۔ ان چارون رفارمرون مین ہندو مذہب کے دیگر اصولون پر کچھ بھی اختلاف کیون نہ ہو مگر اس ایک بات پر یہ سب متفق اللفظ اور متحد الکلمہ تھے کہ مذہبًا بھی ہندوؤن کے لئے ذات کی پابندی ضروری نہین ہے ان مین سے ہر ایک نے ویدون کے ذریعے سے ثابت کردیا کہ قدیم ہندوؤن مین ذات کی پابندی اِس بیہودہ طور سے لازمی نہین سمجھی جاتی تھی اگر شودر ترقی کرتا تھا تو وہ برہمن کے درجے تک پہونچ سکتا تھا۔ لاہور مین اپنے آخری ایڈرس مین مسٹر راناڈے نے صاف طور سے مذہبی و تاریخی دلائل سے ثابت کردیا ہے کہ قدیم ہندوؤن مین ذات کے قوانین ایسے احمقانہ طرز کے نہ تھے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ لوگ انیسوین صدی مین پیدا ہوے لہٰذا ان کی بات قابل اعتبار نہین ہے۔ تو ان کے لئے چیتن کے نانک کبیر وغیرہ کی مثالین موجود ہین۔ ان مذہبی رفارمرون نے صاف طور سے ذات

قیود کی مخالفت کی ہے۔ اگر متاخرالذکر رفارمرون پر بھی اعتبار نہ ہو تو گوتم بدھ کی مثال موجود ہے۔ اُنہون نے ذات کے قیود توڑ کر دکھا دیئے۔ یہان پر مسز بیسنٹ کی رائے پیش کرنا غیر مناسب نہین ہے کیونکہ مسز موصوف دقیانوسی خیالات کے ہندوون کی رہنما ہین چند سال ہوے بنارس مین اُنھون نے جو ذات کی پابندی کی نسبت تقریر کی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذات کی موجودہ حالت سے وہ بھی سخت بیزار ہین۔ اُن کے لکچر کے چند فقرون کا لفظی ترجمہ درج ذیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات کی بالفعل جو حالت ہے اس کی نسبت ان کا کیا خیال ہے۔ آپ فرماتی ہین کہ "موجودہ حالت ذات کے قیود کی افسوسناک اور شرمناک ہے۔ پُرانے زمانے مین جس کی جتنی زیادہ اونچی ذات تھی اُسی قدر اُس کے زیادہ فرائض تھے۔ مگر اب معاملہ برعکس ہے۔ اب ذات کی برتری چند حقوق سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ فرائض سے۔ (صفحہ لکچر ۷۹) پرانے زمانے مین برہمن کا فرض تھا کہ غریب ہو اور عالم ہو۔ اب برہمن کا فرض ہے کہ امیر ہو اور جاہل ہو۔ (صفحہ ۸۶) پرانے زمانے مین اگر کوئی اپنا دھرم نہین رکھتا تھا تو وہ خارج کیا جاتا تھا۔ مثلاً برہمن کا یہ فرض ہے کہ وہ اخلاق کا مجموعہ ہو اور پاک زندگی بسر کرے۔ اس پر اگر اُس کی اخلاقی حالت مین فرق آتا تھا وہ خارج کیا جاتا تھا۔ (صفحہ ۸۲) اب اگر کوئی خارج کیا جاتا ہے تو بہت کچھ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اس کو خارج کرتے ہین ان کو اس سے باطنی تعصب ہوتا ہے یا ذاتی ناراضگی ہوتی ہے اور جو لوگ خارج کرتے ہین وہ ظاہر امذہبی بناوٹ سے ظاہری عزت حاصل کر لیتے ہین نہ کہ زندگی کی پاکیزگی سے

اور علم سے اور چال چلن کی خوبی سے۔ تم خوب جانتے ہو کہ اگر کوئی شخص ذات کی حدود میں رہ کر اخلاق کے ہر ایک اصول کو خاک میں ملا دے تو اُن کو کوئی شخص خارج نہ کرے گا۔ اپنی اصلی زندگی میں وہ ذات کے کل قوانین توڑے لیکن اگر وہ ظاہرا بناوٹ بنائے جاتا ہے تو خارج نہیں کیا جاتا وہ ہوٹل میں جائے گا۔ گوشت کھائے شراب پیئے۔ مگر اس شرط سے کہ وہ ہوٹل کے پچھلے دروازے سے جائے نہ کہ اگلے دروازے سے۔ تو اُس کی ذات والے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں گے اور اس کو خارج نہ کریں گے۔

مگر ہاں کوئی ولایت کا سفر کرے اور کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہو۔ اس کی زندگی کتنی ہی پاکیزہ کیوں، وہ اپنی قوم کو کتنا ہی فائدہ پہونچانے کے قابل کیوں نہو مگر اس بنا پر خارج کیا جاتا ہے کہ اُس نے ولایت کا سفر کیا ہے (صفحہ ۹۳) کوئی اصول نہیں جس پر کہ اخراج عمل میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً فوج میں ہر سال برہمن نوکر رکھے جاتے ہیں اور ان سے قسم لی جاتی ہے کہ باہر سفر کرنے کے لئے تیار ہیں اور وہ باہر سفر کر کے ہندوستان میں آتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں خارج کرتا۔ ہاں اگر کوئی سولین ہونے کے لئے ولایت جائے تو وہ ضرور خارج کیا جاتا ہے (صفحہ ۵۵) اخلاق جعلسازی سے ذات کے قیود قائم رکھنے میں کام لیا جاتا ہے۔ میں نے سُنا ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہم ولایت گئے اور ہم نے واپسی پر پانچ روپیہ دے کر پرایشچت کر لی۔ یہ پرایشچت نہیں ہے یہ توہین ہے۔ ہندو مذہب کی اور ذلت ہے ان کے لئے جو اس میں حصہ لیتے ہیں۔ ایسے شخص کو اس لئے نہیں خارج

کرنا چاہیے کہ اُس نے سفر ولایت کیا بلکہ اس لئے کہ اس نے پرایشچت کے اصول کو خاک مین ملایا ہے اور اخلاقی جعلسازی سے کام لیا ہے (صفحہ ۱۰۱) یہ الفاظ کسی تعلیم یافتہ لامذہب نوجوان کے نہین ہین - یہ اُس باہمت خاتون کے الفاظ ہین جس نے ہندو مذہب دہریہ مذہب چھوڑ کر اختیار کیا ہے جو کہ ہندو مذہب کے لئے جان دینے کو تیار ہے جس کا جوش محبّت ہندو مذہب کے لئے درجۂ اعتدال سے گزر گیا ہے جس کو ہندو مذہب کے بے بنیاد تعصبات اور توہمات مین بھی روحانی اصولون کی جھلک نظر آتی ہے - مگر ذات کے قوانین ایسے شرمناک حالت مین ہین کہ مسز بسینٹ ایسے ہندو مذہب کی طرفدار سے بھی خاموش نہ رہا گیا اور نہایت سخت الفاظ مین مذکور الصدر خرابیان بیان کین - اگر کوئی نوجوان یہی باتین کہتا تو وہ ملحد کے نام سے یاد کیا جاتا - افسوس تو یہ ہے کہ یہ کوئی نہین دیکھتا کہ نوجوان جو نفرت کرتے ہین تو اس لامذہبی سے جس کو کہ ہزارون لاکھون ہندو اپنا مذہب سمجھے ہوئے ہین - اصل مذہب سے تو کئی سو برس ہوئے جب ہم ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے - اب بیسوین صدی کے آغاز مین اِس کے تازہ کرنے کی کوشش بیکار ہے - سہ

عمر ساری تو کٹی عشق بتان مین مومن　　آخری وقت مین کیا خاک مسلمان ہونگے

اب صرف لامذہبی رہ گئی جو کہ ہندوون کا مذہب ہے اور جس کی آڑ مین سیکڑون خلاقی جرائم کئے جاتے ہین اِس مذہب کی آڑ مین عورتین جبرًا اپنے خاوندون کی لاش کے ساتھ زندہ جلادی جاتی تھین - اسی مذہب کی آڑ مین معصوم بچے گنگا مین بہائے جاتے تھے -

اسی مذہب کی آڑ مین سیکڑون نوعمر لڑکیان اب تک جنوبی ہندوستان کے مندرون مین طوائفون کی شرمناک زندگی بسر کرتی ہین - اسی مذہب کی آڑ مین ذات کے قوانین قائم کئے جاتے ہین اور اخراج مین اخلاقی جعلسازی سے کام لیا جاتا ہے - نوجوان ان ذلتون کو نہین برداشت کرسکتے اُن کو انگریزی تعلیم سے معلوم ہوگیا ہے کہ اصل ہندو مذہب کیا تھا اور اب کیا ہوگیا - وہ اس مذہب کے خلاف ہوسکتے ہین مگر اس سے نفرت نہین کرسکتے خیر اب آثار زمانہ تبلا رہے ہین کہ لوگون کے خیالات مین تغیر شروع ہوگیا ہے - جو پُرانے خیالات کے ہندو ہین وہ چاہے اس امر پر راضی نہ ہون کہ ذات بالکل نیست ونابود کردی جائے مگر اتنا سمجھ گئے ہین کہ ذات کے قوانین مین سخت ضرورت اصلاح کی ہے جس کی تائید کہ مسز بیسنٹ کے بیان سے ہوتی ہے - بہرحال مسز بیسنٹ بھی یہ مانتی ہین کہ چار ذاتون کے علاوہ جتنے فرقے پیدا ہوگئے ہین مذہبًا ناجائز ہین - جیسا کہ اُن کے بنارس کے لکچر سے ظاہر ہے - شکر ہے کہ ذات کی پابندی کا سودا لوگون کے سر مین اب زور وشور سے باقی نہین رہا جیسا کہ پیشتر تھا - نئی روشنی والون کی نگاہون مین مذہبًا اُسکی کوئی وقعت باقی نہین رہی ہے اور رفتہ رفتہ جمہوری اصولون کی ترقی کے ساتھ اس کی اخلاقی برتری کا خیال بھی جو لوگون کے دلون مین اب تک جاگزین ہے بالکل نیست ونابود ہوجائے گا - جس وقت کہ لوگ پولیٹیکل امور مین ہمسری کا دعوی کرین گے اُس وقت سوشل معاملات مین وہ ذات کے قیود کے موافق ایک دوسرے سے ہرگز ہرگز دب کر نہین رہ سکتے - اور دماغی تربیت حاصل کرنے کے طریقے جو بالفعل

موجودہ سررشتہ تعلیم مین جاری ہین کبھی ذات کا فرق قائم نہین رکھ سکتے۔ کیونکہ جو شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اور اعلیٰ دماغی قابلیت کے زیور سے مزین ہوگا اُس کا وقار کسی حالت مین اُس سے اونچی ذات والے سے کم نہین ہو سکتا۔ جو کہ اتنا ہی لائق ہے۔ اور اس مین شک نہین کہ یہی ایسا طریقہ ہے جس سے ذات کی پابندی کی قسمت کا بہت جلد فیصلہ ہو جائے گا۔

لیکن باین ہمہ ذات کی تفریق کے مٹنے سے ایک سوشل اور اخلاقی تہلکہ مچ جائے گا کیونکہ انقلاب کا زمانہ ہمیشہ شورش و فساد کا ہوا کرتا ہے۔ بہت سی باتین ایسی پیش آتی ہین جو کہ طبائع کو جوش مین لاتی ہین۔ نوجوان کو ناتجربہ کاری جوش دلاتی ہے اصل اصول اصلاح اور سوسائٹی کی بہتری کا خیال دل سے بھلا کر ذاتی نخوت کا رنگ چوکھا کر دیتی ہے۔ یہی باتین اس انقلاب مین جس کی کہ بنیاد پڑ گئی ہے پیش آنی لازمی ہین اور کچھ کچھ اپنا رنگ دکھا رہی ہین۔ مگر یہ اخلاقی سراسیمگی عارضی ہوگی۔ اس کے بعد کوئی ایسا طریقہ وجود مین آئے گا جو موجودہ وقت کی ضرورتون کے لحاظ سے مناسب ہوگا اور امن و امان کی خبر دے گا۔

" کتبہٗ علی حسین ۔ چکمنڈی ۔ لکھنؤ "